بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایمانِ مجسم امام معظم علی بن ابی طالب علیہ السلام

تالیف

حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ محمد علی فاضل

ناشر:

مکتبۃ الہادی

جامعۃ الکوثر۔ اسلام آباد

تعارف کتاب

نامِ کتاب: ایمانِ مجسم، امام معظم علی بن ابی طالب علیہ السلام

تالیف: حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ محمد علی فاضل

ناشر: مکتبۃ الہادی۔ جامعۃ الکوثر اسلام آباد

فنی تعاون: مہدی فاضل

اشاعت جدید: جولائی 2010ء

پرنٹرز: معراج دین پرنٹرز، اردو بازار لاہور

ہدیہ:

ملنے کا پتہ: مکتبۃ الہادی۔ جامعۃ الکوثر سیکٹر H-8/2

اسلام آباد فون: 0333-6446072

فہرست کتاب

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
1	عرضِ مؤلف	۹
2	امام مجسم، امام معظم علی بن ابی طالب علیہ السلام	۱۴
3	خاندان اور سلسلہ نسب	۱۹
4	والدِ گرامی حضرت ابو طالب علیہ السلام	۲۲
5	والدہ ماجدہ جناب فاطمہ بنت اسدؑ	۲۶
6	ایمان مجسمؑ کی پاکیزہ زندگی	۲۷
7	ایمان مجسمؑ ولادت سے بعثت پیغمبرؐ تک	۲۸
8	ایمان مجسمؑ حضورؐ کے ساتھ ___ غارِ حرا میں	۳۱
9	ایمان مجسمؑ بعثت سے ہجرت تک	۳۴
10	مسلم اول شہِ مردان علیؑ	۳۴
11	ایمان مجسمؑ سابق الاسلام کیسے؟	۳۶
12	عُفیف بن قیس کندی کی شہادت	۳۹
13	ایمان مجسمؑ حامی اور جانشین رسالت	۴۰
14	عظیم فداکاری	۴۴
15	حضورؐ کی ہجرت سے رحلت تک ___ برادرِ رسولؐ	۴۸
16	ایمان مجسمؑ اور پیغمبرؐ سے نسبت	۴۹
17	ایمان مجسمؑ اور میدان جنگ	۵۱
18	جنگ بدر	۵۲
19	غزوہ احد	۶۲
20	جنگ کی تیاریاں	۶۳
21	مدینہ پر حملہ	۷۴
22	جنگ احزاب یا خندق	۷۴
23	کفار اور مشرکین کا جوڑ توڑ	۷۵
24	خندق بنانے کی تجویز	۷۵
25	سلمان مِنا اہل البیتؑ کی سند	۷۶
26	ایمان مجسمؑ فاتحِ خیبر	۸۹
27	بت شکنی ___ یا تطہیر کعبہ	۱۰۰
28	یمن میں نشر اسلام	۱۰۳
29	غزوہ تبوک میں عدم شہرت	۱۰۷
30	تبلیغ سورہ برأت یا پیغمبرؐ کی خصوصی نمائندگی	۱۰۹
31	ایمان مجسمؑ کی سیرت کا عملی پہلو ___ مباہلہ	۱۱۵
32	حجۃ الوداع	۱۲۶
33	حج کی تفصیل	۱۲۹
34	واقعہ غدیر خم	۱۳۲
35	واقعہ غدیر کی تکمیلی آیت	۱۴۰
36	پیغمبرؐ کا سفرِ آخرت	۱۴۶
37	رحلت پیغمبرؐ سے خلافت ظاہری تک	۱۵۰
38	حضورؐ کی رحلت	۱۵۲
39	ایمانِ مجسم زندگی کے دوراہے پر	۱۵۳

نمبر	عنوان	صفحہ
40	داخلی وخارجی خطرات	۱۵۵
41	ایمان مجسمؑ کا طرزِ حکومت	۱۶۸
42	عُمال کا محاسبہ	۱۷۳
43	ایمان مجسمؑ اور محکمہ قضا	۱۷۴
44	ایمان مجسمؑ اور قضا	۱۷۷
45	ایمان مجسمؑ اور شہادات	۱۸۰
46	بنیادی حقوق	۱۸۳
47	معاشی نظام	۱۸۶
48	بیت المال کی تقسیم	۱۸۷
49	ایمان مجسمؑ اور عدالت	۱۹۱
50	عدل کے چند نمونے	۱۹۶
51	عدالت اصولِ دین میں سے ہے	۲۱۲
52	علیؑ شہید عدالت ہیں	۲۱۴
53	کونسی عدالت باعثِ شہادت بنی؟	۲۱۵
54	سخاوت بہتر ہے یا عدالت؟	۲۱۶
55	جود اور عدل اخلاقی، انفرادی نقطہ نظر سے	۲۱۸
56	اجتماعی نقطہ نظر سے	۲۱۹
57	جود اور احسان میں فرق	۲۲۲
58	عدالت کا سماجی فلسفہ	۲۲۳
59	خطرے کا احساس اور اتمام حجت	۲۲۵
60	اسلامی جاگیریں	۲۲۷

نمبر	عنوان	صفحہ
61	ایک نگاہ پیچھے کی طرف	۲۲۷
62	عدالت میں وسعت ہے اور ظلم میں تنگی	۲۲۸
63	سخت تنبیہ	۲۲۹
64	لوگ پیچھے ہٹنا شروع ہوتے ہیں	۲۳۱
65	دوستوں کی رائے	۲۳۲
66	مقبوضہ جائیدادوں کی واپسی	۲۳۴
67	عمرو بن عاص کا معاویہ کے نام خط	۲۳۵
68	مولا علیؑ اور خلافت	۲۳۵
69	ایمان مجسمؑ کی عبادت ___ نخلستانوں میں صدائے مناجات	۲۳۹
70	صعصعہ بن صوحان کا مولاؑ کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت	۲۵۶
71	افراد کی معاشرتی پہچان	۲۵۹
72	دنیا نے علیؑ کو نہیں پہچانا	۲۶۰
73	سلونی کا دعویٰ	۲۶۱
74	شہید عدالت کی مظلومیت	۲۶۴
75	مظلومیت کے مختلف پہلو	۲۶۹
76	علیؑ اور تنہائی	۲۶۹
77	زمانے کی ستم ظریفی	۲۷۲
78	عوام الناس کا علیؑ پر ظلم	۲۷۷
79	فضائل علیؑ کی پردہ پوشی	۲۸۸
80	شیعیانِ علیؑ کا قتل اور ایذائیں	۲۹۷
81	ہنگامِ شب آپؑ کی تدفین	۳۰۰

82	علیؑ اور اہلِ بیتؑ پر مظالم کے اسباب	۳۰۱
83	ملکی انتشار اور اس کے اسباب	۳۱۰
84	جنگ جمل	۳۱۵
85	پایہ تخت کی تبدیلی	۳۳۴
86	عُمال کا تقرر	۳۳۷
87	قیس بن سعد انصاری	۳۳۸
88	سہل بن حنیف انصاری	۳۳۸
89	مالک اشتر بن حارث	۳۳۸
90	عبداللہ بن عباس	۳۳۹
91	محمد بن ابی بکر	۳۴۰
92	ابو ایوب انصاری	۳۴۰
93	مخنف بن سلیم ازدی	۳۴۰
94	قرظہ بن کعب انصاری	۳۴۱
95	قثم بن عباس	۳۴۱
96	یزید بن قیس ارحبی	۳۴۲
97	کمیل بن زیاد ازدی	۳۴۲
98	عمر بن ابی سلمہ	۳۴۳
99	نعمان بن عجلان	۳۴۴
100	عثمان بن حنیف انصاری	۳۴۴
101	سعید بن مسعود ثقفی	۳۴۴
102	عبیداللہ بن عباس	۳۴۵

103	حسان بن حسان بکری	۳۴۵
104	جنگِ صفین	۳۴۵
105	جنگ نہروان	۳۵۰
106	خوارج کون تھے؟	۳۵۴
107	مظلومیت علیؑ بزبان علیؑ	۳۵۶
108	شہادت ایمان مجسمؑ	۳۵۹
109	تجہیز و تکفین	۳۶۹
110	قبر کو مخفی کیوں رکھا گیا؟	۳۷۳
111	ایمانِ مجسمؑ کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت	۳۷۴
112	ابن ملجم اور اس کے ساتھیوں کا انجام	۳۷۶
113	نجف اشرف کا محل وقوع	۳۸۷
114	مرقد علویؑ کی تاریخ و تعمیر	۳۹۰
115	فن کمال	۳۹۴
116	روضہ مطہر کے دروازے	۳۹۵
117	رواق مطہر	۳۹۶
118	ایوانِ طلائی اور مینار	۳۹۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مؤلف:

حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام بعد از رسول گرامیؐ عالم انسانیت کی وہ عظیم ترین ہستی ہیں جو ذات اقدس الٰہی کا مظہر کامل ہیں، آغاز ولادت سے انجام شہادت تک آپ کی زندگی کا ہر لمحہ تعجب آور اور حیرت انگیز ہے۔ آپ کی ۶۳ سالہ زندگی متضاد صفات کا مجموعہ ہے۔ ذات والا صفات امیر المؤمنینؑ کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک مادی اور ایک معنوی۔

مادی زندگی سے مراد یہ ہے کہ آپ کا تعلق کس خاندان، قوم اور قبیلہ سے ہے؟ کہاں ولادت ہوئی ہے؟ کب اور کیسے؟ آپ کی تربیت کیسے ہوئی؟ کس نے کی؟ آپ کا لباس خوراک اور رہن سہن کیسا تھا؟ انفرادی یعنی ذاتی خصائص کیا تھے؟ اور زندگی کے عادات واطوار دوسروں سے کیونکر مختلف تھے۔ اور کہاں پر شہادت ہوئی اور کب اور کیسے؟ جبکہ آپ کی زندگی کا دوسرا پہلو جو معنویت سے تعلق رکھتا ہے وہ کیا ہے؟ یعنی مظہر ذات الٰہی کیسے ہیں؟ روحانی شخصیت کا کیا کمال ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام اس کائنات کی وہ عظیم ہستی ہیں کہ جس کی عظمت وسربلندی جامعیت و ہمہ گیری اور عالمی وآفاقی برتری کے اپنے بیگانے اور دوست دشمن سب ہی معترف ہیں اور کسی کو ان کے بلند امتیازات اور نمایاں خصوصیات سے انکار نہیں۔ آپ قریش کے ایک ممتاز ترین گھرانے میں پیدا ہوئے، سرزمین حرم میں خانہ کعبہ کے اندر ولادت کا شرف حاصل کیا، رسالت کی فضاؤں میں

پلے بڑھے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایہ تربیت میں پروان چڑھے۔ انہی کے نقش قدم پر قدم رکھ کر چلے پھرے۔ سفر وحضر میں سایہ کی طرح ساتھ ساتھ رہے۔ جلوت و خلوت میں ان کے فیضان صحبت سے فیضیاب ہوئے۔

حضورؐ کی نبوت ورسالت کے سب سے پہلے موید اور مصدق تھے۔ تمام دنیا سے پہلے آپ کی دعوت رسالت کو دل وجان سے قبول کیا۔ دعوت ذوالعشیرہ سے حضورؐ کی رحلت تک آپؐ کی ہر ممکن مدد فرمائی۔ آپ ہی کی قربانی اور فداکاری سے اسلام کی ترقی کی راہیں کھلیں۔ میدان احد میں ''لَافَتٰی اِلَّا عَلِی'' کا الہامی اعزاز حاصل کیا، میدان خندق میں ''بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّهٗ اِلَی الْکُفْرِ کُلِّه'' کی سند رسول اسلامؐ سے حاصل کی۔ اسی جنگ میں ''ضَرْبَةُ عَلِیٍّ یَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَیْنِ'' کا تمغۂ شجاعت پیغمبرؐ سے وصول کیا۔ اور جنگ خیبر میں ''اللہ اور اس کے رسولؐ کے محبّ اور محبوب'' قرار پائے۔

زہد وتقوی کا یہ عالم کہ سخت سے سخت ترین دشمنی بھی اس کا معترف ہے، دنیا سے لاتعلق قائم کر کے عابد شب زندہ دار یعنی ہر رات میں ایک ہزار رکعت نماز ادا کرتے اور صائم النہار یعنی دن کو روزے سے ہوتے۔ ولادت سے شہادت تک کے تمام مراحل میں آپ کی زندگی دوسروں کی زندگی سے بالکل مختلف تھی، آپ مرد عمل اور میدان تقویٰ کے شہسوار تھے۔ آپ کی تمام گفتگو توحید، عدالت، اور تقویٰ کے بارے میں ہوتی، عدالت اجتماعی آپ کا مطمح نظر تھی۔ کسی کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے تھے سوائے تقویٰ کے۔

آپ پختہ ایمان کے مالک تھے، بلکہ ''کل ایمان'' تھے ''ایمان مجسم'' تھے۔ اسلام کے لئے آپ علیہ السلام کی جان بازی، فداکاری اور جاں نثاری بھی زبان زد خلائق ہے۔ روز اول سے آج تک آپ کی زندگانی اور فضائل ومناقب پر لاکھوں کتابیں لکھی

جا چکی ہیں۔ہم چاہتے ہیں کہ ان کتابوں کا ایک خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کریں یا یوں سمجھئے کہ لاکھوں گلستانوں سے مختلف پھول چن کر ایک گلدستے کی حیثیت میں نذرانہ کے طور پر پیش کریں۔ورنہ کہاں ہم اور کہاں ہماری بساط کہ جس کے بارے میں یہ کہا جائے:

کتاب فضل ترُا آب بحر کافی نیست　　کہ تر بکنم انگشتم وصفحہ بشُمارم

مگر ان لاکھوں کتابوں کے لکھنے والوں کو دیکھ کر ہم بھی لرزتے ہاتھوں میں ''بِضَاعَةٍ مُزْجٰة'' (ناچیز سی پونجی) لے کر''شاہ ولایت'' کی بارگاہ میں اس امید کے ساتھ حاضر ہو رہے ہیں کہ اس بارگاہ سے کوئی گدا خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔

ہماری یہ کتاب سمندر کے مقابلے میں ایک چھینٹے کی حیثیت سے بھی کم ہے مگر دریائے رحمت اور بحر جود وسخا کی طرف پیاسے بڑی آرزوئیں اور تمنائیں لے کر آتے ہیں اور کبھی ناکام ونامراد نہیں پلٹتے۔

''ایمان مجسم'' کے عنوان سے علوم محمدؐ وآل محمدؐ کے نشریاتی ادارے''ہادی ٹی وی''اسلام آباد سے سیرت امیر المومنین علیہ السلام پر پیش کئے جانے والا کئی قسطوں پر مشتمل پروگرام اس کتاب کا عنوان ہے،البتہ اس پروگرام کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں اس کتاب میں شامل کی گئی ہیں جو کہ اس ٹی وی سے پیش نہیں کی جاسکیں۔امید ہے کتاب مقبول بارگاہ ہوگی اور قارئین کرام بھی یقیناً اس سے ضرور بہرمند ہوں گے۔انشاءاللہ العزیز

کتاب کی تیاری میں دور حاضر کی مختلف کتب سے استفادہ کیا گیا ہے مثلاً جناب مہدی پیشوائی کی کتاب''سیرہ پیشوایان''جناب سید علی اکبر قرشی کی کتاب ''خاندان وحی''جناب حسین عماد زادہ کی کتاب''چہاردہ معصوم''علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم کی کتاب''سیرت امیر المؤمنین علیہ السلام''علامہ علی نقی نقوی مرحوم کی کتاب''تاریخ

اسلام''اس کے علاوہ بھی Electronic Media اور بہت سی دوسری کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

کتاب میں ایمان مجسم کی ولادت سے شہادت تک کے حالات وواقعات اور حوادثات کو پیش کرنے کے لئے آپ کے حالات زندگی کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلا حصہ ایمان مجسمؑ کی ولادت سے بعثت تک دوسرا حضورؐ کی بعثت سے مدینہ کی طرف ہجرت تک،تیسرا حضورؐ کی ہجرت سے رحلت تک چوتھا حضورؐ کی رحلت سے ایمان مجسمؑ کی ظاہری خلافت کے آغاز تک اور پانچواں حصہ آغاز خلافت سے آپؑ کی شہادت تک۔

البتہ شہادت کے بعد کے واقعات پر بھی قدرے اختصار کے ساتھ بعض واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مرقد علوی کی دریافت سے روضہ اقدس کی تعمیر اور تعمیر کے مختلف مراحل کو بھی بیان کیا گیا ہے۔اور 2009 تک تعمیری مراحل کو تاریخ وار ذکر کیا گیا ہے اور اسی سال ہم نے زیارت کا شرف حاصل کیا ہے۔

کتاب آپ کے سامنے ہے اس میں نہ رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہے نہ مبالغہ آفرینی سے حقائق وواقعات اور تاریخی مسلمات کی روشنی میں اسے اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ایمان مجسم،امام معظم ولی اللہ الاعظم امیر المؤمنین علی بن ابیطالب علیہ السلام کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑ سکے۔تاریخی واقعات کو تاریخ ہی کی زبان میں دہرایا گیا ہے۔حتی الامکان باہم آویزیوں سے بچ کر رہنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خدا کرے یہ تعصب اور تنگ نظری کی زنجیروں کو توڑ کر آزادانہ تحقیق وجستجو کا جذبہ پیدا کرنے اور ایمان مجسم کی بلند شخصیت کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں ممدومعاون ثابت ہو۔آمین۔

کتاب کو علوم محمد وآل محمد علیہم السلام کا طباعتی واشاعتی ادارہ'' ''اسلام آباد

شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔اس کے مینیجر جناب مہدی صاحب نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لے کر اسے مرتب و مدون فرمایا ہے۔اللہ کرے ''ہادی''اور''مہدی''مل کر''ہدایت''کے فریضہ سے کما حقہ عہدہ برآ ہوں۔اللہ تعالیٰ HADI TV کے سرپرستِ محترم کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور صحت وسلامتی کے ساتھ خدمت دین کی توفیق عطا کرے اور اس کا ثواب میرے والدین اور ان حضرات کے مرحومین کو ایصال فرمائے جنہوں نے کتاب کی اشاعت میں تعاون فرمایا ہے۔آمین بحق محمد وآلہ المعصومین صلوٰت اللہ علیہم اجمعین والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

دعا گو: محمد علی فاضل۔اسلام آباد

8 جون 2010 مطابق 5 رجب المرجب 1431ھ

بروز جمعہ روز ولادت حضرت امام علی نقی علیہ السلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ایمان مجسم، امام معظم علی بن ابی طالب علیہ السلام

ایمان مجسمؑ امام معظم، ولی اللہ الاعظم حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کا

اسمِ گرامی: علیؑ

القاب: تو بہت ہی زیادہ ہیں البتہ سب سے زیادہ مشہور القاب ولی اللہ، اسد اللہ، مرتضٰی، وصی الرسولؐ، یعسوب الدین، امام المتقین، قائد الغر المحجلین تقریباً دوسو سے زائد القاب ہیں۔

کنیت: ابوالحسنؑ، ابوالحسینؑ، ابوالحسنین، ابوترابؑ، ابوالریحانتینؑ وغیرہ۔

والد گرامی: رسول اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا بزرگوار، سردارِ قریش، زعیم مکہ، جامع وقار حکماء وہیبت امراء حضرت ابوطالب ___ عبد مناف یا عمران ___ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف تھے۔

والدہ ماجدہ: حضرت فاطمہ بنت اسد بن عبد مناف تھیں اور اس لحاظ سے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام وہ پہلے ہاشمی ہیں جن کے باپ اور ماں دونوں ہاشمی تھے۔

تاریخ ولادت باسعادت: ۱۳۔رجب المرجب سن تیس عام الفیل ہے۔

مقامِ ولادت: کعبہ معظّمہ، بیت اللہ شریف

تاریخ شہادت: ۲۱۔رمضان المبارک ۴۰ھ

مقامِ شہادت: مسجدِ کوفہ، عراق

مدفن: نجفِ اشرف، عراق

مدتِ عمر: ۶۳ سال ___ حضرت رسالت مآبؐ کی عمرِ مبارک کے برابر۔

اولادِ امجاد: کتاب الارشاد صفحہ ۱۶۷ میں شیخ مفید علیہ الرحمۃ کے نزدیک آپ کی تمام اولاد کی تعداد ستائیس (۲۷) تک جا پہنچتی ہے، جن میں سے:

جناب امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ، جناب زینب کبریٰؑ، جناب زینب صغریٰؑ اور حضرت ام کلثوم سلام اللہ علیہم اجمعین۔ ان کی والدہ گرامی کا اسمِ مبارک حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہے۔

امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ذاتِ والا صفات اس کائنات کی وہ عظیم اور بے مثال اور منفرد شخصیت ہیں جن کی عظمت و بلندی، جامعیت و ہمہ گیری اور عالمی و آفاقی برتری کے اپنے، بیگانے دوست اور دشمن سب ہی قائل ہیں۔ قریش کے ایک ممتاز ترین گھرانے میں پیدا ہوئے، سرزمین حرم میں خانہ کعبہ کے اندر ولادت کا شرف حاصل کیا، نبوت کی تجلیوں میں آنکھیں کھولیں، رسالت کی فضاؤں میں پروان چڑھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے زیرِ سایہ پلے بڑھے، انہیں کے نقش قدم پر قدم رکھ کے بچپنے سے چلے پھرے۔ سفر و حضر میں سایہ کی طرح ساتھ رہے، خلوت و

جلوت میں ان کے فیضانِ صحبت سے فیضیاب ہوئے، انہی کے مکتب رشد و ہدایت میں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں اور انہی کے کردار و عمل کے نقوش کو قلب و نظر میں جگہ دی اور صفائے طینت و کمال تربیت کے نتیجہ میں اوج و عروج کے اس نقطہ بلند تک پہنچے کہ مہ و پروین کی بلندیاں بھی ان کی گزرگاہ میں گردِ راہ ہو کر رہ گئیں۔

حضورِ گرامی قدر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی میں جبکہ عرب کے باہم دست و گریبان قبائل اپنے باہمی اختلاف بھلا کر پیغمبر اسلامؐ کی دشمنی پر متحد ہو چکے تھے اور مشرکین قریش نیزوں، تلواروں اور ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مقابلے پر اتر آئے تھے تو آپؑ آہنی دیوار بن کر میدان حرب و ضرب میں کھڑے ہو گئے اور غیر معمولی جرأت و استقلال کے ساتھ دشمنانِ دین کی یلغاروں کو روکتے، سرکشانِ قریش کے غرور و طنطنہ کو خاک میں ملاتے اور کفر و شرک کے فلک بوس گنبدوں پر صاعقہ بن کر گرتے رہے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ جو بزعمِ خود قصرِ رسالتؐ کے گرانے اور اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے درپے تھے خود ہی اس طرح گرے کہ پھر سنبھل نہ سکے اور جو سنبھلے وہ ہتھیار ڈالنے پر اور اسلام کی کھلی مخالفت کے بعد اسلام کی آڑ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اسی لیے تو حضور رسالت مآبؐ نے جنگِ خندق میں آپؑ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ:

''بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّهُ اِلَی الْکُفْرِ کُلِّه'' یا بروایتے: ''اِلَی الشِّرْکِ کُلِّه'' کل ایمان نے کل کفر کا مقابلہ کیا۔ یا بروایتے کل ایمان نے کل شرک کا مقابلہ کیا۔

اسی بنا پر امیر المومنینؑ کی ذات گرامی ''ایمان مجسم'' قرار پائی اور یہی ہماری تفصیلی گفتگو کا مستقل عنوان ہے اور ہم انشاء اللہ اس بارے میں مفصل گفتگو کریں گے۔

ناظرینِ کرام! خطہ عرب براعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما ہے، جس کے شمال میں مملکت شام واقع ہے، جنوب میں بحرِ ہند کی نیلگوں موجیں متلاطم ہیں، مشرق میں بحرِ عمان اور خلیجِ فارس ہیں اور مغرب میں بحر احمر۔ بحر احمر کا ساحلی علاقہ بنجر اور شور ہے اور ساحل سے ہٹ کر خشک پہاڑوں، ریتلے ٹیلوں اور ریگستانوں کا سلسلہ حد نظر تک پھیلا ہوا ہے، یہ ریگستانی اور صحرائی خطہ ''حجاز'' کہلاتا ہے۔

اس وسیع ریگستان کی وادی ''بطحاء'' میں مستقل آبادی کی بنیاد ذریت ابراہیمیؑ سے ہوئی اور وہ یوں کہ جب نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کو ان کی اہلیہ سمیت جلاوطن کر دیا تو وہ اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو ساتھ لے کر سرزمین بابل سے نکل کھڑے ہوئے اور حلب و دمشق سے ہوتے ہوئے فلسطین آئے جو اس دور میں کنعان کہلاتا تھا پھر ایک عرصہ کے بعد دعوتِ توحید کے لیے مصر تشریف لے گئے۔

وہاں پر ایک عرصہ رہنے کے بعد آپ اپنی اہلیہ ہاجرہ اور ان کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قدرت کی رہنمائی اور مشیت میں صحرائے حجاز کے ایک ویران گوشے میں لے آئے اور یہی ویرانہ ایک دن ''ام القریٰ'' یعنی آبادیوں کا سرچشمہ قرار پایا۔ چنانچہ آپ نے جناب ہاجرہ اور اپنے فرزند اسماعیلؑ کو وہیں پر ٹھہرا دیا، اس لق و دق صحرا میں پانی کی ایک چھاگل آپ کے پاس تھی جو ایک آدھ دن کے بعد خالی ہوگئی، لیکن قدرت کی مہربانی سے وہیں پر تپتے ہوئے صحرا کے سینے سے سرد و شیریں پانی کا دھارا بہہ نکلا۔ حضرت ہاجرہؑ کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور بے ساختہ زبان سے نکلا ''زم زم'' جس کے عربی زبان میں معنی ہیں ''رک جا'' اور اسی لفظ نے بعد میں نام کی حیثیت اختیار کر لی اور وہ چشمہ ''زمزم'' کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

اسی زمانہ میں بنی جرہم کا ایک قافلہ یمن سے شام جاتے ہوئے یہاں سے گزرا، پرندوں کو اڑتا دیکھ کر آبادی کے خیال سے پہاڑی کے نیچے۔ اترا دیکھا کہ ایک خاتون بچے کو گود میں لیے سر جھکائے بیٹھی ہے اور ساتھ ہی پانی کا چشمہ ابل رہا ہے، حضرت ہاجرہ کی اجازت سے وہ قافلہ عارضی طور پر وہیں پر قیام پذیر ہوگیا، لیکن جناب ابراہیمؑ کی آمد کے بعد ان سے باقاعدہ اجازت لے کر مستقل طور پر مقیم ہوگیا اور ابتدا میں چند جھونپڑیوں اور خیموں کی ایک مختصر سی بستی قائم ہوگئی اور دنیا کے نقشے پر ایک متبرک ترین شہر کے ابتدائی خطوط ابھر آئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حکمِ الٰہی کے مطابق اسی ویران گوشے میں خانہ کعبہ کی تعمیر شروع کی ان کے لائق فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی اس کام میں ان کے شریک ہوگئے۔ حسنِ نیت اور خلوصِ عمل کا کرشمہ تھا کہ بہت جلد اسے تمام عرب میں مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس گھر کے تعلق سے ہر گوشہ اور ہر سمت سے لوگ کھنچ کھنچ کر آنے لگے۔ رفتہ رفتہ آبادی بڑھتی گئی اور جزیرۃ العرب کے دل اور مرکزی مقام پر ایک پر رونق بستی آباد ہوگئی جو ''بکہ'' کے نام سے موسوم ہوئی ہے، جو اس کا اصل اور قدیمی نام ہے۔ قرآن مجید نے بھی تعمیر کعبہ کے وقت اسے ''بکہ'' ہی کہا ہے، جس کا دوسرا نام جو زبان زد خلائق بھی ہے وہ ''مکہ'' ہے۔

قرآنِ مجید میں ''مکہ'' کو ام القریٰ بھی کہا گیا ہے، جس کا معنی ہے ''آبادیوں کی اصل و بنیاد'' یعنی یہاں سے انسانی سیلاب کا سرچشمہ اٹھا جو ویران خطوں اور افتادہ زمینوں سے ہوتا ہوا اطراف عالم میں پھیل گیا۔

یہ سرزمین حرم آبادیوں کی اصل و بنیاد ہونے کے علاوہ دین و ہدایت کا بھی مرکز ہے۔ اسی سرزمین پر اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر تعمیر ہوا۔ اسی مقام سے اسلام کی عالمی دعوت نشر ہوئی، توحید کا آوازہ بلند ہوا اور اللہ تعالیٰ کے آخری دین کی بنیاد پڑی۔ اسی

خطہ میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا اور ہدایت کی کرنیں پھوٹیں اور اسی کے افق سے وہ آفتابِ نبوت طلوع ہوا جس کی ضو پاش کرنوں سے نہ صرف ریگزارِ عرب کے ذرات لو دینے لگے بلکہ اس کی شعاعیں تاریک سے تاریک گوشوں کو منور کرتی ہوئی ایشاء کے مرغزاروں سے لے کر افریقہ کے تپتے ہوئے ریگزاروں تک پہنچ گئیں اور اسی سرزمین کو مولائے کائنات حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی جائے ولادت ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔

یہیں پر آپ کا بچپن اور اوائل شباب کا زمانہ گزرا، یہیں کے درودیوار سے پہلے پہل مانوس ہوئے، اس کے ریگزاروں اور خشک پہاڑوں میں چلے پھرے اور اسی کے کوہ وصحرا کے وسیع دامنوں میں نشو ونما پائی اور یہیں سے یثرب کی جانب ہجرت فرما ہوئے۔

خاندان اور سلسلہ نسب

یہ قانونِ فطرت ناقابلِ انکار ہے کہ اصل کی خصوصیات فرع کی طرف منتقل ہوتی ہیں اور ہر انسان آبائی موثرات کی پیداوار اور اپنے اسلاف کی شکل وشمائل کا ورثہ دار ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر فرد کے خدوخال میں اس کے آباؤاجداد کے خطوط ونقوش کی جھلک کم وبیش پائی جاتی ہے۔

یہ مماثلت صرف شکل وصورت، نِک سُک اور نوک و پلک ہی میں نہیں ہوتی بلکہ اولاد، خوخصلت اور افتادونہاد سے بھی اپنے اسلاف کی آئینہ دار ہوتی ہے اور ان کے طبعی خصائل وشمائل اس کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔

اسی اعتبار سے شکمِ مادر ہی میں آبائی خدوخال کے ساتھ آبائی خصوصیات بھی ابھرنی شروع ہوجاتی ہیں۔ جب نومولود دنیا میں آتا ہے تو وہ نہ صرف جسمانی لحاظ سے

بلکہ ذہنی ساخت کے اعتبار سے بھی والدین اور اسلاف سے مشابہ ہوتا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے ہاتھ پیر کی حرکتیں اُسی ذہنی قوت کی تحریک کا نتیجہ ہوتی ہیں جسے وہ ماں باپ سے ورثہ میں لے کر آتا ہے۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی نسبی وخاندانی رفعت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپؑ کے اُن اسلاف پر بھی ایک نظر کی جائے جن کی پشتوں میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہے ہیں تاکہ نسلی خصوصیات اور ان خصائص وصفات کا اندازہ ہوسکے جو انہیں اپنے آباؤاجداد سے بتقاضائے بشریت ورثہ میں ملے اور ان کی عظیم شخصیت کی تعمیر میں ایک مناسب اور سازگار عنصر کی حیثیت سے کارفرما رہے۔

اس مقام پر ہم ایمانِ مجسم، امام معظم، ولی اللہ الاعظم حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کا سلسلہ نسب آپ کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں:

علیؑ بن ابی طالبؑ بن عبدالمطلبؑ بن ہاشمؑ بن عبدمناف بن قصی
بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر بن مالک
بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مُضر بن نزار
بن معد بن عدنان۔

تاریخ عرب شاہد ہے کہ اس سلسلہ جلیلہ کا ہر فرد اپنے اپنے عہد میں دنیا کی بڑی اور عظیم شخصیت تھا، اور اپنے آداب وطرزِ معاشرت میں ایک خاص تہذیب کا حامل، مسلک ابراہیمیؑ کا پیروکار، اصلاح وتجدید کا پیغامبر، ذہنی وعملی انقلاب کا داعی اور بے داغ کردار کا مالک تھا۔ انہوں نے کفرستانِ عرب کی تاریکی وتیرگی میں دین حنیف کی شمعیں بلند رکھیں، وحشت، جہالت اور اخلاقی زبوں حالی کے دور میں اخلاقی اقدار کی حفاظت کی اور اپنے کردار وعمل سے عظمتِ انسانی کے نقوش روشن کیے۔

تہذیب و شائستگی کے فروغ، معاشرہ کی اصلاح و ترقی اور عُمرانی و اجتماعی عدل اور
انسانی حقوق کے تحفظ کو اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد قرار دیا۔ شر و فساد کے عناصر کو کچلنے
اور انسانیت، اخوت اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے میں مساعی جمیلہ کو سرگرمِ عمل
رکھا، تفرقہ بندیوں کو ختم کرنے کے لیے جماعتی تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ تجارت کو فروغ
دے کر معاشی فلاح و بہبود کا سامان کیا۔ مظلوموں کی حمایت و حق رسی کا بیڑا اٹھایا۔
دور دراز سے آنے والے حاجیوں کی مہمانداری اور مسافروں اور بے نواؤں کی
خدمت و اعانت کا ذمہ لیا، یہی وہ امتیازات تھے جن کی وجہ سے انہوں نے عوام کے
دلوں میں شایانِ شان مقام حاصل کیا اور عظمت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھے گئے۔

قبائل عرب میں اُسی سلسلہ نسب کو اہمیت دی جاتی تھی جس میں قصی، ہاشم
اور عبدالمطلب کے نام منسلک ہوتے تھے اور جن سلسلوں میں ان کا نام نہ آتا تھا وہ
چنداں درخور اعتناء نہیں سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ جن شاخوں میں قصی کا نام تو آجاتا ہے
مگر ہاشم و عبدالمطلب کے ناموں سے خالی ہیں وہ شاخیں بھی عام قبائل کی سطح سے بلند
نہ ہو سکیں۔

غرض جو شرف اور امتیاز قدرت نے ہاشمی اور مطلبی نسل کو دیا وہ کسی اور کو
نصیب نہ ہو سکا اور نہ ہی کوئی بلندی و اوصاف میں ان کی برابری کا دعویٰ کر سکا۔ یہی وہ
پاکیزہ سلسلہ ہے جو نسلی آلودگیوں سے مبرا اور شرف و برگزیدگی کے تاج و نگین سے
آراستہ رہا۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد ٢ ص ٢٢١ میں ہے کہ: سرکارِ رسالت مآب ﷺ
کا ارشاد گرامی ہے: خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے اسماعیل علیہ السلام کو،
اسماعیلؑ کی اولاد سے بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ سے قریش کو اور قریش سے بنی ہاشم کو اور
بنی ہاشم سے مجھے منتخب فرمایا۔

اس برگزیدگی اور انتخاب میں حضرت علی علیہ السلام بھی شریک ہیں اس لیے

کہ سرکار رسالت مآب ﷺ اور امیر المومنین علیہ السلام دونوں ہم نسب ہیں، دونوں کے آباؤ
اجداد ایک ہیں، دونوں ایک ہی سلسلہ کے اصلاب و ارحام سے منتقل ہوتے ہوئے
حضرت ہاشم تک اور پھر حضرت عبدالمطلب تک منتہی ہوتے ہیں۔

حضرت عبدالمطلب کی مختلف ازواج سے دس فرزند تھے، ان فرزندوں میں
سے حضرت عبد اللہ اور حضرت ابو طالبؑ حقیقی بھائی تھے، دونوں کی والدہ ماجدہ
حضرت فاطمہ بنت عمرو بن عائذ بن عمران مخزومیہ تھیں۔ عبد اللہؑ سے حضرت رسول خداؐ
پیدا ہوئے اور ابو طالبؑ سے حضرت علیؑ، جو اپنے دادا عبدالمطلب پر رسول خداؐ سے مل
جاتے ہیں۔

اسی لیے دونوں مطلبی، دونوں ہاشمی، دونوں قریشی اور دونوں ایک ہی معدن
کے گوہر شاہوار اور ایک ہی شجرہ طیبہ کے برگ و بار تھے اور حضرت علیؑ کے حصہ میں نسل
و خاندان کی ہر وہ فضیلت آئی جو رسول خداؐ کے پائے نام تھی اور رسول اسلام ﷺ
سے اتحاد نسل کے اعتبار سے اور سلسلہ آباؤ اجداد کے لحاظ سے اور شیخ البطحاء ابو طالب
علیہ السلام کے ذریعہ جو شرف و امتیاز انہیں حاصل ہے وہ نسبی جلالت کے ماتھے کا جھومر اور حسبی
شرافت کے کلاہ کا طرہ درخشاں ہے۔

والدِ گرامی حضرت ابو طالب علیہ السلام

ایمان مجسم، امام معظم، ولی اللہ الاعظم حضرت علی علیہ السلام کے والدِ گرامی
جناب ابو طالبؑ کا نام عبد مناف یا عمران بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف ہے،
رسول خدا ﷺ کے چچا محترم اور آپؐ کے زبردست حامی اور محافظ تھے۔ حضرت
ابو طالب علیہ السلام کے والد گرامی جناب عبدالمطلب مکہ کے سردار اور خانہ کعبہ کے
زائرین اور حجاج کرام کے لیے ''سقایت'' اور ''رفادت'' اور فراہمی آرام و آسائش

کے منصب پر فائز تھے، یعنی ان کی غذا و خوراک کا بندوبست فرمایا کرتے تھے۔

۸ عام الفیل میں بوقت وفات، جناب عبدالمطلب نے اپنی تمام اولاد کو اکٹھا کیا اور اپنے یتیم پوتے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی کفالت حضرت ابوطالبؑ کے سپرد کی اور انہیں حضور محمد مصطفیٰ ﷺ کی ہر طرح کی حفاظت اور نگرانی کی وصیت فرمائی۔ اس وقت سے جناب ابوطالبؑ نے اپنے والد گرامی کے جانشین کی حیثیت سے حضرت محمد ﷺ کی سرپرستی اپنے ذمہ لے لی اور بعثت پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد بھی آپ کی ہر طرح سے نصرت اور حمایت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

روایات کے مطابق آپ بھی قریش کے دوسرے افراد کی مانند تجارت کیا کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ جب شام کی طرف تجارت کے لیے تشریف لے گئے تو حضور محمد مصطفیٰ ﷺ کو بھی اپنے ساتھ شام لے گئے، اسی سفر میں نصرانی راہب ''بُحیرا'' نے آنجنابؐ کو نبوت و رسالت کی خوشخبری دی۔

قریش میں جناب ابوطالبؑ کی سخاوت شہرت کی حامل تھی، جب بھی آپ کھانا تیار فرماتے تو قبیلے کا ہر ایک فرد اس سے بہرہ مند ہوتا اور اپنے اپنے گھروں میں کھانا تیار نہیں کرتے تھے۔

جناب ابوطالبؑ کی ژرف نگاہی، عدالت اور اثر و رسوخ کے بارے میں ہے کہ مکہ میں عرب کے قبائل اپنے مقدمات کا فیصلہ حضرت ابوطالبؑ سے کراتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی آپ فیصلے کرتے وقت حق کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے، کسی کی رو رعایت کیے بغیر مبنی برحق فیصلہ کیا کرتے تھے۔

آپؑ نے حُجاج کی خدمت کا جو منصب سقایت و رفادت اپنے والد گرامی سے ورثہ میں لیا تھا وہ قرضہ کی ادائیگی کے طور پر اپنے بھائی عباس کو سونپ دیا تھا، کیونکہ آپ کی عظمت کے سامنے اور سیادت کے آگے اگرچہ تمام لوگ سرتسلیم خم کئے

ہوئے تھے اس کے باوجود ایک تنگدست انسان تھے مگر اپنی شرافت، بلندیٔ طبع اور رفعت شان کی وجہ سے اس تنگ دستی کو کسی پر آشکارا نہیں ہونے دیا۔

اب جبکہ حضرت ابوطالب علیہ السلام کی تائید اور توسط سے جناب رسالت مآب ﷺ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے شادی کر لی اور معاشی حالات بہتر ہو گئے تو ایک مرتبہ مکہ میں قحط سالی کی وجہ سے آپؐ نے حضرت ابوطالبؑ کا ہاتھ بٹانے کے لیے حضرت علیؑ کو اپنی کفالت میں لے لیا اور زندگی کے آخری ایام تک حضرت علی علیہ السلام کی تربیت کرتے رہے۔

جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مبعوث برسالت ہوئے اور اعلان رسالت فرمایا تو جناب ابوطالبؑ نے آپ کی حفاظت کا فریضہ حضرت علی علیہ السلام کے سپرد فرمایا اور خود بھی سرکار ختمی مرتبت کو اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ جیسا کہ کتاب کامل ابن اثیر ج ۱ ص ۴۱ میں ہے کہ آپ نے جذبہ حق پرستی سے متاثر ہو کر پر اعتماد لہجے میں کہا: ''وَاللّٰهِ لَنَمْعَنَّهُ مَا بَقِيْنَا'' خدا کی قسم جب تک ہم زندہ رہیں گے اُن کی حفاظت کریں گے۔

الکامل ابن اثیر ج ۲ ص ۴۳ میں ہے کہ: جب قریش نے دیکھا کہ ان کے عقائد کا تحفظ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ جب اس داعی حق وحقیقت کا خاتمہ کر دیا جائے، مگر ابوطالبؑ کے ہوتے ہوئے انہیں آنحضرتؐ پر حملہ کرنے کی جرأت بھی نہ تھی، تو انہوں نے ابوطالبؑ کی حمایت و سرپرستی کو ختم کرنے کے لیے یہ کھیل کھیلا کہ ''عُمارہ بن ولید'' نامی ایک خوبصورت نوجوان کو ابوطالبؑ کے پاس لائے اور کہا کہ آپ اسے اپنا بیٹا بنا لیجئے اور محمدؐ کی حمایت سے دستبردار ہو جایئے، جب حضرت ابوطالبؑ نے ان کی یہ انوکھی فرمائش سنی تو فرمایا:

''أَتُعْطُوْنَنِیْ اِبْنَكُمْ اَغْذُوْهُ لَكُمْ وَ اُعْطِيْكُمْ اِبْنِیْ

تَقْتُلُوْنَهُ هذا و الله لا یکون ابدا''

یہ اچھا انصاف ہے کہ میں تمہارے بیٹے کو پالوں اور اپنے بیٹے کو قتل کرنے کے لیے تمہارے سپرد کردوں؟ خدا کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح جب قریش نے حضرت ابوطالبؑ کے پاس دوبارہ آکر کہا اگر محمدؐ اپنی روش سے باز نہ آئے تو ہم انہیں قتل کردیں گے، لہٰذا آپ اپنے بھتیجے کو سمجھائیں کہ وہ خاموش ہوجائیں اور اپنے سلسلہ تبلیغ کو بند کردیں ورنہ آپ درمیان سے ہٹ جائیں اور ہمیں دوٹوک فیصلہ کر لینے دیں۔

چنانچہ جب ابوطالبؑ نے حضورؐ کو ان کے جذبات سے آگاہ کیا تو آپؐ نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا: ''خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند لاکر رکھ دیں، جب بھی میں اعلانِ حق اور ادائے فرض سے دستبردار نہیں ہوسکتا''

جب ابوطالبؑ نے آپؐ سے یہ الفاظ سنے تو بوڑھے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا اور ان کے عزم واستقلال سے متاثر ہوکر پوری خوداعتمادی کے ساتھ کہا: جیسا کہ تاریخ طبری میں جلد۲ص۶۷ میں ہے:

''اِذْهَبْ یَا ابْنَ اَخِیْ فَقُلْ مَا اَحْبَبْتَ فَوَاللّٰهِ لَا اُسْلِمُکَ لِشَیْءٍ اَبَدًا '' فرزند برادر جائیے اور جو جی چاہے کہیے، خدا کی قسم میں آپ کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔

اس تجدید عہد کے بعد ابوطالبؑ نے قریش کی طرف رخ کیا اور کہا جیسا کہ کتاب الاصابۃ ج۴ص۱۱۶ میں ہے:

''وَاللّٰهِ مَا کَذَبَ ابْنُ اَخِیْ قَطُّ''

آپ لوگ کیا کھڑے ہیں جایئے خدا کی قسم میرے بھتیجے کی زبان کبھی جھوٹ سے آشنا نہیں ہوئی۔

اسی طرح آخرِ دم تک آپؑ پیغمبر اسلامؐ کی حفاظت کرتے رہے اور آپ نے اسی حفاظت اور خدمت رسولؐ کی وصیت اپنی اولاد کو بھی کی، جس کی بنا پر حضرت علی علیہ السلام نے اپنی ساری زندگی اسلام اور رسول اسلام ﷺ کی خدمت اور حفاظت میں صرف کردی۔ تو یہ سبق تھا اس عظیم باپ کا۔

والدہ ماجدہ ___ فاطمہ بنت اسدؑ

ایمان مجسم، امام معظم امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی فاطمہ بنت اسد تھا۔ جبکہ اسد قبیلہ بنت عامر کے بطن سے حضرت ہاشم کے فرزند تھے، اس لحاظ سے آپ جناب ہاشم کی پوتی اور رسول اللہؐ کی پھوپھی اور حرم ابوطالبؑ ہونے کی بنا پر چچی ہوئیں۔

جب حضرت رسالت مآب ﷺ حضرت ابوطالبؑ کی کفالت میں آئے تو انہی کی گود، پیغمبر ایسے ہادی اکبر اور رہنمائے اعظم کی گہوارہ تربیت بنی اور انہی کی آغوش محبت و شفقت میں پرورش پائی۔ اگر ابوطالبؑ نے تربیت میں باپ کے فرائض انجام دیئے تو فاطمہ بنت اسد نے آنجنابؐ کی اس طرح محبت اور دلسوزی کے ساتھ دیکھ بھال کی کہ یتیم عبداللہ کو ماں کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ ان کا اپنے بچوں سے زیادہ خیال رکھتیں، پیغمبر اکرمؐ بھی انہیں ماں سمجھتے، ماں کہہ کر پکارتے اور ماں ہی کی طرح عزت اور احترام کرتے تھے۔ کتاب الاستیعاب جلد۲ص۴۷۷ میں ہے کہ ان کی شفقت و محبت کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا: حضرت ابوطالب علیہ السلام کے بعد ان سے زیادہ کوئی مجھ پر شفیق اور مہربان نہ تھا اور منصبِ رسالت پر فائز

ہونے کے بعد اپنے منصبی فرائض سے وقت نکالتے، ان کے ہاں آتے اور اکثر دوپہر کے اوقات انہی کے ہاں گزارتے، چنانچہ طبقات ابن سعد ج۸ص۲۲۲ میں ہے:''کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ یَزُوْرُھَا وَ یَقِیْلُ فِی بَیْتِھَا'' حضرت رسول خداؐ آپ کی زیارت کو آتے اور دوپہر کو انہی کے ہاں استراحت فرماتے۔

جناب ابوطالبؑ ہاشمی تھے اور جناب فاطمہ بنت اسد بھی ہاشمیہ تھیں، لہٰذا مادری، پدری دونوں نسبتوں سے ہاشمی ہونے کا شرف سب سے پہلے ابوطالبؑ اور فاطمہ بنت اسد کی ہی اولاد کو حاصل ہوا۔

ابن قتیبہ کتاب ''المعارف'' ص ۸۸ میں لکھتے ہیں: ''فاطمہ بنت اسد پہلی ہاشمیہ خاتون ہیں جن سے نجیب الطرفین ہاشمی اولاد ہوئی''

ایمان مجسم کی پاکیزہ زندگی

ناظرین محترم! جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ ایمان مجسم، امام معظم، ولی اللہ الاعظم، امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت باسعادت ۱۳۔ رجب المرجب ۳۰ عام الفیل کو خانہ کعبہ کے اندر ہوئی اور ۲۱۔ رمضان ۴۰ھ کو مسجد کوفہ میں آپؑ کو شرف شہادت حاصل ہوا۔ آپ کی مجموعی طور پر دنیوی زندگی ۶۳ سال بنتی ہے۔

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے کہ جب سرکار رسالت مآب ﷺ مبعوث برسالت ہوئے تھے تو اس وقت آپ کا سن مبارک دس سال کا تھا اور اسی عمر سے آپ نے تاریخ اسلام میں رونما ہونے والے تمام حوادث اور واقعات کو رسول گرامیؐ کے ساتھ مل کر بچشم خود ملاحظہ فرمایا اور شریک کارِ رسالت رہے۔ حضور گرامیؐ کی رحلت کے بعد بھی آپؑ نے تیس سال زندگی گزاری۔

اس لحاظ سے ہم مجموعی زندگی ۶۳ سال کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے اور اپنے ناظرین کو بتائیں گے کہ آپ کی زندگی کے پانچ بابرکت دورانئے کس طرح اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں گزرے؟ توجہ فرمائیے:

۱۔ آپ کی ولادت باسعادت سے پیغمبر اکرمؐ کی بعثت تک
۲۔ حضورؐ کی بعثت سے ہجرت تک
۳۔ حضورؐ کی ہجرت سے رحلت تک
۴۔ حضورؐ کی رحلت سے اپنی خلافت ظاہری کے آغاز تک
۵۔ دوران خلافت سے شہادت تک

۱۔ ایمان مجسم ولادت سے بعثت پیغمبرؐ تک

ناظرین! جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ اگر ہم ایمان مجسم، امام معظم، ولی اللہ الاعظم حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی زندگی کو پانچ حصوں میں تقسیم کریں تو زندگی کا پہلا حصہ بعثت سے دس سال پہلے پر مشتمل ہے، کیونکہ آپ کی ولادت باسعادت حضورؐ کی ولادت کے تیس سال بعد ہوئی اور حضور اکرمؐ نے چالیس سال کی عمر میں اعلانِ رسالت فرمایا، تو گویا بوقتِ اعلانِ رسالت امیرالمومنین علی علیہ السلام دس برس کے تھے۔

آپؑ کی زندگی کا یہ عرصہ ایک حساس دورانیے پر مشتمل تھا، کیونکہ اس دوران میں آپ کی روحانی تربیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے زیر سایہ اور آپؐ کے خانہ اقدس میں ہوئی، اسلامی مورخین مثلاً:

۱۔ ابن اثیر اپنی کتاب ''الکامل فی التاریخ'' جلد۲ ص۵۸ میں
۲۔ عبدالملک بن ہشام اپنی کتاب ''سیرتِ نبویہ'' جلد۲ ص۲۶۲ میں

۳۔محمد بن جریر طبری کتاب ''تاریخ الامم والملوک'' جلد۲ص ۱۳ میں

۴۔ابن ابی الحدید اپنی کتاب شرح نہج البلاغہ جلد۳ص ۱۱۹ میں لکھتے ہیں:

''ایک سال مکہ میں شدید قحط ہوا، اس وقت جناب رسالت مآبﷺ کے چچا بزرگوار حضرت ابوطالبؑ کا بڑا کنبہ تھا اور اخراجات بہت زیادہ تھے، حضور محمد مصطفیٰؐ نے اپنے چچا جناب عباس کو جو بنی ہاشم کے ثروت مند ترین افراد میں سے تھے، یہ تجویز پیش کی کہ ہم میں سے ہر ایک کو جناب ابوطالبؑ کے فرزندان میں سے ایک ایک فرد کی کفالت کرنی چاہیے تاکہ چچا ابوطالبؑ سے مالی دباؤ کم ہو سکے، چنانچہ حضرت عباس نے حضور پاکؐ کی اس تجویز کو پسند کیا اور دونوں حضرت ابوطالبؑ کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں تمام تفصیل سے آگاہ کیا، انہوں نے بھی اس تجویز سے موافقت فرمائی، جس کے نتیجے میں حضرت عباس، جناب جعفر بن ابوطالب کو اور حضرت محمدﷺ حضرت علیؑ کو اپنے گھر میں لے آئے۔''

حضرت علیؑ اسی طرح حضرت محمدﷺ کے گھر میں تھے ہی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰؐ کو رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا اور حضرت علیؑ نے سب سے پہلے آنجنابؐ کی رسالت کی تصدیق کی۔

ابوالفرج اصفہانی اپنی کتاب ''مقاتل الطالبین'' ص۱۳ میں لکھتے ہیں کہ:

''اس بارے میں حضرت محمد مصطفیٰؐ فرمایا کرتے تھے کہ: میں نے اُسی شخص کو منتخب کیا ہے جسے خدا نے میرے لیے منتخب فرمایا ہے''

ناظرین! جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰﷺ نے اپنی زندگی کے آٹھ سال اپنے جد بزرگوار حضرت عبدالمطلب کے زیرِ سایہ اور ان کی زیرِ تربیت گزارے اور حضرت عبدالمطلب نے بوقتِ وفات ان کی تربیت اور کفالت کی ذمہ داری حضرت ابوطالبؑ کے سپرد کی اس طرح حضور پاکؐ آٹھ سال کی عمر میں اپنے چچا بزرگوار حضرت ابوطالبؑ کے زیرِ کفالت آ گئے اور انہی کے زیرِ سایہ پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔

اسی لیے حضور پاکﷺ چاہتے تھے کہ حضرت ابوطالبؑ کے کسی فرزند کی کفالت اور تربیت کر کے حضرت ابوطالبؑ اور جناب فاطمہؑ بنت اسد کی زحمات کا شکریہ ادا کریں اور اُن کے ان فرزندوں میں سے آپؐ کی نگاہ حضرت علیؑ پر تھی، چنانچہ امیرالمومنینؑ نے اپنی خلافت کے دوران اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا: جیسا کہ نہج البلاغہ صبحی صالحی خطبہ قاصعہ ۱۹۲ میں فرماتے ہیں:

''وَقَدْ عَلِمْتُمْ مَوْضِعِي مِنْ رَسُولِ اللهِ(صلى الله عليه و آله) بِالْقَرَابَةِ الْقَرِيبَةِ، وَالْمَنْزِلَةِ الْخَصِيصَةِ :وَضَعَنِي فِي حِجْرِهِ وَأَنَا وَلَدٌ يَضُمُّنِي إِلَى صَدْرِهِ، وَيَكْنُفُنِي فِي فِرَاشِهِ، وَيُمِسُّنِي جَسَدَهُ، وَيُشِمُّنِي عَرْفَهُ، وَكَانَ يَمْضَغُ الشَّيْءَ ثُمَّ يُلْقِمُنِيهِ، ....''

تم اصحابِ پیغمبر (ﷺ) اچھی طرح جانتے ہو کہ میرا حضرت رسول خداؐ کے ساتھ کس قدر قریب ترین رشتہ ہے اور مجھے آنحضرتؐ سے کس قدر خصوصی منزلت کا شرف حاصل ہے!! اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں ابھی کم سن بچہ تھا کہ حضور سرورِ کائناتؐ مجھے اپنی آغوشِ محبت میں لے لیتے تھے، اپنے سینے سے لگایا

کرتے تھے، مجھے اپنے ساتھ بستر میں سلایا کرتے تھے، میرا جسم حضور اقدس کے جسمِ مبارک سے مس ہوا کرتا تھا اور میں آپؐ کے معطر پسینے کی خوشبو کو سونگھا کرتا تھا، حضور انورؐ غذا کو اپنے منہ میں چبا چبا کر مجھے کھلایا کرتے تھے............

''............وَ لَقَدْ كُنْتُ اَتَّبِعُهُ اِتِّبَاعَ الْفَصِيْلِ اَثَرَ اُمِّهٖ يَرْفَعُ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ مِنْ اَخْلَاقِهٖ عَلَماً وَ يَاْمُرُنِيْ بِالْاِقْتِدَاءِ بِهٖ''

............جس طرح معصوم بچہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلا کرتا ہے میں بھی ہر جگہ حضورؐ کے پیچھے پیچھے چلا کرتا تھا، آپ روزانہ مجھے اخلاقی فضائل کی تعلیم دیا کرتے تھے اور ساتھ ہی مجھے حکم دیا کرتے تھے کہ میں ان اخلاق کی پیروی کروں۔

ایمانِ مجسم، حضورؐ کے ساتھ ___ غارِ حرا میں

ناظرین گرامی، یقیناً جانتے ہوں گے کہ مکہ مکرمہ کے شمال میں ''حرا'' نامی ایک پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر ایک غار ہے، اسے ''غارِ حرا'' کہتے ہیں، چنانچہ سیرۃ ابن ہشام جلد ا ص ۲۵۲ میں ہے:

''سرکار محمد مصطفیٰ ﷺ مبعوث برسالت ہونے سے پہلے سال میں ایک مرتبہ ایک ماہ کے لیے اسی غار میں تشریف لا کر خدا کی عبادت کیا کرتے تھے اور اگر اس دوران میں کوئی فقیر اور سوالی آجاتا تھا تو اسے کھانا کھلاتے تھے اور مہینے کے اختتام پر جب گھر تشریف لے جانا چاہتے تو پہلے ''مسجد الحرام'' جاتے اور سات

مرتبہ یا جتنا مرتبہ خدا چاہتا خانہ کعبہ کا طواف کرتے پھر اپنے دولت کدہ کی طرف تشریف لے جاتے۔

قرائن بتاتے ہیں کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کو امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام سے جو شدید محبت تھی اسی وجہ سے حضورؐ انہیں بھی اس عرصہ کے لیے غارِ حرا میں اپنے ساتھ لے جاتے اور جب پہلی بار فرشتہ وحی اسی غار میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی لے کر نازل ہوا اور از جانب پروردگار منصبِ رسالت سے نوازا تو حضرت علی علیہ السلام اس وقت بھی سرکار رسالت مآب ﷺ کے ساتھ تشریف فرما تھے اور یہ وہی ایام تھے جن میں حضور پاکؐ عبادتِ پروردگار عالم کے لیے کوہِ حرا میں تشریف لے جایا کرتے تھے:

حضرت علی علیہ السلام اس بارے میں نہج البلاغہ کے اسی خطبہ قاصعہ میں فرماتے ہیں:

''وَ لَقَدْ كَانَ يُجَاوِرُ فِيْ كُلِّ سَنَةٍ بِحَرَاءَ فَاَرَاهُ وَلَا يَرَاهُ غَيْرِيْ .... وَلَقَدْ سَمِعْتُ رَنَّةَ الشَّيْطَانِ حِيْنَ نَزَلَ الْوَحْيُ عَلَيْهِ، فَقُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا هٰذِهِ الرَّنَّةُ؟ فَقَالَ: هٰذَا الشَّيْطَانُ قَدْ اَيِسَ مِنْ عِبَادَتِهٖ، اِنَّكَ تَسْمَعُ مَا اَسْمَعُ وَ تَرٰى مَا اَرٰى اِلَّا اَنَّكَ لَسْتَ بِنَبِيٍّ وَلٰكِنَّكَ لَوَزِيْرٌ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خَيْرٍ''

حضرت رسول پاک ﷺ ہر سال عبادت خدا کے لیے کوہِ حرا میں تشریف لے جاتے اور میرے علاوہ کوئی اور شخص آپ کو نہیں دیکھ پاتا تھا......تو جب آنحضرت ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو میں نے شیطان کی چیخ و پکار کی آواز سنی، حضورؐ کی خدمت میں

عرض کیا: ''حضورؐ! یہ چیخ و پکار کیسی؟ تو حضور نے فرمایا: یہ شیطان کے چیخنے چلانے کی آواز ہے'' اب وہ اس بات سے ناامید ہو گیا ہے کہ روئے زمین پر اس کی عبادت ہو۔

یا علیؑ! جو کچھ میں سن رہا ہوں تم بھی وہی کچھ سن رہے ہو اور جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں تم بھی وہی دیکھ رہے ہو، مگر فرق یہ ہے کہ تم نبی نہیں ہو بلکہ میرے وزیر ہو اور خیر پر قائم ہو۔

بہر صورت علی علیہ السلام کے روح کی پاکیزگی اور سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسلسل تربیت اس بات کا سبب بن گئی کہ آپ اسی بچپن کے دوران ہی سے اپنے حساس قلب، گہری بصیرت اور باہوش سماعت کے ذریعہ ایسی چیزوں کو دیکھتے اور ایسی باتوں کو سنتے تھے جن کا دیکھنا اور سننا عام انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔

ابن ابی الحدید معتزلی نہج البلاغہ کی شرح جلد ۱۳ ص ۲۰۸ میں لکھتے ہیں کہ:

''کتبِ صحاح میں روایت کی گئی ہے کہ جب جبرائیل امینؑ پہلی بار حضرت رسول خداؐ پر نازل ہوئے اور آپؐ کو منصب رسالت سے خدا کی جانب سے نوازا گیا تو اس وقت حضرت علی علیہ السلام بھی حضور پیغمبر خداؐ کے پاس موجود تھے''

اسی کتاب میں ہے: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:
حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث برسالت ہونے سے پہلے ہی آپؐ کے ساتھ ساتھ رہے، حضورؐ کی نبوت کے نور کو ملاحظہ فرمایا کرتے اور فرشتے کی آواز کو بھی سنا کرتے تھے، رسالت مآبؐ ان سے فرماتے تھے کہ اگر میں خاتم النبیین نہ ہوتا تو تم ضرور پیغمبر ہوتے، البتہ تم میرے وصی اور وارث ہو اور اوصیاء کے سردار اور پرہیزگاروں کے پیشوا اور متقین کے امام ہو۔

۲۔ ایمانِ مجسم ___ بعثت سے ہجرت تک

حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کا دوسرا حصہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت پر مشتمل ہے، جو تیرہ سال بنتا ہے اور آپؑ کی زندگی کا یہ عرصہ اسلام کی ترقی اور پیشرفت کے لیے روشن خدمات، جہاد اور عظیم اور برجستہ اقدامات کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے، جو تاریخ اسلام میں کسی دوسرے کے نصیب نہیں ہوئے۔

مسلمِ اول شہ مردان علیؑ

اسی دوران میں علی بن ابی طالب علیہ السلام کا سب سے پہلا اعزاز اور افتخار یہ تھا کہ آپؑ نے تمام دنیا سے سب سے پہلے اسلام کو قبول فرمایا، بلکہ اس سے بہتر الفاظ میں یوں کہوں کہ دیرینہ مدت سے اپنے دل میں چھپائے ہوئے اسلام کا اظہار فرمایا، کیونکہ مناقب خوارزمی ص ۱۸ کے مطابق علی بن ابی طالبؑ اپنے بچپن ہی سے توحید پرست تھے اور کبھی بھی خود کو بت پرستی سے آلودہ نہیں کیا، تاکہ یہ کہا جائے کہ بت پرستی سے دست کشی کر کے اسلام کو قبول فرمایا، جبکہ دوسرے لوگوں کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا۔

اسلام کے اظہار میں سبقت بہت بڑا اعزاز ہے جس پر قرآن کو بھی فخر ہے، جیسا کہ سورہ واقعہ آیت نمبر ۱۰ اور ۱۱ میں فرماتا ہے: ''وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ'' سبقت لے کر آگے بڑھنے والے ہی تو مقربان بارگاہ ہیں۔
اسلام کی قبولیت کے لیے سبقت ایک ایسا موضوع ہے جس پر قرآن نے اپنی خاص توجہ مرکوز کی ہے، حتی کہ جو لوگ فتح مکہ سے پہلے ایمان لے آئے اور اپنے جان اور مال کو راہِ خدا میں خرچ کر دیا خداوند عالم نے انہیں ان لوگوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے جو

فتح مکہ کے بعد ایمان لے آئے، چہ جائیکہ وہ لوگ جو ہجرت سے پہلے اور اسلام کے ابتدائی دور میں اسلام لے آئے، ان کے بارے میں قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (سورہ حدید آیت ۱۰)

’’لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ . اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ م بَعْدُ وَقَاتَلُوْا . وَکُلًّا وَّعَدَاللّٰہُ الْحُسْنٰی‘‘

تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے راہ خدا میں خرچ کیا اور جہاد کیا، ان لوگوں کے برابر نہیں ہیں جنہوں نے اس کے بعد راہِ خدا میں خرچ کیا اور جہاد کیا، وہ لوگ خدا کے نزدیک بہت عظیم درجہ کے مالک ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہر ایک سے اچھا وعدہ کیا ہے۔

یاد رہے کہ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہونے والوں کو یہ فضیلت اور برتری حاصل ہے کہ وہ لوگ اس وقت مسلمان ہوئے جب اسلام ابھی جزیرۃ العرب میں بھی پوری طرح اپنی اوج وعظمت اور رفعت وعروج تک نہیں پہنچا تھا، بت پرستی کا مرکزی مقام یعنی مکہ معظّمہ ابھی تک ناقابلِ شکست اور مضبوط قلعہ کی حیثیت سے باقی تھا اور مسلمانوں کے جان و مال کو ہر طرف سے خطرات نے اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔

مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت اور اوس وخزرج اور مدینہ کے اطراف کے دوسرے قبائل کے مسلمان ہوجانے کے بعد مسلمانوں نے کسی حد تک سکھ کا سانس لیا اور اسلام بھی آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگا، مسلمانوں کو کسی حد تک جنگوں میں بھی کامیابی حاصل ہونے لگی مگر مکمل طور پر خطرات دور نہیں ہوئے تھے، اسی لیے اسلام کی طرف

جھکاؤ اور خطرناک حالات میں جان و مال کی قربانی کو خاص اہمیت حاصل تھی، کیونکہ پیغمبر اکرمؐ کی دعوت کے ابتدائی ایام میں جبکہ قریش کی قدرت اور طاقت کے علاوہ کسی اور کے پاس طاقت موجود نہیں تھی اور بت پرستوں کے علاوہ کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں تھی، اس وقت اسلام اور ایمان کا اظہار جہاد اکبر سے کم نہیں تھا اسی لیے اصحاب رسولؐ کے اندر اسلام کے لیے سبقت کا جذبہ اہم ترین اعزاز کا حامل تھا۔

مذکورہ تصریحات کے بعد حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی اسلام میں سبقت کی عظمت بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔

ایمانِ مجسم ___ سابق الاسلام کیسے؟

ایمان مجسم، امام معظم، ولی اللہ الاعظم حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے اسلامی تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں سابق الاسلام ہونے کے دلائل اور شواہد اس قدر زیادہ ہیں کہ جنہیں بیان کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے اور نہ ہی ہمارا یہ پروگرام اس کا متحمل ہوسکتا ہے، صرف بطورِ نمونہ یہاں پر چند ایک کو ذکر کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

الف: سب سے پہلے خود سرکار ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے سابق الاسلام ہونے کو بیان فرمایا ہے اور اصحابِ باوقار کے بھرے مجمع میں اس بات کا اعلان بھی فرمایا ہے، جیسا کہ ابن عبد البر کی کتاب ’’الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب‘‘ جلد۳ ص۲۸ میں ابن ابی الحدید کی ’’شرح نہج البلاغہ‘‘ جلد۱۳ ص۱۱۹ میں اور حاکم نیشابوری کی کتاب ’’المستدرک علی الصحیحین‘‘ جلد۳ ص۱۷ میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

’’اولکم ورودًا علی الحوض اولکم اسلاما علی بن

ابی طالب''

بروزِ قیامت حوضِ کوثر کے کنارے جو شخص مجھ سے سب سے پہلے ملاقات کرے گا وہی ہے جو سب سے پہلے مجھ پر اسلام لایا یعنی علی بن ابی طالب علیہ السلام۔

ب: علماء اور محدثین نے بھی اسی بات کو نقل کیا ہے، چنانچہ کتاب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب جلد۳ ص۳۲ میں ابن عبد البر نے، الکامل فی التاریخ جلد۲ ص۵۷ میں ابن اثیر نے لکھا ہے کہ:

'' استنبئ النبی یوم الاثنین و صلی علی یوم الثلثاء ''

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوموار کے دن مبعوث برسالت ہوئے اور اس کے دوسرے دن یعنی منگل کے دن علی بن ابی طالب علیہ السلام نے آپؐ کے ساتھ مل کر نماز ادا کی۔

ج: ایمانِ مجسم خود اپنے بارے میں نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

''وَلَمْ یَجْمَعْ بَیْتٌ وَاحِدٌ یَوْمَئِذٍ فِی الإِسْلامِ غَیْرَ رَسُولِ اللهِ(صلی الله علیه و آله) وَخَدِیجَةَ وَأَنَا ثَالِثُهُمَا، أَرَی نُورَ الْوَحْیِ وَالرِّسَالَةِ، وَأَشُمُّ رِیحَ النُّبُوَّةِ.''

ان دنوں میں اسلام صرف اور صرف رسول خداؐ اور خدیجۃ الکبریٰ ہی کے گھر تک محدود تھا اور ان میں کا تیسرا شخص میں تھا، میں وحی اور رسالت کے نور کی چمک دیکھ رہا تھا اور نبوت کی عطر بیز سانسوں کو محسوس کر رہا تھا۔

د: ایک اور مقام پر آپ سابق الاسلام ہونے پر فخر محسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں، جیسا کہ نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۱ میں ہے:

''اَللّٰهُمَّ إِنِّی أَوَّلُ مَنْ أَنَابَ، وَسَمِعَ وَأَجَابَ، لَمْ یَسْبِقْنِی إِلَّا رَسُولُ اللهِ(صلی الله علیه و آله)بِالصَّلاَةِ.''

اے اللہ میں پہلا وہ شخص ہوں جس نے تیری بارگاہ کی طرف رجوع کیا ہے، تیرے رسولؐ کی باتوں کو سنا اور ان کی دعوت پر لبیک کہا ہے اور پیغمبر اسلامؐ کے سوا مجھ سے پہلے کسی نے نماز نہیں پڑھی۔

ھ: خود امیر المومنین علیہ السلام ہی فرماتے ہیں: جیسا کہ محمد بن جریر طبری کی کتاب تاریخ الامم والملوک جلد۲ ص۳۱۲ میں، کتاب کامل ابن اثیر جلد۲ ص۵۷ میں، المستدرک علی الصحیحین جلد۳ ص۱۱۲ میں ہے: آپؑ نے فرمایا:

''اَنَا عَبْدُ اللّٰهِ وَ أَخُو رَسُولِهِ وَ أَنَا الصِّدِّیْقُ الْاَکْبَرِ لَا یَقُوْلُهَا بَعْدِیْ اِلَّا کَاذِبٌ مُفْتَرِیٌّ، صَلَّیْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ قَبْلَ النَّاسِ بِسَبْعِ سِنِیْنَ''

میں خدا کا بندہ اور اس کے رسولؐ کا بھائی ہوں، میں ہی صدیق اکبر ہوں اور میرے بعد جو بھی ایسا دعویٰ کرے گا جھوٹا اور کذاب ہوگا، میں نے رسول خدا کے ساتھ مل کر دوسرے لوگوں سے سات سال پہلے نماز ادا کرنا شروع کر دی تھی۔

و: عُفیف بن قیس کندی کی شہادت:

کتاب شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد۱۳ص ۲۲۶، کتاب تاریخ الامم والملوک یعنی تاریخ طبری جلد۲ص۲۱۲، جبکہ ابن ابی الحدید اسی شرح نہج البلاغہ میں اس واقعہ کو عبداللہ بن مسعود سے نقل کرتے ہیں کہ: ''میں زمانہ جاہلیت میں عطر کا کاروبار کیا کرتا تھا، اپنے ایک تجارتی سفر میں مکہ گیا ہوا تھا اور ایک مرتبہ مکہ کے ایک بڑے تاجر عباس کا مہمان تھا، ایک دن مسجد الحرام میں عباس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، سورج اپنے عروج کو پہنچا ہوا تھا، اتنے میں ایک جوان کو دیکھا جو مسجد کے اندر داخل ہوا، اس کی صورت چاند کی مانند چمک رہی تھی، اس نے ایک مرتبہ آسمان کی طرف دیکھا پھر خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا شروع کر دی، تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک خوبصورت نوجوان آ کر اس کے دائیں جانب کھڑا ہو گیا، پھر پردے میں لپٹی ہوئی ایک خاتون آئی جوان کے پیچھے کھڑی ہو گئی اور تینوں لوگ نماز پڑھنے اور رکوع اور سجود میں مشغول ہو گئے''

بت پرستی کے اس مرکز میں، مَیں نے تین افراد کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو حیرت زدہ ہو گیا اور عباس کی طرف منہ کر کے پوچھا: ''یہ تو عظیم حادثہ ہے!'' اس نے بھی میرے جملے کو دہرایا اور کہا: ''آیا ان افراد کو پہچانتے ہو کہ کون ہیں؟'' میں نے کہا: ''نہیں تو!'' اس نے کہا: یہ جوان جو سب سے آگے کھڑا ہے میرا بھتیجا محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے، دوسرا نوجوان بھی میرا دوسرا بھتیجا علی بن ابی طالب (علیہ السلام) ہے اور وہ خاتون جو دیکھ رہے ہو، وہ میرے بھتیجے محمدؐ کی زوجہ ہیں اور محمدؐ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا یہ دین اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اس وقت روئے زمین پر ان تین لوگوں کے علاوہ کوئی بھی ان کے دین کا پیرو کار موجود نہیں ہے''۔

تو ناظرین! اس واقعہ سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے حضور رسالت مآبؐ کی دعوت اسلام کے آغاز میں حضرت خدیجہؑ کے علاوہ صرف علی بن ابی طالبؑ ہی تھے جنہوں نے آپؐ کی آواز پر لبیک کہی اور آپؐ کی تصدیق کی۔

ایمانِ مجسم، حامی اور جانشینِ رسالت

حضرت رسالت مآب ﷺ مبعوث برسالت ہونے کے تین سال بعد تک خاموشی کے ساتھ تبلیغِ رسالت فرماتے رہے صرف خصوصی طور پر ان لوگوں کو دعوتِ اسلام دیتے جن میں قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی اور وہ اسے قبول بھی کر لیتے تھے۔

تین سال کے بعد فرشتہ وحی نازل ہوا اور خداوند عالم کا فرمان آپؐ تک پہنچایا کہ آپؐ اپنی دعوت کا آغاز اپنے قریبی رشتہ داروں سے کریں، چنانچہ سورہ شعراء آیت ۲۱۴ تا ۲۱۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

''وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ. وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ. فَاِنْ عَصَوْکَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ''

اپنے قریبی رشتہ داروں کو عذابِ الٰہی سے متنبہ کیجئے اور اپنے شانوں کو ان مومنین کے لیے جھکا دیں جو آپ کی پیروی کرتے ہیں، ان کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آئیں، پس اگر وہ آپ کی مخالفت کریں تو آپؐ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے برے کاموں سے بیزار ہوں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ حضور گرامیؐ کو اپنی دعوت کا آغاز اپنے قریبی رشتہ داروں سے کرنے کا حکم مل رہا ہے؟ آخر کیوں؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی تحریک کا رہبر خواہ وہ الٰہی تحریک ہو یا بشری اور رہبر خواہ الٰہی ہو یا بشری جب تک اس کے قریبی عزیز اور رشتہ دار اس پر اظہارِ اعتماد نہیں کریں گے اور اس پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی پیروی نہیں کریں گے اس کا اثر ہرگز دوسروں پر واقع نہیں ہوگا اور وہ تحریک غیر موثر ہو کر ختم ہو جائے گی، کیونکہ قریبی عزیز اس کے تمام اسرار اور رازوں سے مطلع ہوتے ہیں، اس کی اچھائی اور برائی کو اچھی طرح جانتے ہیں، اس کے عادات واطوار کو سمجھتے ہیں اسی لیے ان کا اس تحریک پر ایمان لا کر اسے دل و جان سے قبول کرنا اس بات کا سبب ہوتا ہے کہ انجان لوگ بھی بہت جلد اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

اسی لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ بنی ہاشم کی ۴۵ (پینتالیس) بزرگ ہستیوں کے لیے دعوت کا اہتمام کیا جائے، دوپہر کا کھانا تیار کیا جائے جس میں گوشت اور دودھ کا بندوبست شامل ہو۔

جن لوگوں کو دعوت دی گئی تھی سب نے بروقت اپنی حاضری کو یقینی بنایا اور مقررہ وقت پر پہنچ گئے، سب کو کھانا کھلایا گیا اور جب سب لوگ کھانا کھا کر سیر ہو گئے تو پیغمبر خداؐ کے چچا ''ابولہب'' نے اپنی سبک سرانہ محفل کا رنگ ہی بدل دیا اور کسی نتیجہ کے بغیر محفل برخاست ہوگئی اور مہمان کھانا کھانے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، مگر حضورؐ نے فرمایا کہ کل پھر اس قسم کی دعوت کا بندوبست کیا جائے، ابولہب کے سوا دوسرے تمام لوگوں کو بلایا گیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے دعوت کا بندوبست کیا سب لوگ بروقت پہنچ گئے، کھانا کھا لینے کے بعد حضور سرورِ کائناتؐ نے اپنی گفتگو کو ان الفاظ کے ساتھ شروع کیا:

''اے بنی عبدالمطلب! آج تک کوئی شخص اپنی قوم کے لیے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں لایا جو میں تمہارے لیے لایا ہوں، میں

تمہارے لیے دنیا و آخرت کی خیر لے کر آیا ہوں، میرے اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں خدا کی وحدانیت اور اپنی رسالت کی طرف دعوت دوں، تم میں سے کون شخص ہے جو اس راہ میں میرا ہاتھ بٹائے وہ میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہو؟''

یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے تا کہ معلوم ہو جائے کہ کون مثبت جواب دیتا ہے؟ اس موقع پر مطلق سکوت کارفرما ہو گیا، سب لوگوں نے اپنے سر جھکا لیے تھے محفل پر سناٹا طاری تھا، ہر ایک سوچوں میں پڑا ہوا تھا، اتنے میں علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اس سکوت و جمود کو توڑا، اس وقت آپؑ کی عمر تقریباً تیرہ سال تھی، آپؑ کھڑے ہو گئے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منہ کر کے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسولؐ! اس راہ میں میں آپؐ کی امداد اور نصرت کے لیے حاضر ہوں!'' اس کے بعد اپنا ہاتھ پیغمبر خداؐ کی طرف بڑھایا تا کہ آپؐ کی بیعت کریں اور جاں نثاری اور فدا کاری کا آپ سے وعدہ کریں، مگر پیغمبر خداؐ نے فرمایا: ''علی! بیٹھ جاؤ!!'' حضور پاکؐ نے پھر ان لوگوں کی طرف منہ کر کے وہی الفاظ دہرائے، مگر کسی نے مثبت جواب نہ دیا، علیؑ پھر کھڑے ہوئے اور حسبِ سابق رسول گرامیؐ کی خدمت میں وہی عرض کیا جو پہلے کر چکے تھے، اب کے بھی رسول خداؐ نے انہیں بیٹھ جانے کا حکم دیا۔

تیسری مرتبہ حضور انورؐ نے اپنی سابقہ تقریر دہرائی اور ان سے مدد کے طالب ہوئے، مگر علی بن ابی طالبؑ کے علاوہ کسی نے بھی مثبت جواب نہ دیا، تو اس موقعہ پر سرکار رسالت مآبؐ نے اپنا ہاتھ علیؑ کے ہاتھ پر مارا اور بنی ہاشم کے سن رسیدہ لوگوں کے سامنے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

''اے میرے قریبی عزیز و اور نزدیک کے رشتہ دارو! اب کے بعد تمہارے درمیان یہ علیؑ ہی میرا بھائی، میرا وصی اور میرا خلیفہ

ہوگا!''

پیارے ناظرین! اس واقعہ کو تقریباً ہر مسلمان بلکہ غیر مسلم مورخین نے نقل کیا ہے، نمونہ کے طور پر ہم اپنے ناظرین کو ان کتابوں کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔

۱۔محمد بن جریر طبری کی کتاب تاریخ الامم والملوک مطبوعہ دارالقاموس الحدیث بیروت جلد۲ص ۲۱۷۔

۲۔ابن ابی الحدید کی کتاب شرح نہج البلاغہ، تحقیق ابوالفضل ابراہیم طبع اول مطبوعہ داراحیاء الکتب العربیہ قاہرہ جلد۱۳ص ۲۱۱۔

۳۔ابن اثیر کی کتاب الکامل فی التاریخ مطبوعہ بیروت دار صادر جلد۲ ص۶۳۔

تو اس طرح سے آغاز رسالت ہی میں آخری سفیر الٰہی کا سب سے پہلا وصی و وزیر اور خلیفہ متعین ہوگیا جبکہ اس وقت صرف معدودے چند افراد ہی اس الٰہی آئین کو اپنا چکے تھے۔

اس مقام پر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جس دن میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی نبوت و رسالت کا اعلان کیا، اسی دن اپنے قریبی ترین رشتہ داروں کے اجتماع میں بہ بانگ دہل اعلان فرمایا: ''علی میرا وصی اور میرا جانشین و خلیفہ ہے'' اس بات سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں امامت کا کیا مقام ہے اور یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ نبوت اور امامت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں اور امامت ہمیشہ نبوت و رسالت کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔

عظیم فداکاری

ابھی بعثت پیغمبرؐ کو تیرہ سال ہی گزرے تھے کہ پیمان عقبہ دوم کے انعقاد کے بعد ایک مرتبہ ۱۳ ذی الحجہ کی رات اہلِ یثرب کا ایک وفد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضور کو اپنے شہر تشریف لانے کی دعوت دی اور آپ کو بڑے پختہ قول و قرار کے ساتھ نصرت و حمایت کا یقین دلایا، چنانچہ رات کو یہ معاہدہ ہوا اور صبح ہوتے ہی مسلمانوں نے بالتدریج یثرب جانا شروع کر دیا۔

قریش کے سرداروں نے بھانپ لیا کہ دعوت اسلام کی نشرو اشاعت کے لیے یثرب میں ایک مرکز تشکیل پارہا ہے اسی لیے انہوں نے اس خطرے کا احساس بھی کرلیا کہ یہ جو ہم اب تک محمد مصطفیٰؐ اور ان کے ساتھیوں کو ستاتے اور ان کے ساتھیوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھاتے رہے کہیں وہ اس کا انتقام لینے پر نہ اتر آئیں اور اگر بالفرض وہ جنگ نہ بھی کریں یہ تو ہوسکتا ہے کہ وہ ہمارے شام کی طرف تجارتی قافلوں کے راستے کو بند کردیں جو یثرب سے گزرتا ہے۔

لہٰذا اس خطرے سے نمٹنے کے لیے انہوں نے ۱۴ بعثت کے صفر کی آخری تاریخ کو مکہ کی مجلس شوریٰ یعنی (دارالندوہ) میں اجلاس بلایا اور اس پر غور و خوض شروع کردیا، کسی نے مشورہ دیا کہ پیغمبرِ خدا کو جلاوطن کردیا جائے، کسی نے کہا کہ انہیں قید کردیا جائے، لیکن ان کی یہ رائے مسترد کردی گئی، آخر کار انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو قتل کردیا جائے۔

انہوں نے یہ فیصلہ کرتو لیا مگر آپ کا قتل کوئی آسان کام نہیں تھا، اس لیے کہ بنی ہاشم آپ کے قتل پر خاموش ہوکر نہ بیٹھ جاتے بلکہ اس خون کا انتقام لے کر رہتے، بالآخر انہوں نے یہ طے کیا کہ ہر قبیلے سے ایک ایک نوجوان لیا جائے اور وہ سب مل کر

رات کی تاریکی میں آنحضورؐ پر یکبارگی حملہ کر دیں اور بستر پر ہی آپ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔

ان کا منصوبہ یہ تھا چونکہ قاتل صرف ایک شخص نہیں ہوگا بلکہ ہر قبیلے سے ایک آدمی ہوگا لہٰذا بنی ہاشم کے بس سے باہر ہوگا کہ تمام قبائل کے ساتھ جنگ کر کے آپؐ کے خون کا بدلہ لیں، آخر کار وہ آپ کے خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں گے اور وہ ادا کر کے ہم ہمیشہ کے لیے مطمئن ہو جائیں گے اور قصہ ختم ہو جائے گا۔ انہوں نے اس منصوبے کی تکمیل کے لیے یکم ربیع الاول کی رات کا انتخاب کیا۔

خداوند عالم نے اس کے بعد حضورِ پاکؐ کو مشرکین کے ان تینوں منصوبوں سے مطلع کرتے ہوئے فرمایا:

’’وَاِذْ یَمْکُرُبِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ. وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰہُ. وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ‘‘

سورہ انفال آیت نمبر ۳۰ میں ہے: وہ وقت یاد کیجئے جب کفار آپ کے بارے میں یہ سازشیں کر رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا شہر بدر کر دیں، وہ سازشیں کر رہے تھے اور خدا نے بھی ایک تدبیر کی اور خداوند عالم بہترین چارہ ساز ہے۔

بہر حال قریش کے اس منصوبے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ وحی نے آپؐ کو اس سے آگاہ کر دیا اور خداوند عالم کا حکم پہنچایا کہ آپ مکہ سے یثرب کی جانب ہجرت کر جائیں۔

اب دشمن کے منصوبے کو خاک میں ملانے کے لیے ضروری تھا کہ حضور پاکؐ دشمن کو اپنی طرف سے غافل کرنے کے لیے اپنی طرف سے بے خبر کرنے والے

طریقہ کار سے استفادہ کرتے ہوئے شہر سے باہر چلے جائیں اور اس کام کے لیے ایک جاں نثار، فداکار، جانباز، نڈر، شجاع اور بے باک انسان کی ضرورت تھی جو رات کو آپ کے بستر پر سو جائے اور حضور شہر کو چھوڑ دیں اور دشمن کی ساری توجہ اس بات پر رہے کہ بستر پر سونے والا ’’محمد‘‘ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہے۔ وہ سمجھتے رہیں کہ آپؐ نے ابھی مکہ کو ترک نہیں فرمایا اور اسی بات کی طرف متوجہ رہیں اور شہر کی ناکہ بندی اور راستوں کی تلاش سے غافل اور بے خبر رہیں اور اس کام کے لیے سوائے علی بن ابی طالب علیہ السلام کے اور کوئی شخص موزوں اور لائق نہیں تھا، لہٰذا آپؐ کی نظر کا حسنِ انتخاب ایمانِ مجسم علیؑ ہی ٹھہرے۔

حضور انورؐ نے مشرکین مکہ کی سازشوں اور ان کے منصوبے سے علی علیہ السلام کو آگاہ فرمایا اور ساتھ ہی حکم دیا کہ ’’آج رات آپ میرے بستر پر سو جائیں اور اپنے اوپر وہی سبز چادر اوڑھ لیں جو حسبِ معمول میں اوڑھا کرتا ہوں، تاکہ دشمن یہ سمجھے کہ میں ہی بستر پر سویا ہوا ہوں اور وہ میرا پیچھا نہ کرے‘‘

سرورِ کائناتؐ کا فرمان سن کر ایمانِ مجسم بسترِ رسولؐ پر بڑے سکون کے ساتھ سو گئے، قریش کے گماشتوں نے رات کے آغاز کے ساتھ ہی پیغمبر اکرمؐ کے ’’بیت الشرف‘‘ کا محاصرہ کر لیا اور سحر گاہ گھر کے اندر داخل ہو گئے اور دیکھا تو بستر پر ایمانِ مجسم علی بن ابی طالب علیہ السلام سوئے ہوئے ہیں، آپؑ بستر سے اٹھے۔

کافر لوگ جو اس وقت تک اپنے منصوبے کو سو فیصد کامیاب ہوتا دیکھ رہے تھے، فرزند ابو طالبؑ کو دیکھ کر سخت حیران اور پریشان ہو گئے، جھلا کر آپ سے پوچھنے لگے: محمدؐ کہاں ہیں؟ آپؑ نے بڑے حوصلے اور سکون سے فرمایا: ’’کیا تم لوگ میرے سپرد کر گئے تھے کہ مجھ سے ان کا پوچھ رہے ہو؟ تم نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس سے تنگ آ کر گھر چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہوں گے؟‘‘

یہ جواب سن کر وہ اور بھی پریشان ہوگئے اور رسول پاکؐ کی تلاش میں مدینہ کی جانب چلے گئے، جبکہ اس وقت تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''غارِ ثور'' میں پنہاں ہو چکے تھے اور خداوند عالم نے ایمان مجسم کی اس قربانی، فدا کاری، جاں نثاری اور جان سپاری کو قرآن مجید میں ذکر کر کے تاریخ میں زندہ جاوید بنا دیا اور سورہ بقرہ کی آیت ۲۰۷ میں آپ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا:

''وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ.
وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ مبِالْعِبَادِ ''

کچھ مومن لوگ ایسے ہیں جو (مانند علی بن ابی طالبؑ) شبِ ہجرت پیغمبرؐ کے بستر پر سو کر اپنی جان کو خدا کی خوشنودی کے لیے بیچ ڈالتے ہیں اور خدا اپنے بندوں کے ساتھ بڑا مہربان ہے۔

اس حقیقت کو بہت سے مورخین اور محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے: مثلاً

۱۔ابن ہشام نے سیرۃ النبی جلد۲ص ۱۲۴ تا۱۲۸ میں
۲۔ابن اثیر نے تاریخ کامل جلد۲ص۱۰۲میں
۳۔محمد بن سعد نے طبقات کبریٰ جلد اص ۲۲۸ میں
۴۔شیخ مفید نے الارشاد ص۳۰ میں
۵۔حاکم نیشاپوری نے المستدرک علی الصحیحین جلد۳ص۲ میں
۶۔ابن جریر طبری نے تاریخ الامم والملوک جلد۲ص ۴۴ میں

مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی جان نثاری اور فدا کاری کے بارے میں ''شب ہجرت'' نازل ہوئی، جیسا کہ ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ جلد۳ص ۲۶۲ میں، محمد حسن مظفر دلائل الصدق جلد۲ص ۸۰ میں اور انہوں نے

اسی کتاب میں مکتب خلفاء کے مفسرین ومحدثین مثلاً ثعلبی، قندوزی اور حاکم وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ ان سب کا اتفاق ہے کہ یہ آیت علی بن ابی طالبؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

شیخ صدوقؒ محمد بن علی بن بابویہ خصال صدوق جلد۲ص ۵۶۰ میں اور شیخ طبرسیؒ احتجاج طبرسی جلد اص ۵۷ میں لکھتے ہیں کہ خود حضرت علی علیہ السلام نے بھی اسی آیت کے ذریعے اس چھ نفری شوریٰ کے اجتماع میں احتجاج کیا تھا جسے انتخاب کے لیے خلیفہ دوم نے مقرر کیا تھا، امام علی علیہ السلام نے اپنی اس عظیم فضیلت کا اقرار موقعہ پر موجود افراد سے لیا تھا، جبکہ آپؑ نے فرمایا: میں تمہیں خدا کی قسم دے کر تم سے پوچھتا ہوں آیا میرے علاوہ کوئی تھا جو اس پر خطر رات میں جان کو ہتھیلی پر رکھ کر پیغمبرؐ کے بستر پر سو گیا تھا جب حضورؐ غارِ ثور میں پناہ لے چکے تھے؟ تو سب نے کہا: ''آپؑ کے سوا اور کوئی نہیں تھا''

۳۔حضورؐ کی ہجرت سے رحلت تک

برادرِ رسولؐ:

اسلامی برادری اور بھائی چارے کا تعلق دینِ اسلام کے اجتماعی اور معاشرتی اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے، سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس تعلق کو وجود میں لانے اور مستحکم بنانے میں مختلف اور گوناگوں صورتوں میں کوششیں کیں۔ ان میں سے ایک کوشش اس وقت دیکھنے میں آتی ہے جب آپ مکہ سے ہجرت فرمائے مدینہ ہوئے، تو اس وقت آپؐ نے مہاجرین اور انصار میں عقد اخوت یا بھائی چارہ قائم کیا، ایک مرتبہ آپ نے تمام مسلمانوں کو اکٹھا کیا اور فرمایا: ''تاخوا فی

الله اخوین اخوین ''اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے دو، دو ہو کر ایک دوسرے کے بھائی بن جاؤ۔

آپ کا یہ فرمان سن کر مہاجرین وانصار نے آگے بڑھ کر ایک دوسرے کو گلے لگایا اور ایک ایک انصاری ایک ایک مہاجر کا بھائی بن گیا۔ اس طرح سے ان کے درمیان وحدت اور ہم آہنگی و ہم بستگی مزید پختہ ہوگئی۔ البتہ اس نوع کی برادری میں افراد کی باہمی مناسبت کو پیشِ نظر ضرور رکھا گیا ہے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس کی شخصیت کیسی ہے؟ اس کا ایمانی مرتبہ کیسا ہے؟ اس کی اسلام کے لیے خدمات کیسی ہیں؟ وغیرہ

ان سب حضرات میں تو باہمی برادری عمل میں آ گئی مگر علی بن ابی طالبؑ تنہا رہ گئے تھے کہ جن کا کوئی بھائی نہ بن سکا، اس سے آپ سخت پریشان ہوگئے حتیٰ کہ آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا:

''آپ نے مجھے کسی کا بھائی نہ بنایا؟'' تو حاکم نیشاپوری صاحبِ مستدرک علی الصحیحین جلد۳ ص۱۴ اور ابن عبدالبر صاحبِ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب جلد۳ ص۳۵ کے مطابق حضور پاکؐ نے فرمایا: یا علیؑ! آپؑ تو دونوں جہانوں میں میرے بھائی ہیں، یہ کہہ کر آپؐ نے علی علیہ السلام کو گلے لگا لیا۔

اس موضوع سے ایمانِ مجسم امامِ معظم حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی عظمت اور فضیلت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کس قدر نزدیک تھے؟

ایمانِ مجسم اور پیغمبرؐ سے نسبت

ہجرت سے لے کر سرکارِ رسالت مآبؐ کی رحلت تک ایمانِ مجسم، امامِ معظم

حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی زندگی حضرت پیغمبر ختمی مرتبتؐ کی ذات کے لیے ایثار اور قربانیوں سے لبریز نظر آتی ہے اور وہ بھی جنگ کے میدانوں اور کارزار کے معرکوں میں، کیونکہ حضور رسالت مآبؐ کو مدینہ میں ہجرت کے بعد ستائیس غزوات کا سامنا کرنا پڑا، سوائے ایک غزوہ تبوک کے باقی تمام چھبیس جنگوں میں علی علیہ السلام آپؐ کے ساتھ شریک معرکہ کارزار رہے اور جنگ تبوک میں آپ کے شریک نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ مدینہ کے حالات خطرناک حد تک بحرانی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ادھر قیصر روم کی مدینہ پر حملہ کرنے کی خبریں بھی گشت کر رہی تھیں اور مسلمان صبر آزما حالات میں جی چھوڑ بیٹھے تھے اور جنگ سے بچنے کے لیے حیلے بہانے کرنے لگے، قرآن مجید نے تہدیدی آیتوں کے ذریعے مسلمانوں پر دباؤ ڈالا جس کی وجہ سے انہیں قدم بڑھائے بغیر کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ کوئی خوش ہو کر اور کوئی مارے باندھے اس مہم پر جانے کے لیے تیار ہوگئے اور کچھ جھوٹی سچی باتیں بنا کر گھروں میں چھپ گئے۔ تاریخ طبری جلد۲ ص۳۶۸ میں ہے کہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کے چلے جانے کے بعد شہر میں رہ جانے والے منافقین جو عبداللہ بن ابی کی سرکردگی میں اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا کرتے تھے، جب وہ اور تو کوئی بات نہ بنا سکے تو یہ کہنے لگے: ''پیغمبرؐ انہیں بارِ خاطر سمجھتے ہوئے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے یہاں چھوڑ گئے''

حضرت علیؑ اس غزوہ میں اپنی عدمِ شمولیت محسوس کر رہے تھے۔ جب منافقین کی یہ طنزیہ باتیں سنیں تو ان سے رہا نہ گیا اور فوراً ہتھیار سجائے اور لشکر کے عقب میں چلے گئے اور مدینہ سے کچھ فاصلے پر پیغمبر خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے پوچھا: علیؑ کیسے آئے؟ عرض کیا: یا رسول اللہؐ! یہ منافقین کہتے ہیں کہ آپؐ مجھے بارِ خاطر سمجھتے ہوئے پیچھے چھوڑ گئے ہیں، فرمایا: وہ جھوٹ کہتے ہیں وہ اس سے

پہلے بھی مجھ پر جھوٹ باندھتے رہے ہیں، میں تمہیں مدینہ میں اس لیے چھوڑے جاتا ہوں کیونکہ اس کا نظم وضبط میرے یا تمہارے بغیر برقرار نہیں رہ سکتا اور تم میرے اہلِ بیت اور میری امت میں میرے جانشین اور قائم مقام ہو، چنانچہ صحیح بخاری جلد۳ ص۵۴ میں ہے: ''اما ترضیٰ ان تکون منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی'' کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

چنانچہ ایمان مجسم یہ نوید سن کر خوشی خوشی مدینہ واپس تشریف لے آئے اور رسول خدا ﷺ اسلام کے لشکر کو لے کر شام کی جانب جنگ کے لیے روانہ ہو گئے۔

ایمانِ مجسم اور میدانِ جنگ

ناظرین! جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ حضور سرورِ کائنات ﷺ کی مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد آپؐ کو کفار ومشرکین کے ساتھ ستائیس غزوات کا سامنا کرنا پڑا اور سوائے غزوہ تبوک کے ایمان مجسم علی بن ابی طالب علیہ السلام تمام غزوات میں حضور ﷺ کے ہم رکاب رہے اور غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنے کی وجہ بھی بتائی جا چکی ہے۔

اس مقام پر ہم اپنے ناظرین کو یہ بتانا چاہیں گے کہ سیرت نگاروں کی اصطلاح میں ''غزوہ'' اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بنفس نفیس خود تشریف لے گئے ہوں اور بذاتِ خود اس کی کمان سنبھالی ہو، لہٰذا ان جنگوں کی تعداد ستائیس ہے۔

جبکہ اس کے علاوہ جو دوسری جنگیں لشکر اسلام نے لڑی ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں اور انہیں ''سریہ'' کہا جاتا ہے اور ان میں بھی علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شرکت تھی۔

ہمارے لیے ان تمام غزوات اور سرایا کے بارے میں تفصیلی گفتگو کرنا مشکل ہے لہٰذا نمونے کے طور پر پیغمبر اعظمؐ کے چار عظیم غزوات کے بارے میں کچھ عرض کریں گے جن میں ایمان مجسم علی بن ابی طالب علیہ السلام نے پوری جرأت ایمانی کے ساتھ اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے اور ان میں ایک جنگِ بدر ہے، جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

جنگِ بدر

مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان یہ پہلی جنگ ہے اور یہ فریقین کے درمیان پہلی عسکری آزمائش تھی اس لیے کہ قریش مسلمانانِ مکہ کے درپئے آزار تو تھے ہی، ہجرت کے بعد انصار مدینہ بھی ان کے زیرِ عتاب آ گئے۔ ان لوگوں نے انصارِ مدینہ پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے حضرت رسالت مآب ﷺ کو اپنے ہاں نہ صرف پناہ دے کر ان کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے بلکہ ان کی روزافزوں ترقی کا سامان بھی کر دیا ہے۔

قریش جس دین کو اپنے ہاں پھلتا پھولتا نہ دیکھ سکتے تھے وہ کب گوارا کر سکتے تھے کہ اسے کہیں اور ترقی، عروج اور فروغ حاصل ہو اور مسلمان ان کی قاہرانہ گرفت سے نکل کر آزادانہ سانس لے سکیں۔

انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے معاشرے اور روایتی آداب ورسوم کے تحفظ کے لیے اس نئے دین کو پنپنے نہ دیں گے اور مسلمانوں کے خلاف اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا نہ دیں یا اسلام سے دستبردار ہونے پر مجبور نہ کر دیں۔

یہود مدینہ نے اگرچہ پیغمبر اکرمؐ کی آمد پر ان سے معاہدہ کر لیا تھا کہ اگر

مدینہ پر حملہ ہوا تو دشمن کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں گے، مگر پیغمبر خداؐ کی بڑھتی ہوئی قوت وطاقت کو دیکھ کر انہیں خود اپنا اقتدار خطرے میں نظر آیا تو انہوں نے قریش سے رابطہ قائم کرلیا اور قریش نے بھی ان سے گٹھ جوڑ کر کے ایک مشترکہ محاذ تشکیل دے دیا اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کردیں، ان حالات میں ضرورت تھی کہ ان کی نقل وحرکت پر نظر رکھی جائے تاکہ بروقت ان کی فتنہ انگیزیوں کا تدارک کیا جا سکے۔ اسی اثنا میں ابوسفیان تجارتی قافلہ لے کر شام گیا ہوا تھا اور اسے واپسی پر مدینہ کی سمت سے گزرنا تھا، کیونکہ مدینہ قریش کے قافلوں کی گزرگاہ تھا، ادھر اہلِ مکہ اس کی واپسی کے منتظر تھے کہ ابوسفیان نے شام سے پلٹتے ہوئے اہلِ مکہ کو ضمضم بن عمرو غفاری کے ذریعے یہ غلط اور شرانگیز پیغام بھیجا کہ مسلمان دھاوا بول کر مالِ تجارت لوٹنا چاہتے ہیں، لہٰذا تم جنگی ہتھیاروں کے ساتھ نکل کھڑے ہو، وہ تو پہلے ہی جنگ کے لیے آمادہ تھے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

ادھر ابوسفیان نے عام راستہ چھوڑ کر بحیرۂ احمر کے ساحل کا راستہ اختیار کیا اور جدہ سے ہوکر مکہ پہنچ گیا، ادھر جب قریش کا لشکر ''بدر'' کے قریب پہنچا تو اسے قافلہ کے صحیح وسالم پہنچنے کی اطلاع ملی۔ بنی زہرہ کے چند آدمیوں نے کہا کہ قافلہ تو خیر وخیریت کے ساتھ پہنچ گیا ہے، اب جنگ کی ضرورت نہیں ہے، مگر ابوجہل جنگ سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا اور اپنی ضد پر اڑا رہا۔

مدینہ میں یہ خبر تو عام ہوچکی تھی کہ ابوسفیان کا قافلہ باربردار اونٹوں پر سامانِ تجارت لادکر اِدھر سے گزرے گا، مگر اس کے ساتھ یہ خبریں بھی پہنچ رہی تھی کہ لشکرِ قریش پورے جنگی سازوسامان کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہا ہے۔

مسلمان کم تعداد اور بے سروسامانی کی حالت میں تھے اور قریش کی مسلح و منظّم فوج سے دوبدو ہوکر لڑنے سے بچنا چاہتے تھے، اسی لیے ان کی نگاہیں بار بار

ابوسفیان کے کاروان کی طرف اٹھتی تھیں کہ اس سے مڈبھیڑ ہوجائے تو بہتر ہے، کیونکہ ایک تو گنتی کے چند آدمیوں کا مقابلہ دشوار نہ ہوگا اور دوسرے مال فراوان بھی ہاتھ لگے گا، قرآن مجید اس کی شہادت سورہ انفال آیت ۷ میں یوں دیتا ہے:

''وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ''

جب اللہ نے تمہیں اطلاع دی کہ کفارِ مکہ کے دو گروہوں میں سے ایک سے تمہارا سامنا ہوگا اور تم لوگ یہ چاہتے تھے کہ جو قوت وطاقت نہیں رکھتا وہ تمہارے حصے میں آئے۔

ایک اور مقام پر واقعاتِ بدر کے سلسلے میں سورہ انفال آیت ۵ اور ۶ میں ارشاد ہورہا ہے:

''کَمَآ اَخْرَجَکَ رَبُّکَ مِنْ م بَیْتِکَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِھُوْنَ''

جس طرح تمہارے پروردگار نے تمہیں حق کے ساتھ گھر سے باہر بھیجا اسی حالت میں مسلمانوں کا ایک گروہ جنگ سے ناگواری محسوس کررہا تھا۔

''یُجَادِلُوْنَکَ فِی الْحَقِّ بَعْدَمَاتَبَیَّنَ کَاَنَّمَایُسَاقُوْنَ اِلَی الْمَوْتِ وَھُمْ یَنْظُرُوْنَ''

حق کے ظاہر ہونے کے بارے میں تم سے جھگڑ رہا تھا، گویا ان کی آنکھوں کے سامنے انہیں موت کی طرف دھکیلا جارہا ہے۔

تو قرآن مجید کے اس بیان کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کاروان کے تعاقب میں نہیں نکلے تھے بلکہ قریش کی پیش قدمی کو

روکنے کے لیے صف آرا ہوئے تھے۔

یہ کفر و اسلام کے درمیان رونما ہونے والا پہلا معرکہ تھا، مسلمان اسلحہ جنگ کے لحاظ سے کمزور اور کفار کی متوقع تعداد کے مقابلے میں کم تھے، اسی لیے آپؐ نے ضروری خیال کیا کہ انصار و مہاجرین کا عندیہ معلوم کریں کہ وہ کس طرح عزم و ثبات کے ساتھ دشمن کا دفاع کر سکتے ہیں، چنانچہ آپؐ کے استفسار پر لوگوں نے مختلف جوابات دیئے، حضرت مقداد بن اسود اور سعد بن معاذ انصاری کے مشورے پسند فرمائے اور آپ اس سے بہت خوش ہوئے۔ تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۴۰ میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

''وَاللّٰہِ لَکَاَنِّی اَنْظُرُ مَصَارِعَ الْقَوْمِ''

خدا کی قسم! اب میں دشمن کے گر کر مرنے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

اس کے بعد آپؐ تین سو تیرہ آدمیوں کی مختصر جمعیت کے ساتھ جن میں ستتر (۷۷) مہاجر اور باقی انصار تھے مدینہ سے روانہ ہو گئے اور چاہ ''بدر'' سے کچھ فاصلے پر پڑاؤ ڈال دیا اور حضرت علیؑ کی سربراہی میں سعد بن ابی وقاص اور زبیر بن عوام کو دشمن کا ٹھکانہ معلوم کرنے کے لیے روانہ کیا۔ چنانچہ تینوں حضرات چاہ بدر تک پہنچ گئے، وہاں پر چند آدمیوں کو دیکھا جو انہیں دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے، حضرت علیؑ نے تعاقب کر کے ان میں سے دو غلاموں کو پکڑ لیا اور انہیں اپنے ساتھ لے آئے، پوچھ گچھ پر معلوم ہوا کہ قریش کے سقے ہیں جو پانی کے لیے یہاں آئے تھے، انہوں نے ابوسفیان کے قافلے سے تو لاعلمی کا اظہار کیا اور بتایا کہ قریش کا لشکر یہاں سے تین میل کے فاصلے پر موجود ہے۔ ان کی تعداد سے تو لاعلمی ظاہر کی البتہ خوراک و غذا کے نو، دس اونٹوں کے نحر کیے جانے کا بتایا جس سے حضورؐ پاک نے

انداز لگا لیا نو سو سے ایک ہزار تک ہو سکتی ہے۔ جب ان سے قریش کے نمایاں اور سرکردہ افراد کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے چند صنادید یعنی سردارانِ قریش کے نام لیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مکہ نے تو اپنے جگر پاروں کو میدانِ جنگ میں انڈیل دیا ہے'' قریش کی آمد کی خبر سن کر لشکرِ اسلام نے حرکت کی اور چاہِ بدر کی جانب چل پڑا۔

''بدر'' ایک کنویں کا نام تھا جو قبیلہ ''غفار'' کے بدر نامی ایک شخص کی ملکیت تھا۔ چونکہ یہ جنگ اسی کنویں کے قریب ہوئی اسی لیے اس غزوہ کا نام ''غزوہ بدر'' ہوا، جو ہجرت نبوی کے انیس ماہ بعد ۱۷ رمضان المبارک بروز جمعہ وقوع پذیر ہوا۔

لشکرِ قریش نے وادی بدر کے آخری کنارے ریت کے ایک ٹیلے کے پاس پڑاؤ ڈالا ہوا تھا، ان کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی، سات سو اونٹ اور تین سو گھوڑے ان کے ساتھ تھے اور نیزوں، تلواروں اور ہتھیاروں کی کوئی کمی نہ تھی، اس کے برعکس مسلمان تعداد میں کم اور سامان جنگ کے لحاظ سے انتہائی کمزور تھے، ان کے پاس صرف تین گھوڑے، ستر اونٹ، چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں۔ سوار ہونے کی صورت یہ تھی کہ ایک ایک اونٹ دو دو یا تین تین آدمیوں میں مشترک تھا، جس پر ہر ایک باری باری سوار ہوتا تھا اور یہاں بھی ایمان مجسم حضرت علی بن ابی طالبؑ کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آپؑ پیغمبر خداؐ کے شریک تھے۔

غرض دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے، حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فوج کی صفیں اور میمنہ و میسرہ ترتیب دے کر انصار کا علم سعد بن عبادہ کو اور مہاجرین کا رایت علی بن ابی طالبؑ کو دیا، علامہ ابن کثیر کتاب البدایۃ والنہایۃ جلد ۷ ص ۲۲۳ میں لکھتے ہیں کہ:

''دَفَعَ النَّبِیُّ الرَّاٰیَةَ یَوْمَ بَدْرٍ اِلٰی عَلِیٍّ وَھُوَ ابْنُ عِشْرِیْنَ

سَنَة''

رسول اکرمؐ نے بدر کے دن عَلَم جنگ علیؑ کو دیا اس وقت آپؑ
کی عمر بیس برس کی تھی۔

ادھر دشمن بھی صفیں باندھے، ہتھیار سنبھالے میدان میں اتر آیا اور عتبہ بن ربیعہ، اس کا بھائی شیبہ اور بیٹا ولید قریش کی صفوں سے نکل کر مبارز طلب ہوئے، مسلمانوں کے لشکر سے عوف بن حارث، معوذ بن حارث اور عبداللہ بن رواحہ مقابلے کے لیے نکلے۔ عتبہ نے پوچھا تم کون ہو؟ کہا کہ: ''ہم انصار مدینہ ہیں!'' عتبہ کی پیشانی پر بل آگئے اور کہا: ''تم ہمارے ہم رتبہ نہیں واپس چلے جاؤ'' اور کہا:

''یَا مُحَمَّدؐ! اَخْرِجْ اِلَیْنَا کِفَائَنَا مِنْ قَوْمِنَا''

اے محمدؐ ہمارے مقابلے میں ہمارے ہم رتبہ لوگوں کو بھیجئے جو
ہماری قوم سے ہوں۔

یہ تینوں اپنی صفوں میں واپس آگئے، سرکار رسالت مآبؐ نے جب قریش کی مغرورانہ ذہنیت دیکھی کہ وہ انصار کو اپنا حریف اور مدمقابل نہیں سمجھتے تو ان کی جگہ عبیدہ بن حارث، حمزہ بن عبدالمطلب اور علی بن ابی طالبؑ کو بھیجا۔

مقامِ غور ہے، عتبہ کا مطالبہ تو یہ تھا کہ ان کے مقابلے میں قریش آئیں مگر جناب رسالت مآبؐ نے نہ صرف قریش بلکہ عبدالمطلب کے جگر پاروں کو بھیجا، تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ پیغمبر خداؐ نے اپنی قریبی عزیزوں کو روکے رکھا اور دوسروں کو جنگ کے شعلوں میں جھونک دیا، حالانکہ عبیدہ بن حارث ستر سال کے بوڑھے تھے اور ایمان مجسم حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام بیس سال کے نوخیز جوان تھے اور پہلی مرتبہ ایک نبرد آزما کی حیثیت سے میدان میں اترے تھے۔

غرض جب عتبہ کو معلوم ہوا کہ علیؑ، حمزہؓ اور عبیدہ لڑنے کے لیے آئے ہیں تو

کہا: ''یہ برابر کا جوڑ ہے'' اب حضرت عبیدہ، عتبہ سے، حضرت حمزہ شیبہ سے اور حضرت علیؑ ولید سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے آگے بڑھے، ولید نے تلوار سونت کر حضرت علیؑ پر حملہ کرنا چاہا مگر انہوں نے ایک تیر مار کر اُسے بے بس کر دیا اور اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ حملہ کر سکے، تیر کھا کر اپنے باپ عتبہ کے دامن میں پناہ لینے کے لیے دوڑا مگر فرزند ابوطالبؑ نے اس طرح گھیرا ڈالا کہ جان توڑ کوشش کے باوجود تلوار کی زد سے نہ بچ سکا اور باپ کی گود میں پہنچنے سے پہلے موت کی آغوش میں سو گیا۔

جب امیر المومنینؑ ولید کے قتل سے فارغ ہوئے تو مسلمانوں نے پکار کر کہا: یا علیؑ! شیبہ آپؑ کے چچا حمزہ پر چھایا جا رہا ہے، حضرت نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہیں، تلواریں کند ہو چکی ہیں اور ڈھال کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں، آپؑ نے بڑھ کر شیبہ پر وار کیا اور تلوار سے اس کا سر اڑا ڈالا، اب حضرت علیؑ اور جناب حمزہؓ عتبہ کی طرف بڑھے جو جناب عبیدہ سے نبرد آزما تھا، دیکھا کہ عبیدہ، عتبہ کے ہاتھ سے تاب مقاومت کھو چکے ہیں اور قریب تھا کہ عتبہ تلوار لے کر جھپٹے اور انہیں شہید کر دے کہ علیؑ اور حمزہؓ کی تلواریں چمکیں اور اس کا لاشہ خاک و خون میں تڑپتا نظر آنے لگا، حضرت عبیدہ شدید زخمی ہو چکے تھے، اُنہیں وہ اٹھا کر پیغمبرؐ کے پاس لے آئے، پیغمبرؐ نے جب ان کی حالت دیکھی تو آنکھوں میں آنسو آگئے، جو عبیدہ کے چہرے پر گرے، انہوں نے آنکھیں کھول کر حضورؐ کی طرف دیکھا اور کہا: یارسول اللہؐ! کیا میں شہیدوں میں محسوب ہوں گا؟ فرمایا کہ آپ بھی شہیدوں میں شمار ہوں گے، عبیدہ نے کہا: کاش! ابوطالبؑ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ہم نے ان کی بات کو جھوٹا نہیں ہونے دیا۔

بہرحال قریش کے ان مانے ہوئے سورماؤں کے قتل سے کفار پر خوف و ہراس طاری ہو گیا، ابوجہل نے ان کی ہمت کو پست ہوتے دیکھا تو چیخ چیخ کر انہیں

ابھارا اور دم دلاسے دے کر ان کی ہمت بندھائی۔ طعیمہ بن عدی کو جوش آیا اور وہ مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا نکلا، حضرت علیؑ نے اس پر نیزہ مارا جس سے وہ سنبھل نہ سکا لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور واصل جہنم ہوا۔ طعیمہ کے بعد عاص بن سعید ہتھیار سجا کر میدان میں آیا، حضرت علیؑ نے اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا، پھر عبداللہ بن منذر اور حرملہ بن عمر گرجتے دندناتے ہوئے نکلے، وہ دونوں بھی علیؑ کی تلوار سے لقمہ اجل بنے، اسی طرح حنظلہ پیچ وتاب کھاتا ہوا نکلا، حضرتؑ نے اس کے سر پر تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ اس کا سر دو ٹکڑے ہوگیا، آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر آگئیں اور وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔

ناظرین! یاد رہے کہ حنظلہ ابوسفیان کا بیٹا اور معاویہ کا بھائی تھا، جبکہ اس سے پہلے معاویہ کا نانا عتبہ اور ماموں ولید حضرت کے ہاتھوں سے جہنم رسید ہو چکے تھے، چنانچہ جب حضرت علی علیہ السلام کے دورِ خلافت میں معاویہ نے انہیں جنگ کی دعوت دھمکی دے کر مرعوب کرنا چاہا تو آپ نے اس کے نانا، ماموں اور بھائی کا انجام یاد دلاتے ہوئے تحریر فرمایا، جو کہ نہج البلاغہ میں موجود ہے:

''فانا ابوالحسن قاتل جدک، و خالک و اخیک شدخا یوم بدر''

میں کوئی اور نہیں ہوں وہی ابوالحسن ہوں، جس نے تمہارے نانا عتبہ، تمہارے ماموں ولید اور تمہارے بھائی حنظلہ کے پرخچے اڑا دیئے تھے، بدر کے دن۔

غرض کفار کی نامی گرامی شخصیتوں کے قتل ہوجانے سے دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی اور اب وہ میدان سے جی چرانے لگے تھے، لیکن پھر جنگ مغلوبہ کے لیے بڑھنا شروع کر دیا، مسلمانوں نے ان کی بڑھتی ہوئی یلغار کو دیکھ کر آگے کی طرف

قدم بڑھانا چاہا مگر پیغمبر گرامی قدرؐ نے انہیں حکم دیا کہ اپنی صفیں درہم برہم نہ کریں اور قریش کے حملے کو تیروں سے روکیں، ساتھ ہی خود بھی بارگاہِ احدیت میں دست بدعا ہوکر عرض کیا:

''بارالٰہا! اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو روئے زمین پر تیری پرستش کرنے والا کوئی نہیں رہے گا، پروردگارا! اپنے وعدہ نصرت کو پورا فرما''

پھر نیند کی ایک جھپکی لی اور آنکھیں کھول کر فرمایا:

''خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری دعا قبول فرمائی اور ہماری امداد کے لیے فرشتے بھیج دیئے''

چنانچہ سورہ انفال آیت ۹ میں ارشادِ رب العزت ہے:

''اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ''

جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، اس نے تمہاری دعا قبول کی اور جواب دیا کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے جو پے در پے آئیں گے تمہاری مدد کروں گا۔

جب قریش کے تیروں کے جواب میں تیر برساتے ہوئے لشکرِ اسلام کے قریب آئے تو حضور رسالت مآبؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ ایک دم حملہ کر کے دشمن پر ٹوٹ پڑیں، چنانچہ ایک ساتھ تلواریں بے نیام ہوئیں، کمانیں کڑکیں، تیر راہی ہوئے اور ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ تلواروں کی جھنکار اور تیروں کی بوچھاڑ سے میدان گونج اٹھا، مسلمان بڑی بے جگری سے لڑے اور آگے بڑھتے رہے، آخر میں حضرت علیؑ اور جناب حمزہؓ کے پُرزور حملوں سے کافروں کے قدم ڈگمگا گئے اور اس طرح تتر بتر ہوئے

جس طرح شیر کے حملہ آور ہونے سے بھیڑیں تتر بتر ہو جاتی ہیں، کنزالعمال ج ۵ ص ۲۷۰ میں ہے سعد کہتے ہیں:

"میں نے بدر کے دن علیؑ کو لڑتے دیکھا کہ ان کے سینے سے
پُر جوش آوازیں آ رہی تھیں اور وہ برابر رجز پڑھتے جاتے تھے اور
جب پلٹتے تو ان کی تلوار سے خون ٹپک رہا تھا"

اس معرکہ کارزار میں نوفل بن خویلد جو پیغمبر اسلامؐ کا انتہائی سخت دشمن تھا، حضرت علیؑ کے سامنے سے گزرا، آپؑ نے اس کے سر پر تلوار سے ایسا وار کیا کہ اس کے خود کو کاٹتی اور سر کو توڑتی ہوئی جبڑے تک اُتر آئی، پھر دوسرا وار اس کی ٹانگوں پر کیا جس سے اس کے دونوں پیر کٹ گئے، رسول پاکؐ نے اس دشمن دین کے قتل پر خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری دعا کو شرفِ قبولیت بخشا۔

جنگ اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی، کفار کا زور ٹوٹ چکا تھا، ابوجہل، اس کا بھائی عاص بن ہشام اور کئی دوسرے سردار تہہ تیغ ہو چکے تھے، دشمن شکست کی آخری منزل کو پہنچ گیا۔ زوال آفتاب کے بعد اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنا مال واسباب چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

تاریخ کامل بن اثیر جلد ۲ ص ۹۰ میں ہے:

ستر کفار کے لاشے میدان میں بکھرے پڑے تھے، حضور پاکؐ نے ان لاشوں کو چاہِ بدر میں پھینکوا دیا اور انہیں مخاطب کر کے فرمایا: میں نے اپنے رب کے وعدے کو سچا پایا ہے کیا تم نے بھی اپنے رب کے وعدے کو سچا پایا ہے؟ کچھ لوگوں نے کہا: یا رسول اللہؐ! آپؐ مُردوں سے باتیں کر رہے ہیں، کیا مردے بھی سنا کرتے ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا: وہ تم سے زیادہ میری باتیں سنتے ہیں مگر جواب دینے سے عاجز ہیں۔

اس غزوہ میں جو اسلام کا پہلا غزوہ تھا، کفار کو بری طرح زک اٹھانا پڑی، ان کے ستر آدمی قتل اور ستر (۷۰) اسیر ہوئے اور باقی ماندہ افراد نے اپنی جان بچانے کے لیے راہِ فرار اختیار کی، مسلمانوں میں سے صرف چودہ آدمی شہید ہوئے جن میں چھ مہاجر اور آٹھ انصار تھے، ایمان مجسم علی بن ابی طالب علیہ السلام کی تلوار سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۳۵ (پینتیس) تھی یعنی جتنی تعداد کل مسلم مجاہدین کے ہاتھوں ہلاک ہوئی اتنی ہی تعداد، تنہا حضرت علیؑ کے ہاتھوں ماری گئی، خصوصاً سردارانِ قریش شیبہ، ولید، حنظلہ، نوفل بن خویلد، عاص بن سعید اور مغیرہ بن ولید وغیرہ، بلاشبہ تمام اسلامی فتوحات اس فتح وکامرانی کا نتیجہ ہیں اور یہ جو حق وصداقت عدل وانصاف اور عزم وعمل کی فتح تھی، جو ایمان مجسم، امام معظم، ولی اللہ الاعظم حضرت علیؑ کے دست و بازو کی رہین منت ہے اور انہی کے سر اس کامیابی وکامرانی کا سہرا ہے۔

غزوہ اُحد

۱۵ شوال ۳ھ بروز ہفتہ

اس جنگ کا سبب بالاتفاق مشرکین کا جذبہ انتقام تھا، اس لیے کہ جنگ بدر کی شکست کے بعد قریش کا جذبہ انتقام بھڑک اٹھا، انہوں نے نہایت وسیع پیمانے پر فوجی تیاریاں شروع کر دیں تا کہ انتقام لے کر شکست کا دھبہ اپنے دامن سے دھونے میں کامیاب ہوں۔ مکہ میں چندے کی فہرستیں کھولی گئیں، تقریروں سے عوام میں جوش پھیلایا گیا، لات وعزیٰ کی قسمیں دے کر ان کے ناموس بچانے کے لیے کہا گیا، مشہور شاعر ابوعزہ نے اپنے کلام کے ذریعہ لوگوں کو آمادہ کیا کہ قریش کی امداد کریں۔

انتقام کا سب سے زیادہ جوش ابوسفیان کو تھا، ایک تو اس لیے کہ جنگِ بدر کا بانی مبانی وہی شخص تھا، لہٰذا تمام لوگ اپنے جانی ومالی نقصان کا اسے ہی ذمہ دار سمجھتے تھے، پھر یہ

کہ خود اس کا بیٹا حنظلہ اس جنگ میں مارا گیا تھا اور اس سے زیادہ جذبہ انتقام اس کی بیوی ''ہندہ'' کو تھا جسے اپنے بیٹے حنظلہ کے علاوہ اپنے باپ عتبہ، چچا شیبہ اور بھائی ولید، ان تینوں کا داغ بھی اٹھانا پڑا تھا، لہٰذا اگر ابوسفیان خاموش رہنا بھی چاہتا تو اس کی بیوی اسے خاموش رہنے نہیں دے سکتی تھی۔

عربوں کا عقیدہ تھا کہ قتل ہونے والوں کا ماتم کر لیا جائے اور رو کر دل کی بھڑاس نکال لی جائے تو جذبہ انتقام سرد پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بھی تاکید کر دی گئی تھی کہ کوئی شخص بدر کے مقتولین کو روئے نہیں، یہ وہی سکوت وسکون تھا جو شدید آندھی کی گرج سے پہلے والے سناٹے میں ہوا کرتا ہے۔

جنگ کی تیاریاں

سامانِ جنگ کی فراہمی کے لیے روپے پیسے کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس کے لیے عبداللہ بن ابی ربیعہ، عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ اور بہت سے وہ لوگ جن کے باپ، بھائی، بیٹے بدر میں قتل ہوئے تھے، سب مل کر ابوسفیان کے پاس آئے اوران رؤساء کے پاس کہ جن کے اموال تجارت، ابوسفیان والے قافلے میں تھے اور انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مرتبہ کی تجارت میں جتنی رقم حاصل ہوئی ہے وہ سب پیغمبر اسلامؐ سے جنگ کے لیے دے دی جائے۔

یہ تمام لوگ اس سے متفق ہو گئے اور اس طرح مالی حیثیت سے پورا اطمینان ہو گیا، فوج کی فراہمی کے لیے متعدد صاحبانِ اثر اور زبان آور اشخاص، اطراف کے قبائل میں دورہ کے لیے نکلے، ابوعزہ عمرو بن عبداللہ جمحی ایک ممتاز شاعر تھا، باوجودیکہ رسول اسلامؐ کا اس پر یہ احسان تھا کہ جب وہ بدر میں اسیر ہوا تھا تو پیغمبر اکرمؐ سے التجا کی تھی کہ میں غریب آدمی ہوں، میرے ہاں بیٹیوں کی کافی تعداد ہے آپ مجھے فدیہ

کے بغیر چھوڑ دیجئے، حضرتؐ نے اس کی التجا قبول کی اور اسے رہا کر دیا۔

اس کا ضمیر اس احسان کے بار کو محسوس بھی کر رہا تھا، چنانچہ پہلے اس نے مشرکین کے ساتھ تعاون سے یہی کہہ کر انکار بھی کیا مگر پھر اس کو لوگوں نے آمادہ کر لیا کہ ''خواہ تم جنگ میں نہ ہی جاؤ، لیکن اپنی زبان سے ہمیں تقویت ضرور پہنچاؤ!'' چنانچہ وہ ''تہامہ'' کے علاقے میں قبیلہ کنانہ کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے نکلا اور دوسرے اشخاص دوسری اطراف کو چلے گئے، جبیر بن مطعم نے جس کا چچا طعیمہ بن عدی بدر میں قتل ہوا تھا اپنے حبشی غلام وحشی کو بلایا اور اس سے کہا: اگر تم میرے چچا طعیمہ کے بدلے میں محمدؐ یا ان کے چچا حمزہؑ یا ان کے بھائی علی بن ابی طالبؑ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔

اس کے علاوہ بڑے بڑے گھرانوں کی ۱۴ عورتیں ساتھ لی گئیں، تاکہ ناموس کے لحاظ سے لوگ میدان جنگ سے فرار نہ کریں، تاریخ میں ان میں سے خاص خاص عورتوں کے نام موجود ہیں، جو ممتاز حیثیت کی حامل تھیں اور ان کی سرگروہ سردار فوج ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ بن ربیعہ تھی، اسی طرح عکرمہ بن ابی جہل کے ساتھ اس کی بیوی ام حکیم بن حارث، اس کے چچا حارث بن ہشام کے ساتھ خالد بن ولید کی بہن فاطمہ بنت ولید اور صفوان بن امیہ کے ساتھ برزہ ___ یا برہ ___ بنت مسعود اور عمرو بن عاص کے ساتھ عبداللہ بن عمرو بن عاص کی ماں ریطہ بنت فبیہ بن حجاج اور طلحہ بن ابی طلحہ کے ساتھ سلافہ بنت سعد، یہ سب عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ تھیں، خناس بنت مالک اپنے بیٹے ابوعزیز بن عمیر کے ساتھ تھی، سب سے زیادہ ہندہ بنت عتبہ سپاہیوں کو جوش دلاتی تھی اور خصوصیت کے ساتھ اس حبشی غلام وحشی کو جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مدینہ پر حملہ

ان تمام تیاریوں کے بعد جو پورے ایک سال تک ہوئی تھیں ابوسفیان کی سرکردگی میں فوج روانہ ہوئی۔ مدینہ سے بالکل متصل کوہِ احد کے دامن میں پہنچ کر بدھ کے روز اس نے اپنے مورچے قائم کر لیے، مگر حضرت رسول خداؐ نے اس کے بعد تین دن توقف فرمایا اور جمعہ کی نماز مدینہ میں پڑھائی اور ۷. شوال ۳. ہجری کو ان مشرکین سے مقابلہ ہوا۔

مشرک فوج کی تعداد تین ہزار بقولے دو ہزار تھی، اس کے مقابلہ کے لیے حضرت رسالت مآبؐ ایک ہزار اصحاب کو لے کر نکلے مگر عین موقع پر جنگ سے کچھ ہی دیر پہلے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر شہر کو واپس آ گیا اور اس کا کہنا تھا کہ رسول خداؐ نے میرا کہنا نہ مانا کہ شہر میں رہ کر جنگ لڑی جائے، اب میں اپنے آپ کو اور اپنی جماعت کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔

اس طرح سے لشکرِ اسلام کی تعداد سات سو رہ گئی اور یہ پہلی ضرب تھی جو مسلمانوں کی اخلاقی طاقت پر لگی، جس نے دوسروں کے عزم واستقلال میں رخنہ پیدا کیا۔ بنی سلمہ اور بنی حارثہ دو قبیلے بھی واپسی کا ارادہ کرنے لگے مگر کچھ سوچ سمجھ کر انہوں نے اس ارادے کو ترک کر دیا جس کا تذکرہ قرآن مجید میں اس طرح ہے:

"اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ اَنْ تَفْشَلَا......" جب دو گروہوں نے تم میں سے واپسی کا ارادہ کیا کہ وہ عمل میں کمزوری دکھائیں۔

مشرکین میں سات سو زرہ پوش تھے جبکہ مسلمانوں میں صرف سو کے جسم پر زرہیں تھیں، مشرکین کے پاس دو سو گھوڑے، جبکہ مسلمانوں کے پاس کل دو گھوڑے۔

ان لشکروں کی صف آرائی شروع ہوئی۔ مشرکین نے اپنے لشکر کو اس طرح مرتب کیا کہ میمنہ کا افسر خالد بن ولید کو بنایا، میسرہ کا عکرمہ بن ابی جہل کو اور لشکر کا علم طلحہ بن ابی طلحہ کے سپرد کیا۔

حضرت رسالت مآب ﷺ نے اپنے لشکر کی اس طرح مورچہ بندی کی، کوہِ احد کو حفاظت کے لیے پشت پر رکھا تاکہ دشمن پشت کی طرف سے حملہ آور نہ ہو سکے، اس کے لیے آپؐ نے قبیلہ عمرو بن عوف کے ایک بہادر عبداللہ بن جبیر کی سرکردگی میں پچاس تیراندازوں کے دستہ کو اس درہ کے دہانے پر مقرر فرمایا اس ہدایت کے ساتھ کہ "چاہے ہمیں فتح حاصل ہو جائے یا شکست تم میری ہدایت کے بغیر یہاں سے نہ ہٹنا"۔ جنگی اعتبار سے یہ کاروائی انتہائی ضروری تھی، اگر یہ انتظام نہ کیا جاتا تو کفار اس طرف سے حملہ آور ہو کر لشکر اسلام کا محاصرہ کر لیتے اور مسلمانوں کا اس حصار سے جانیں بچا لے جانا مشکل تھا۔

اس نظم وانتظام کے بعد بقیہ لشکر کی صف بندی کی۔ میمنہ پر سعد بن عبادہ کو میسرہ پر اُسَیّد بن حُضَیرؓ کو متعین کیا اور علم جنگ اسلام کے علمبردار ایمانِ مجسم علی بن ابی طالب علیہ السلام کے سپرد کیا، جو جنگ بدر میں بھی علمبردار تھے اور بعد کے غزوات میں بھی علمبردار رہے۔

کفار نے بھی اپنے لشکر کو میمنہ، میسرہ پر تقسیم کیا، میمنہ کا سردار خالد بن ولید کو بنایا، میسرہ کا عکرمہ بن ابی جہل کو، سواروں کا افسر عمرو بن عاص کو مقرر کیا اور تیر اندازوں کا عبداللہ بن ربیعہ کو اور قلبِ لشکر میں جہاں قریش نے اپنا مشہور بت ہُبُل ایک اونٹ پر لا در کھا تھا، ابوسفیان جا کھڑا ہوا اور لشکر کا علم بنی عبدالدار کے ایک شخص طلحہ بن عثمان کے سپرد کیا، جب سب کچھ مکمل ہو گیا تو سب نے مل کر زور سے

"اُعْلُ هُبُلُ، اُعْلُ هُبُلُ" ہُبُل کی جے، ہُبُل کی جے

کا نعرہ لگانا شروع کر دیا، یعنی ہُبُل کا بول بالا اور ہند اور دوسری عورتیں صفوں کے آگے کھڑی ہوگئیں اور لشکر والوں میں جوش پیدا کرنے کے لیے دف بجا بجا کر گانے لگیں:

نَحْنُ بَنَاتُ طَارِقٍ
نُمْشِي عَلَى النَّمَارِقِ
مَشْيَ الْقَطَا النَّوَارِقِ

ہم ستاروں کی بیٹیاں ہیں قالینوں پر ناز و انداز سے اس طرح چلتی ہیں جس طرح سبک رَو قطا پرندہ چلتا ہے۔

وَالْمِسْكُ فِي الْمَفَارِقِ
وَالدُّرُّ فِي الْمَخَانِقِ
اِنْ تَقْبَلُوْا نُعَانِقِ
وَ نَفْرُشُ النَّمَارِق
اَوْ تَدْبَرُوْا نُفَارِقِ
فِرَاقُ غَيْرُ وَامِقِ

ہماری مانگ میں مشک وکستوری بھری ہے اور گردنوں میں موتی جگمگا رہے ہیں، اگر تم آگے بڑھو گے تو ہم تمہیں گلے لگائیں گی اور پیٹھ پھرائی تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے، اس طرح کہ گویا چاہت تھی ہی نہیں۔

یہ جنگی ترانہ ختم ہوتے ہی جنگ کا طبل بجنے لگا اور دست بدست لڑائی کا آغاز ہوگیا، قریش کا علمبردار طلحہ بن عثمان ہتھیار سجا کر بڑے کروفر کے ساتھ میدان میں آیا اور طنزیہ انداز میں کہنے لگا، مسلمانو! تمہارا یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی

مارا جائے تو وہ جنت میں جاتا ہے اور ہم میں سے کوئی مارا جائے تو اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے، لہٰذا تم میں سے جو جنت جانا چاہتا ہے یا مجھے دوزخ بھیجنے کا خواہشمند ہو تو وہ آئے اور مجھ سے لڑے۔

ایمان مجسم علی بن ابی طالب علیہ السلام تلوار لہرانے اور رجز پڑھتے ہوئے اس کے مقابلہ کے لیے نکلے اور دونوں شمشیر بکف آپس میں بھڑ گئے، طلحہ نے تلوار سے حملہ کیا، حضرت نے اس کا وار خالی دے کر اس پر جوابی حملہ کیا اور تلوار کے ایک ہی وار سے اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ کر رکھ دیں، طلحہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ حضور پاکؐ نے اسے گرتے اور کفار کے علَم کو سرنگوں ہوتے دیکھا تو نعرہ تکبیر بلند کیا، اس کے ساتھ ہی دوسرے مسلمانوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ حضرتؑ نے اس کا سر کاٹنا چاہا تو دیکھا کہ برہنہ ہو چکا ہے، آپؑ نے اس حالت میں اس پر دوسرا وار کرنا گوارا نہ کیا اور اسے تڑپتا سسکتا چھوڑ دیا، کچھ لوگوں نے کہا آپؑ نے اسے ختم کیے بغیر کیوں چھوڑا؟ فرمایا جب وہ بے پردہ ہوگیا تو مجھے اس پر حملہ کرتے ہوئے شرم آئی اور پھر اس نے مجھے قرابت اور عزیز داری کا واسطہ بھی تو دیا تھا، آخر اس نے تڑپ تڑپ کر تھوڑی دیر میں دم توڑ دیا۔

طلحہ کے مارے جانے پر مشرکین کے حوصلے پست ہوگئے اور پھر بے دلی کی حالت میں وہ ایک ایک کر کے میدان میں نکلنے کی جرأت نہ کر سکے اور انہوں نے ایک دم ہلہ بول دیا مسلمانوں نے آگے بڑھ کر ان کے ریلے کو روکا، دونوں طرف سے کمانیں کڑکیں، تلواروں سے تلواریں ٹکرائیں اور گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی، حضرت علیؑ، حضرت حمزہؓ، حضرت ابو دجانہ انصاری اور دوسرے مجاہدین نے حملوں پر حملے کر کے دشمن کی صفوں کو الٹ کر رکھ دیا۔

رسول خداؐ نے ابو دجانہ کو ایک تلوار مرحمت فرمائی تھی اور وہ اسے لے کر دشمن

کی صفوں میں گھس گئے اور صفوں کو چیرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں کفار کی عورتیں دف بجا بجا کر اپنے نغموں سے فوج میں جوش پیدا کر رہی تھیں، آپ نے ابوسفیان کی زوجہ ہند بنت عتبہ پر تلوار اٹھائی کہ اس کا خاتمہ کر دیں، مگر اس خیال سے ہاتھ روک لیا کہ رسول خداؐ کی دی ہوئی تلوار کو ایک عورت کے خون سے رنگین کرنا مناسب نہیں۔

حضرت حمزہؑ کی تلوار ''صاعقہ'' بار بھی دشمن کے سروں پر پیہم چل رہی تھی، طلحہ بن عثمان کے مارے جانے کے بعد عثمان بن ابی طلحہ نے قریش کا علم بلند کیا تھا آپؑ نے تلوار سے اس پر حملہ کر کے اس کا کام بھی تمام کر دیا۔

حضرت علیؑ دونوں صفوں کے درمیان علم کو لہراتے ہوئے حملوں پر حملے کیے جا رہے تھے اور لشکرِ قریش میں سے جو بھی علم ہاتھوں میں لیتا اسے تہہ تیغ کر کے پرچم سرنگوں کر دیتے، یہاں تک کہ آٹھ علمبرداروں کو یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب بنی عبدالدار میں سے کوئی پرچم اٹھانے والا نہ رہا، تو اس قبیلہ کے ایک غلام ''صوابؑ'' نے علم سنبھال لیا۔ مارے غصے کے اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ میں محمدؐ کے علاوہ کسی کو قتل نہیں کروں گا۔ حضرت علیؑ نے آگے بڑھ کر اس کی کمر پر ایسا وار کیا کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے اور اس طرح تمام پرچم برداروں کا خاتمہ کر دیا۔ ابن اثیر اپنی کتاب تاریخ کامل جلد ۲ ص ۱۰۷ میں لکھتے ہیں: ''**کان الذی قتل اصحاب اللواء علی**'' جس نے قریش کے علمبردارانِ لشکر کو موت کے گھاٹ اتارا وہ علیؑ تھے۔

علمبردارانِ لشکر کے قتل سے قریش کا دم خم جاتا رہا۔ مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے اور کفار کے مقابلہ میں ایک چوتھائی سے بھی کم ہونے کے باوجود بڑی بے جگری سے لڑتے، سینوں کو چھیدتے اور صفوں کو الٹتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں

تک کہ دشمن کے پاؤں نہ جم سکے اور وہ میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ ابوسفیان علم کو سرنگوں اور اپنے خدا ''ہبل'' کو خاک بسر چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا اور مشرکین کی عورتیں بھی پائنچے سمیٹے دوڑ پڑیں۔

مسلمانوں نے جب کفار کو دوڑتے اور میدان کو خالی دیکھا تو ان پر حرص و طمع کی کمزوری غالب آ گئی اور دشمن کی طرف سے غافل ہو کر مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور جو تیر انداز عبداللہ بن جُبیر کی سربراہی میں درے پر متعین تھے ان کے منہ میں پانی بھر آیا اور مالِ غنیمت کی لالچ ان پر غالب آ گئی اور دوسرے مسلمان سورماؤں کی طرح وہ بھی لوٹ مار میں حصہ لینے کے لیے بے تاب نظر آئے۔ عبداللہ نے ہر چند انہیں فرمان رسولؐ اکرم کی یاد دہانی کرائی مگر ان کی ایک نہ سنی گئی۔ چالیس افراد مورچے چھوڑ کر لوٹ مار میں لگ گئے بے چارے عبداللہ کے پاس دس سے بھی کم افراد باقی رہ گئے۔

خالد بن ولید جو کہ سواروں کے ایک دستے کے ساتھ ان کی گھات میں تھا، اس کیفیت کو دیکھ کر فوراً ان پر حملہ آور ہوا اور ابن جبیر اور ان کے ساتھیوں کو تہہ تیغ کرتا ہوا مسلمان لشکر پر پیچھے سے حملہ کر دیا، ادھر قریشی عورتوں کے ساتھ آئی ہوئی ایک عورت جس کا نام ''عمرہ بنت علقمہ'' تھا، وہ اپنے شکست خوردہ لشکر کو تشویق دلانے اور حوصلے بڑھانے کے لیے جھنڈا لے کر آگے بڑھی۔

اب میدان جنگ کا نقشہ مکمل طور پر بدل گیا، مسلمانوں کی تمام تر تدبیریں ناکام ہو گئیں، صفیں منتشر ہو گئیں، فوج کے ساتھ سردار کا رابطہ منقطع ہو گیا، لشکر اسلام کو شکست ہو گئی اور مجاہدین اسلام کے تقریباً ستر افراد نے جامِ شہادت نوش فرمایا، جن میں جناب حمزہ اور جناب مصعب بن عمیر بھی شامل تھے۔ پیغمبر خداؐ کے پاس تھوڑے سے آدمی جو رہ گئے تھے انہوں نے بلا ترتیب، جو جہاں تھا وہیں پر لڑنا شروع کر دیا۔

اس طرح سے کہ ان میں سے ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی، کسی طرف حمزہ، کسی طرف ابودجانہ اور کسی طرف علی بن ابی طالبؑ اور ایسے کچھ اور جانباز مجاہدین میں سے اکثر بعد میں قتل ہوگئے یا زخموں سے چور ہوکر گر گئے۔ یہاں تک کہ ایک وقت آیا کہ مشرکین نے اپنا نصب العین پیغمبرِ خدا کی ذات کو بنالیا، آپؐ پر اتنے حملے ہوئے کہ آپؐ زخموں سے نڈھال ہوکر ایک گڑھے میں گر گئے، کسی نے غلطی یا شرارت میں یہ صدا بلند کردی کہ حضورؐ شہید ہوگئے ہیں۔

اب جو مسلمان آس پاس کچھ سوچ بھی رہے تھے کہ آگے بڑھ کر مقابلہ کیا جائے وہ یہ کہتے ہوئے کہ رسولؐ تو قتل ہوگئے ہیں اب جنگ سے کیا فائدہ؟ دور دور بھاگ کر جانے لگے اور دوسروں کو بھی یہ کہہ کہہ کر اپنی جانیں بچانے کی تحریک کرنے لگے، طبری جلد۳ ص۲۰ میں ہے: ''آپؐ کے ساتھی آپ کے پاس سے ادھر اُدھر منتشر ہوگئے کچھ مدینہ میں چلے گئے اور کچھ پہاڑ کی چٹان پر جا کر ٹھہر گئے۔ پیغمبر خداؐ با آوازِ بلند لوگوں کو بلاتے رہے کہ ''اِلَیَّ اِلَیَّ عِبَا دَاللّٰہِ'' میری طرف آؤ میری طرف آؤ اے خدا کے بندے۔ قرآن مجید نے اسی کو اس انداز میں بیان کیا ہے: ''وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْ اُخْرَاکُمْ'' رسولؐ تمہارے پیچھے سے تمہیں آوازیں دے رہے تھے۔

بدحواسی کا یہ عالم کہ حذیفہ کے والد ''یمان'' جن کا نام حسیل بن جابر تھا خود مسلمانوں کی تلوار سے شہید ہوگئے، اسی طرح کئی اور مسلمان بھی یا شہید ہوئے یا مجروح۔

ادھر ساتھ ہی جب دشمن کی طرف سے حضور پاکؐ کے قتل کی افواہیں، میدان میں گردش کرنے لگیں تو بہت سے مسلمانوں کے حوصلے پست ہوگئے اور دشمن کے تازہ حملے سے تقریباً تمام مسلمان میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور اس طرح منتشر

ہوئے کہ کسی کو کسی کی خبر تک نہ رہی۔ سوائے معدودے چند افراد کے کہ جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے، حضور گرامیؐ کے پاس رہ گئے تھے۔ تاریخ اسلام کے یہ لمحے زبردست اور بحرانی ترین شمار ہوتے ہیں اور اس وقت جو ثبات دکھائے وہ مرد ہے، کے مصداق ایمان مجسم، امام معظم، امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ہی تھے جو سرکارِ رسالت پناہؐ کے گرد پروانہ وار چکر لگا لگا کر دشمنوں سے آپ کی جان کا دفاع کر رہے تھے، علیؑ کو اپنی جان کی پرواہ نہیں تھی، ان کا تمام نقطۂ نظر حضورؐ کی ذات تھی اور بس!!

چنانچہ مورخ ابن اثیر اپنی کتاب تاریخ کامل ابن اثیر جلد۲ ص۱۵۴ میں فرماتے ہیں:

> ''حضرت رسالت مآبؐ نے مشرکین کے ایک جتھے کو دیکھا کہ وہ آپؐ پر حملہ کرنا چاہتا ہے، تو حضورؐ نے حضرت علیؑ کو اس پر حملہ کرنے کا حکم دیا، علی علیہ السلام نے ان لوگوں پر حملہ کر کے بہت سے لوگوں کو جہنم واصل کیا اور بچ جانے والے افراد منتشر ہوکر بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر حضورؐ نے ایک گروہ کو اپنے اوپر حملہ آور ہوتے دیکھا تو پھر علیؑ کو اس سے نمٹنے کا حکم دیا، شیرِ خدا نے ان پر حملہ کر کے بہت سوں کو جہنم پہنچایا، جو بچ گئے ان کے لیے راہ فرار اختیار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ رہا، اسی اثناء میں فرشتۂ وحی حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: ''یہ ہے حقیقی معنوں میں جاں نثاری اور فداکاری، جو علیؑ دکھا رہے ہیں!!'' تو حضورؐ نے فرمایا: ''کیوں نہ ہو وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں! اس پر جبرائیل نے کہا: اور میں آپؐ دونوں میں سے ہوں'' اسی اثناء میں آسمان اور زمین کے درمیان ہاتفِ غیبی کی آواز سنائی دینے لگی: ''لَا سَیْفَ اِلَّا

ذُو الْفِقَار وَلَا فَتیٰ اِلَّا عَلِی ''ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں
اور علیؑ کے علاوہ کوئی جواں مرد نہیں ہے۔

علامہ ابن ابی الحدید، اپنی کتاب شرح نہج البلاغہ جلد ۱۴ ص ۲۵۳ میں تحریر
فرماتے ہیں:

''جب سرورِ کائنات ﷺ کے اکثر و بیشتر یار بھاگ گئے تو
دشمن کے مختلف دستوں کا دباؤ حضور پاکؐ کی ذات پر بڑھ گیا،
''قبیلہ بنی کنانہ'' اور قبیلہ ''عبد مناۃ'' میں سے ایک ایک گروہ
حضورؐ کی طرف بڑھا، جن کی تعداد پچاس تھی ان میں چار نامی
گرامی سورما بھی موجود تھے، آنحضرتؐ نے علی علیہ السلام سے
فرمایا: ''یا علیؑ! ان کے حملے کو روکو! اس وقت علیؑ پیدل لڑ رہے
تھے، ان پر حملہ کر کے ان کو تتر بتر کر دیا، جن میں مذکورہ چار
سورماؤں کے علاوہ دس دوسرے مشرکین کو واصلِ جہنم کیا''

جبرائیل علیہ السلام نے رسول خداؐ سے کہا:
''یا رسول اللہؐ! علیؑ نے مواسات اور غمگساری کا حق ادا کر دیا ہے
اور آسمان کے فرشتے اس جوان کی مواسات سے محوِ حیرت ہیں''

رسول پاکؐ نے فرمایا:
''کیوں نہ ہو، وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے''
جبرائیلؑ نے کہا: ''میں آپؐ دونوں سے ہوں''
اور اس وقت آسمان سے یہ آواز سنائی دے رہی تھی:
''لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار وَلَا فَتیٰ اِلَّا عَلِی''
ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں اور علیؑ کے علاوہ کوئی جوانمرد نہیں

آواز تو ہر ایک سن رہا تھا، مگر بولنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔
لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! یہ کس کی آواز تھی؟
تو حضورؐ نے فرمایا: ''وہ جبرائیل تھے''

کتاب مناقب خوارزمی ص ۲۲۳ میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے ''شوریٰ''
کے موقع پر اس مواسات اور ہاتفِ غیبی کی اس آواز کے ذریعہ ارکانِ شوریٰ سے اس
بات کا اعتراف کرایا تھا۔

الحاصل ایمانِ مجسم نے مقابلہ، جنگ، دلیری اور بہادری کا حق ایسا ادا کیا
جس سے بالاتر تصور میں نہیں آ سکتا، اور ہزاروں کے لشکر سے تن تنہا جنگ میں فطری
طور پر آپ کو زخمی ہونا چاہیے تھے، چنانچہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی کتاب ''مدارج
النبوۃ'' میں درج کیا ہے کہ: ''قیس بن سعد بن عبادہ نے اپنے والد سے روایت کی
ہے کہ میں نے حضرت علی مرتضیٰؑ سے سنا خود آپ نے فرمایا کہ غزوہ احد کے دن سولہ
زخم مجھ کو لگے جن میں سے چار زخم نہایت ہی شدید تھے''

جنگِ احزاب یا خندق

جنگ بدر اور اُحد نیز دوسرے چھوٹے بڑے غزوات کے بعد مشرکین مکہ
اپنی انفرادی طاقت کو پیغمبر اسلامؐ کے مقابلے میں اب قطعاً ناکافی سمجھ چکے تھے، اس
لیے کہ جب بدر میں مسلمان بالکل ہی بے سروسامان تھے تو ان کی تعداد میں تگنی مسلح
فوج نے ان کے مقابلے میں ایسی شکست کھائی کہ جتنے ان کے بڑے بڑے چوٹی کے
آدمی تھے تقریباً سب مار ڈالے گئے، پھر وہ پوری طاقت کے ساتھ جب احد میں آئے
تو انہوں نے یہ دیکھ لیا کہ وہ فوج اسلام کی اکثریت کو میدان پسپا کر دینے کے بعد بھی
آخر کار جنگ کو سر نہ کر سکے اور ان کی فوج کے جتنے علمدار تھے وہ سب ہی کام آ گئے

تھے اب اس کے بعد بس ایک صورت باقی تھی کہ وہ دوسری جماعتوں کو اپنے ساتھ شریک کر کے متحدہ طاقت کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ کا مقابلہ کریں جو اسلام کی مخالفت میں ان کے ساتھ شریک ہو سکتی ہیں۔

کفار اور مشرکین کا گٹھ جوڑ

مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷۷ اور اعلام الوریٰ طبرسی کے مطابق، اس بارے میں یہود کی جماعت سے جو مدینہ میں تھی، فطری طور پر مدد ملنے کی امید پیدا ہونی چاہیے تھی، بنونضیر کی جلاوطنی سے بڑی حد تک تلخی پیدا ہو چکی تھی، اس لیے حیی بن اخطب، سلام بن ابی حقیق اور کنانہ بن ربیع اور سلام بن مُشکم وغیرہ جو سردارانِ یہود تھے خود مکہ پہنچ گئے اور سرداران قریش سے مل کر انہیں متفقہ طاقت کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

یہی یہودی لیڈر، قبیلہ غطفان اور کنانہ کے سرداروں کے پاس بھی گئے اور انہیں بتایا کہ قریش کو ہم نے پورے طور پر آمادہ کر لیا ہے، اب تمہارے ساتھ دینے کی ضرورت ہے، چنانچہ یہ لوگ بھی اس کے لیے تیار ہو گئے، مکہ معظّمہ سے قریش کا لشکر ابوسفیان کی قیادت میں نکلا۔ قبیلہ غطفان کی قیادت عیینہ بن حصین بن فزارہ کر رہا تھا۔ بنی مرہ کو لے کر حارث بن عوف اور قبیلہ اشجع کے ساتھ وبرہ بن طریف، جبکہ یہود کا کوئی لشکر ان کے ساتھ نہیں تھا۔ مگر منصوبہ یہ تھا کہ وہ مدینہ کے اندر سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائیں گے، اس طرح مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں پس کر رہ جائیں گے۔

خندق بنانے کی تجویز

مورخ واقدی اپنی کتاب ''المغازی'' ص ۴۴۵ میں لکھتے ہیں کہ پیغمبرِ خدا (ص) تک یہ خبر پہنچی اور تمام منصوبہ کی اطلاع ہوئی، تو اس موقع پر باجماع مورخین جناب سلمان فارسیؓ نے رائے دی کہ دشمنوں کے لیے رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے خندق کھودی جائے، انہوں نے یہ تجویز سرکار رسالت مآب ﷺ کے روبرو پیش کی اور کہا کہ ''ایران میں ایسے خطرناک موقعوں پر شہر کے گرد خندق کھود دیتے ہیں کہ دشمن اسے عبور کر کے شہر میں داخل نہ ہو سکے، سرکار کو یہ تجویز پسند آئی، چنانچہ مدینہ کے ارد گرد ایک عمیق خندق تیار کی گئی''

خندق کھودنے کے لیے مسلمانوں کے ساتھ خود حضرت پیغمبر خدا ﷺ بھی خندق کھودنے میں مصروف تھے، اس عالم میں کہ بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگِ خندق سے مہینوں پہلے سے مدینہ میں قحط تھا، خرمے کی پوری فصل تباہ ہو گئی تھی، خوراک کی کمی تھی، کفار کے حملے کی وجہ سے بیرونی رسد کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا، مسلمانوں پر فقر و فاقہ کی کیفیت طاری تھی، اس پر تیز و تند ہوا چل رہی تھی، ابر و باران بھی تھا، دن دن بھر پتھریلی زمین کا کھودنا، بڑے بڑے دلیروں کے کلیجے ہلے جا رہے تھے۔

سلمان منا اہل البیت کی سند

بعض روایات کی بنا پر یہی وہ موقعہ ہے جب حضرت پیغمبر خدا ﷺ نے جناب سلمان فارسیؓ کو وہ بیش بہا سند عطا کی جس کا فخر صحابہ رسولؐ میں سے کسی دوسرے فرد کو حاصل نہیں ہوا، کیونکہ حضرت سلمان بہت سے اہل الرائے کی طرح صرف رائے دے کر بری الذمہ نہیں ہو گئے، بلکہ جب اس پر عمل ہوا اور رسول خداؐ نے چالیس گز زمین دس دس آدمیوں کے ذمہ کی تو جناب سلمان فارسی خود بھی خندق

کھودنے والوں میں شریک ہوئے، اور باوجود اپنی پیرانہ سالی اور طویل عمر کے جس کا شمار بعض راویوں نے سینکڑوں برسوں کے حساب سے کیا ہے، وہ قوی ہیکل ایسے تھے اور پھر پُر عزم، قوت ارادی اور اس سے بڑھ کر قوتِ ایمانی ایسی رکھتے تھے کہ جتنا کام دس آدمی مل کر کرتے تھے اتنا وہ اکیلے کر لیتے تھے۔

اسی چیز کو دیکھ کر مہاجرین اور انصار میں ان کے اپنانے میں مقابلہ ہونے لگا، مہاجرین کہنے لگے کہ ’’سلمان ہم سے ہیں، کیونکہ وہ مدینہ کے باشندے نہیں تھے، باہر ہی سے آئے تھے اور انصار نے کہا: نہیں! وہ ہم سے ہیں کیونکہ مہاجرین تو وہ ہیں جو مکہ سے ترکِ وطن کر کے آئے ہیں اور ان میں جناب سلمان داخل نہیں ہیں، مگر اس بحث کو سن کر سرکار رسالت مآبؐ نے فرمایا: ’’**سلمان منا اهل البیت**‘‘ سلمان ہم اہلِ بیت میں سے ہیں‘‘ اسی چیز کو صاحب مدارج النبوۃ نے اپنی کتاب کی دوسری جلد کے صفحہ ۲۳۰ میں درج کیا ہے۔

چنانچہ مشرکین کی فوجیں مدینہ کے قریب پہنچیں تو سامنے خندق کھدی ہوئی پا کر اسی خندق کے آگے صف آرا ہو گئیں اور ادھر سے پیغمبر خدا (ص) اپنی فوج کے ساتھ خندق کے اس طرف مقیم ہو گئے، بیس دن سے زیادہ بلکہ بعض روایات کے مطابق تقریباً ایک ماہ تک دونوں طرف کے مورچے جمے رہے، مگر سوائے تیراندازی اور سنگباری کے کسی جنگ کی نوبت نہ آئی اور مدینہ کا محاصرہ جاری رہا اور ساتھ ہی بنی قریظہ نے اپنی بدعہدی کا ثبوت دیتے ہوئے معاہدہ کو یکسر منسوخ کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہم نہ کسی کو جانتے پہچانتے ہیں اور نہ ہی ہمارا کسی سے کوئی معاہدہ ہے، یہ لوگ چونکہ مدینہ کے اندر ہی آباد تھے اس لیے شہر میں رہ جانے والے بچوں اور عورتوں کے لیے مستقل خطرہ بن گئے، مسلمان سخت ہراسان، پریشانی اور کشمکش کے عالم میں تھے، ایک طرف دشمن کا محاصرہ شدت اختیار کیئے ہوئے تھا، دوسری طرف

بنی قریظہ کی عہد شکنی سے کفار کا دباؤ بڑھ گیا اور اس دوطرفہ یلغار کے نتیجے میں مسلمانوں کے خوف واضطراب کا نقشہ قدرت نے سورہ احزاب آیات ۱۰ تا ۱۵ میں ان الفاظ میں کھینچا ہے:

’’جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے اور جس وقت تمہاری آنکھیں پتھرا گئیں اور مارے دہشت کے تمہارے دل (کلیجے) منہ کو آ گئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے، اس وقت مومنین خوب آزمائے گئے اور انہیں پوری شدت سے ہلا کر کے رکھ دیا گیا اور جب منافقین اور دلوں میں بیماری رکھنے والے کہہ رہے تھے اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدہ کیا تھا وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھا اور جب ان میں سے ایک گروہ کہنے لگا: اے یثرب والو! یہاں تمہارے لیے ٹھہرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، لہذا پلٹ چلو اور ان میں سے ایک گروہ نبیؐ سے اجازت طلب کر رہا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں حالانکہ وہ کھلے اور غیر محفوظ نہیں تھے، وہ تو اس بہانے سے بھاگنا چاہتے تھے‘‘

اگر دشمن ان پر شہر کے اطراف سے گھس آتے پھر انہیں اس فتنے کی طرف دعوت دی جاتی تو وہ اس میں پڑ جاتے اور اس میں صرف تھوڑا ہی توقف کرتے۔

حالانکہ پہلے یہ لوگ اللہ سے عہد کر چکے تھے کہ پیٹھ نہیں پھیریں گے اور اللہ کے ساتھ ہونے والے عہد کے بارے میں بازپرس ہوگی۔

یہاں پر ایک عبرت ناک منظر جو دیکھنے میں آیا وہ یہ کہ سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۲۳۳ کے مطابق:

"معتب بن قُشیر" نے جو بدری ہونے کا امتیاز رکھتا تھا یہاں تک کہہ دیا کہ:

"کان محمد یعدنا ان ناکل کنوز کسریٰ و قیصر و احدنا الیوم لا یأمن علی نفسه ان یذهب الی الغائط"

محمدؐ تو ہم سے یہ وعدہ کرتے تھے کہ ہم کسریٰ وقیصر کے خزانوں پر ہاتھ صاف کریں گے اور آج یہ حالت ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی رفع حاجت کے لیے جانا چاہے تو وہ اپنی جان کو محفوظ نہیں سمجھتا۔

البتہ کچھ مخلص صاحبانِ ایمان ایسے بھی تھے جو دشمن کی کثرت کو خاطر میں لاتے تھے نہ سختیوں سے دوچار ہونے سے گھبراتے تھے، بلکہ شدائد وآلام میں گھر کر ان کا ایمان اور یقین بڑھتا تھا اور خوداعتمادی کا جوہر نکھرتا تھا، چنانچہ قرآنِ مجید اس بارے میں سورہ احزاب میں فرماتا ہے:

"جب سچے ایمانداروں نے کفار کے گروہوں کو دیکھا تو کہنے لگے یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے وعدہ کیا تھا اور خدا اور اس کے رسولؐ نے سچ کہا تھا، اس سے ان کا ایمان اور جذبہ اطاعت اور زیادہ ہوگیا"

مسلمانوں کے لیے یہ کڑی آزمائش کا وقت تھا، سردی کی شدت اور فاقوں کی سختی سے خستہ وبے حال ہوچکے تھے اور کفار بھی پڑے پڑے اکتا چکے تھے، انہیں محاصرہ کیے ہوئے ستائیس دن ہوگئے تھے اور خندق کے حائل ہونے کی وجہ سے دست بدست جنگ کی نوبت نہ آئی تھی، صرف پتھروں اور تیروں کا تبادلہ ہوتا جس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ کسی طرح پہرہ داروں کی نظروں سے بچ بچا کر خندق

پار کریں اور مسلمانوں کو تلواروں کی زَد پر رکھ لیں۔

یہ فیصلہ کر کے چند سردار دیکھتے بھالتے ہوئے خندق کے ایسے حصہ پر پہنچے جو کم چوڑا تھا اور اس کی حفاظت کا بھی کوئی خاص اہتمام نہ تھا، انہوں نے اندازہ کرلیا کہ یہاں سے گھوڑوں کو مہمیز کر کے خندق کو پار کیا جاسکتا ہے، اس کام کے لیے قریش کے نامور شہسوار عمرو بن عبدود عامری، عکرمہ بن ابی جہل، حسل بن عمرو، منبہ بن عثمان، ضرار بن خطاب فہری، نوفل بن عبداللہ اور ہبیرہ بن ابی وہب منتخب کیے گئے۔

انہوں نے آگے بڑھ کر گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور خندق کو پار کرنے میں کامیاب ہوگئے، اس منزل کے سر ہونے پر کفار کے مردہ دلوں میں کچھ توانائی آئی اور ابوسفیان اور خالد بن ولید نے فوراً لشکر کی صف بندی کی تاکہ ان شہسواروں کے جوہر دکھانے کے بعد فوجوں کو خندق کے اس پار اتاریں اور جنگ مغلوبہ شروع کردیں۔

ان پھلانگنے والوں میں یوں تو سبھی آزمودہ کار اور جنگ آزما تھا مگر ان سب سے زیادہ مشہور بہادر اور نامور شمشیرزن عمرو بن عبدود تھا، جو "عماد عرب" یعنی عربوں کا مایہ ناز ستون اور "فارسِ یلیل" کے نام سے پکارا جاتا تھا اور میدانِ کارزار میں ایک مخصوص علامت سے پہچانا جاتا تھا، اسے "فارس یلیل" اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس نے اسی مقام پر ایک ہزار ڈاکوؤں کو پسپا کردیا تھا۔ چنانچہ اس موقعہ پر تاریخ اسلام کی ایک عظیم اور نامور شخصیت نے پیغمبر اکرمؐ سے بیان کیا: "یارسول اللہ! میں ایک کاروانِ تجارت میں شام جارہا تھا اور یہ شخص ہمارا ہم سفر تھا، جب ہمارا قافلہ "یلیل" کے مقام پر پہنچا تو ایک ہزار رہزنوں نے قافلہ پر حملہ کردیا، تمام اہلِ قافلہ اپنا سامان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے مگر یہ اپنی جگہ سے نہ ہٹا، بلکہ اس قدر جی توڑ کر لڑا کہ رہزنوں کو جان بچا کر بھاگنا پڑا، اور ہمارا قافلہ صحیح وسالم منزل پر پہنچ گیا، گویا اس کی شرکت سے فوج کا حوصلہ اتنا بڑھ جاتا تھا کہ جیسے ایک ہزار کا اس میں اضافہ ہوگیا ہو"

جب اس نے لشکرِ اسلام کی طرف آگے بڑھ کر پکارا کہ میرے مقابلے میں کون آتا ہے؟ تو کسی طرف سے کوئی جواب نہ ملا اور نہ کسی کو اس کے مقابلے میں آنے کی جرأت ہوسکی، حضورؐ نے فرمایا: کون ہے جو اس کے مقابلے میں جائے، حضرت علیؑ نے خندق کا کنارہ چھوڑا اور خدمت پیغمبرؐ میں حاضر ہوئے اور کہا: انا لہ یا نبی اللہ! یارسول اللہ! میں اس کا مقابلہ کروں گا۔ فرمایا: بیٹھ جاؤ! شاید کوئی اور اس کے مقابلے کی ہمت کرے! مگر جب کوئی صدا بلند نہ ہوئی تو سرکارؐ نے فرمایا: ''من لھذا الکلب؟'' کون ہے جو اس کتے کا مقابلہ کرے، اور مسلمانوں کو اس کے شر سے نجات دلائے؟ حضرت علیؑ نے پھر اجازت مانگی، فرمایا: ابھی ٹھہرو! شاید کوئی اس کے مقابلے کے لیے نکلے۔

عمرو پھر للکارا اور کہا کون ہے جو میرے مقابلے میں آئے؟ مگر کوئی آمادہ نہ ہوا، جب عمرو نے تیسری مرتبہ للکارا اور کوئی بڑھ کر اس کے سامنے نہ آیا، تو اس نے طنزیہ انداز میں کہا: ''مسلمانو! تمہاری وہ جنت کیا ہوئی جس میں تمہیں مر کر جانا ہے اور وہ دوزخ کیا ہوئی جو مرنے کے بعد ہمارا ٹھکانہ ہے؟ آؤ!! یا تم جنت میں جاؤ یا مجھے جہنم میں بھیجو!!'' پھر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سپاہِ اسلام کے قریب آکر رجز پڑھنے لگا، جس کا ترجمہ یہ ہے: ''چیختے چیختے میری آواز بیٹھ گئی ہے، میں ان مقامات پر بھی ایک بہادر جنگ جو کی طرح جم کر لڑتا ہوں جہاں اچھے اچھے بہادر کمزوری دکھا جاتے ہیں۔ جنگ کی طرف میرے قدم تیزی سے بڑھتے ہیں اور ایک جوانمرد کی سب سے بڑی خوبی سخاوت اور شجاعت ہی تو ہے''

عمرو کے بار بار للکارنے پر ایک سناٹا تھا جو ہر طرف چھایا ہوا تھا، ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے اور چپ سادھ لیتے اور کسی کو ہمت و جرأت نہ ہوتی کہ آگے بڑھ کر للکارتا اور اس کا غرور توڑتا، تاریخ نے اس وقت کی خاموشی و بے حسی کا

نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''كَأَنَّ عَلٰی رُؤُوسِهِمُ الطَّیرُ'' گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے تھے۔

ناظرین! یہ ایک ضرب المثل ہے جو اس وقت بولی جاتی ہے جب کوئی شخص دشمن کے للکارنے یا جواب طلب کرنے پر سر کو جھکائے بالکل خاموش رہے۔

اس کی اصل یہ ہے کہ جب اونٹ کے سر پر یا اس کے جسم کے کسی حصہ پر کوئی زخم آتا ہے اور پرانا ہو چکا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں تو وہ سر نیچے ڈال کر کسی گوشہ میں الگ تھلگ بیٹھ جاتا ہے اور پرندے اس کے سر اور جسم پر بیٹھ کر ان کیڑوں کو چننے لگتے ہیں، اس موقعہ پر وہ اپنے سر کو بالکل نہیں ہلاتا اور نہ ہی اوپر کو اٹھاتا ہے تاکہ وہ پرندے اڑ نہ جائیں، اس سے یہ مثل اس شخص کے لیے چل نکلی ہے جو سر نیچے ڈال کر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔

غرض ناظرین! حضرت علیؑ نے جب کفر کی مبارز طلبی اور مسلمانوں کی خاموشی دیکھی تو پیچ و تاب کھاتے ہوئے اٹھے اور پیغمبر گرامی قدرؐ کے حضور عرض کیا: یا رسول اللہ! اب مجھے اس سے دو دو ہاتھ کرنے کی اجازت دیجئے!!

اس سے پہلے پیغمبرؐ، علیؑ کو دو مرتبہ روک چکے تھے اور یہ روکنا اس بنا پر نہ تھا کہ حضورؐ ان کو عمرو کے مقابلے میں کمزور اور ناتواں سمجھتے تھے، بلکہ سرکار یہ چاہتے تھے کہ انہیں روک کر دوسروں کی ہمت و جوانمردی کی آزمائش کریں اور دیکھیں کہ کس کی رگ حمیت پھڑکتی اور خونِ شجاعت جوش مارتا ہے؟ اگر عمرو کی پہلی ہی للکار پر علیؑ کو اجازت دے دیتے تو وہ لوگ کہہ سکتے تھے کہ ہم بھی مقابلہ کے لیے تیار تھے، مگر علیؑ کے میدان میں اتر آنے سے ہم خاموش ہوگئے اور ہمیں زور آزمائی کا موقع نہ مل سکا، مگر عمرو کی پیہم للکار پر سکوت و بے حسی نے ان کی ہمت و شجاعت کا پردہ چاک کر دیا،

اس عمومی آزمائش کے بعد آپؐ نے علیؑ کی جرأت اور خود اعتمادی کا جوہر نمایاں کرنے
کے لیے ان سے کہا: ''ھذا عمرو بن عبدود، فارس یلیل '' یہ شہسوار یلیل عمرو
بن عبدود ہے، تو علیؑ نے عرض کیا: اگر وہ عمرو ہے تو ہوا کرے میں بھی تو ابو طالبؑ کا بیٹا
علیؑ ہوں! یہ سن کر آپ نے علیؑ کے سر پر اپنا عمامہ ''سحاب'' رکھا، اپنی زرہ ''ذات
الفصول'' پہنائی، کمر میں ''ذوالفقار'' باندھی اور بارگاہِ احدیت میں ہاتھ اٹھا کر عرض
کیا: جسے شرح بن ابی الحدید جلد۳ ص۳۴۴ میں یوں بیان کیا ہے:

''اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ اَخَذْتَ مِنِّیْ عُبَیْدَةَ یَوْمَ بَدْرٍ وَ حَمْزَةَ
یَوْمَ اُحُدٍ فَاحْفَظْ عَلَیَّ الْیَوْمَ عَلِیًّا، رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا
وَ اَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ''

بارِالٰہا! تو نے عبیدہ کو بدر کے دن اور حمزہ کو احد کے دن مجھ سے
لے لیا، اب ایک علیؑ ہیں تو ان کی حفاظت فرما، پروردگارا! مجھے
اکیلا نہ چھوڑنا اور تو بہترین وارث ہے۔

اب ایمانِ مجسم علیؑ نے میدان کی طرف جانے کے لیے پیغمبرؐ سے اجازت لی، ادھر
پیغمبرؐ کی زبان سے یہ کلمات فضا میں گونجے:

''برز الایمان کله الی الکفر کله''

اور بعض روایات کے مطابق آپؐ نے فرمایا:

''برز الایمان کله الی الشرک کله''

یعنی آج کل ایمان کل کفر اور کل شرک کے مقابلے میں جا رہا ہے۔

علیؑ آگے بڑھے اور عمرو کو للکارا اور اس کے رجزیہ اشعار کے جواب میں
فرمایا:

لَا تَعْجَلَنَّ فَقَدْ اَتَاکَ مُجِیْبُ صَوْتِکَ غَیْرُ عَاجِزِ

دُوْنِیَّةٍ وَ بَصِیْرَةٍ وَ الصِّدْقُ مُنْجِیْ کُلَّ فَائِزِ

ٹھہرو! تمہاری للکار کا جواب دینے والا آ گیا ہے جو کمزور نہیں
ہے، وہ صاحبِ عزم و بصیرت ہے اور سچائی ہی ہر کامیابی حاصل
کرنے کے لیے وجہ کامیابی و کامرانی ہے۔

اِنِّیْ لَاَرْجُوْ اَنْ اُقِیْمَ عَلَیْکَ نَائِحَةَ الْجَنَائِزِ
مِنْ ضَرْبَةٍ تَفْنٰی وَ یَبْقٰی ذِکْرُھَا عِنْدَ الْھَزَاھِزِ

مجھے امید ہے کہ میں تمہارے لیے بین کرنے والی عورتوں کا بندو
بست کروں گا، ایسی ضرب سے جو اپنا کام کر کے مٹ جائے گی
مگر اس کا تذکرہ ہمیشہ جنگوں میں ہوتا رہے گا۔

اب دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے ہو گئے۔ عمرو نے عربوں
کے دستور کے مطابق پوچھا کہ میرا حریف اور مدمقابل ہے کون؟ حضرتؑ نے فرمایا:
''میں ہوں علی بن علی طالبؑ!'' عمرو نے کہا: لشکرِ اسلام میں تمہارے بڑوں میں سے
کوئی نہیں تھا جو مجھ سے لڑنے کے لیے آتا، تم ابو طالبؑ کے بیٹے ہو، وہ میرے دوست
تھے، میں نہیں چاہتا کہ اپنے دوست کے بیٹے پر ہاتھ اٹھاؤں اور اسے قتل کروں، لہٰذا تم
واپس جاؤ اور کسی بڑے کو میرے مقابلے کے لیے بھیجو تا کہ تمہاری بجائے وہ میرے
ہاتھوں سے قتل ہو''۔ حضرتؑ نے فرمایا: ''لکن واللہ احب ان اقتلک ''لیکن
بخدا میں تمہارا خون بہانا پسند کرتا ہوں!

اہلِ سنت کے مشہور عالم علامہ مصدق ابن شبیب کہتے ہیں کہ: ''عمرو نے
ابو طالبؑ سے اپنی دوستی کا اظہار محض اس لیے کیا تھا تا کہ اس کی جان بچ جائے، کیونکہ
وہ بدر میں دیکھ چکا تھا کہ جو بھی علیؑ کے مقابلے نکلا وہ جان سلامت لے کر واپس نہ
آ سکا، اس لیے اس نے چاہا کہ علیؑ سے لڑنے کی نوبت نہ آئے اور ان کی بجائے کسی

اور سے مقابلہ ہو۔ وہ میدان میں اترنے کے بعد جنگ سے پہلو تہی تو نہیں کرسکتا تھا اس لیے ابوطالبؑ کی دوستی کی آڑ لی تاکہ لڑے بھی نہیں اور اس کی کمزوری پر بھی پردہ پڑا رہے''

جب عمرو نے دیکھا کہ حیلے بہانوں سے جان بچانا مشکل ہے تو لڑنے پر تیار ہوگیا، حضرت امیر علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ خود پیادہ ہیں اور عمرو گھوڑے پر سوار ہے اور پیادہ ہمیشہ سوار کی زد میں ہوتا ہے، آپ نے چاہا کہ اسے بھی گھوڑے سے نیچے اتروائیں، اس لیے اُس سے فرمایا: اے عمرو! میں نے سنا ہے کہ اگر حریف میدانِ جنگ میں تم سے تین باتوں کا تقاضا کرتا ہے تو تم ایک ضرور مان لیتے ہو! کہا: ہاں! فرمایا: تو پھر میری پہلی خواہش یہ ہے کہ تم اسلام قبول کرلو تاکہ مجھے تم سے لڑنے کی ضرورت ہی نہ پڑے، کہا یہ نہیں ہوسکتا میں کہ میں اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر نیا دین اختیار کروں، فرمایا: پھر میری دوسری خواہش یہ ہے کہ تم اپنے لشکر سے علیحدہ ہوکر واپس چلے جاؤ!! کہا: میدان سے منہ موڑنا مردوں کا کام نہیں ہوتا اور میں گوارا نہیں کرسکتا کہ عورتیں مجھے فرار پر طعنہ دیں اور میری شجاعت پر حرف رکھیں، فرمایا تو پھر میری تیسری خواہش یہ ہے کہ تم گھوڑے سے نیچے اتر آؤ اور مجھ سے جنگ کرو۔

یہ سن کر عمرو پیچ و تاب کھاتا ہوا نیچے اترا اور اُترتے ہی گھوڑے کے پیروں پر ایسی تلوار چلائی کہ اس کی چاروں کونچیں کاٹ ڈالیں، بظاہر یہ ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر ایسا نہیں ہے، کیونکہ اس طرح کے اقدام سے اس کے دو مقصد تھے، ایک تو یہ تاثر دینا تھا کہ میں نے گھوڑے کے پاؤں کاٹ کر اپنے لیے راہِ فرار بند کردی ہے، اب قتل کیے یا قتل ہوئے بغیر میدان سے ہٹنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اس کی دوسری غرض یہ بھی تھی کہ اس طرح سے وہ اپنی قوت و طاقت اور تیغ زنی کا مظاہرہ کرکے اپنے مدِ مقابل کو مرعوب اور متاثر کرے تاکہ وہ مقابلے سے جی

چھوڑ بیٹھے، کیونکہ نفسیاتی حیثیت سے اگر حریف کو اپنی قوت و توانائی سے متاثر کرلیا جائے تو اس کی قوت مزاحمت جواب دے جاتی ہے اور اس پر بآسانی قابو پایا جاسکتا ہے۔

مگر فرزندِ ابوطالبؑ تو کسی بڑے سے بڑے بہادر اور شہزور کو خاطر میں نہ لاتے تھے، وہ اس سے کیا متاثر و مرعوب ہوتے؟ اور نہ ہی ایمان کی یہ شان ہے کہ وہ کفر کے مقابلے میں کمزور پڑ جائے، یہ تو ایمان مجسم ہیں اور اس کے شمشیر زنی کے مظاہرے کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دی، بلکہ اسے موقع دیا کہ سب سے پہلے حملہ کرے، چنانچہ وہ تلوار لے کر حضرتؑ پر حملہ آور ہوا، آپؑ نے سپر پر اس کا وار روکا مگر وہ بلا کا تیغ زن تھا روکتے روکتے تلوار کا اچٹتا ہوا وار آپ کے سر پر آ لگا اور پیشانی خون سے رنگین ہوگئی۔

اب ایمانِ مجسم کی تیغِ ایمان بازرگ کفر کو کاٹنے کے لیے بے نیام ہوئی اور علیؑ جوابی حملہ کے لیے زخمی شیر کی طرح جھپٹے اور اس کے پیروں پر اس طرح تلوار ماری کہ ان کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں اور وہ لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گرا، یہ دیکھ کر حضرت نے تکبیر کا نعرہ لگایا اور اس کے سینے پر سوار ہوگئے، یہ آواز سن کر رسول خداؐ نے بھی نعرہ بلند کیا اس کے بعد علیؑ نے اس کا سر کاٹ لیا چونکہ گرد و غبار کی وجہ سے صحابہ کرام کچھ دیکھ نہیں پا رہے تھے جب تکبیر کی آواز سنی تو سمجھ گئے کہ علیؑ فاتح و کامران ہوئے اور عمرو مارا گیا، جب گرد چھٹی تو یہ منظر دیکھا کہ ایمانِ مجسم علیؑ ایک ہاتھ میں شمشیر خون آشام اور دوسرے ہاتھ میں عمرو کا لہو میں ڈوبا ہوا سر لیے اس طرح جھومتے ہوئے چلے آ رہے ہیں جس طرح شیر ہلکی پھوار میں بل کھاتا ہوا چلتا ہے اور زبان پر یہ ترانہ گونج رہا ہے:

انا علی و ابن عبد المُطَّلِب
الموت خیر للفتیٰ من الھرب

میں علیؑ ہوں، عبد المطلب کا بیٹا۔ اور جوانمرد کے لیے بھاگنے
سے موت بہتر ہے۔

ایمان مجسم کو اس طرح آتے دیکھ کر ''کچھ لوگوں نے'' کہا: علیؑ تو آج بڑی رعونت سے چل رہے ہیں، قرآنِ مجسم رسول معظم حضرت محمد مصطفیٰؐ نے سنا تو فرمایا: میدانِ جنگ میں اللہ تعالیٰ کو یہی چال پسند ہے۔

مستدرک حاکم جلد۳ ص۳۲ میں ہے کہ جب کفر و ایمان کا معرکہ سر کر کے پیغمبرؐ کی خدمت میں باریاب ہوئے تو عمرو کا سر حضورؐ کے قدموں میں ڈال دیا، حضورؐ نے انہیں سینے سے لگایا اور ان کی اس عظیم خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا:

''ضَرْبَةُ عَلِيٍ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْن ''

خندق کے دن علیؑ کی ایک ضربت جن و انس کی عبادت پر بھاری
ہے۔

ایک بزرگ شخصیت نے جب یہ دیکھا کہ حضرت علی علیہ السلام نے عرب کی عام روش کے برخلاف نہ عمرو کی زرہ اتاری ہے اور نہ اس کی تلوار، خود وغیرہ پر قبضہ کیا ہے تو ان سے کہا: ''هَلَّا سلبتَ دِرْعَهُ يَا عَلِي ''علیؑ ! آپ نے عمرو کی زرہ کیوں نہ اتاری؟ فرمایا: مجھے حیاء آئی کہ میں زرہ اتار کر اس کی لاش کو برہنہ کر دوں'' یہ تھی علیؑ کی سیر چشمی اور بلند نگاہی کہ جہاں مالِ غنیمت، مجاہد کی بڑی کمزوری ہے وہاں ایمانِ مجسم کی بلند کرداری اور عالی ظرفی کا جوہر یوں نمایاں ہوتا ہے کہ نہ جذبہ جہاد میں طمع دنیوی کی آمیزش ہونے پاتی ہے اور نہ مقتول کی بیش قیمت زرہ پر نظر پڑتی ہے۔

حضرتؑ کی اس بلند نظری کا اعتراف عمرو کی بہن نے بھی کیا ہے اور کہا ہے:
''ما قتله الا كفو كريم ''اس کا قاتل کوئی شریف اور عالی ظرف انسان ہے!!۔

عمرو کے مارے جانے سے اس کے ساتھیوں کے قدم اکھڑ گئے اور پھر کسی کو

مبارز طلبی کی جرأت نہ ہو سکی، سب کے سب بدحواسی کے عالم میں خندق کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے، حضرت علیؑ نے بڑھ کر گھیرا ڈالا اور عمرو کے بیٹے حسل پر تلوار ماری اور اسے وہیں پر ڈھیر کر دیا، نوفل بن عبد اللہ خندق کو پھاندتے ہوئے اس میں گر گیا، کچھ لوگوں نے اس کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر پتھر برسانا شروع کر دیئے، اس نے کہا: ''اگر مجھے مارنا ہے تو ذلت سے نہ مارو، تم میں سے کوئی نیچے اترے اور مجھ سے آ کر لڑے'' حضرت علیؑ خندق میں اترے اور ایک ہی ضرب میں اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

منبہ بن عثمان خندق کو عبور کرتے ہوئے کسی کا تیر کھا کر زخمی ہوا اور مکہ پہنچ کر مر گیا، عکرمہ نے اپنا نیزہ پھینک کر اپنا بوجھ ہلکا کر دیا اور ہبیر کے ساتھ خندق پھاند کر لشکر گاہ میں پہنچ گیا، ضرار بن خطاب فہری کو ایک بزرگوار نے بھاگتے دیکھا تو اس کا پیچھا کیا، ضرار نے پلٹ کر حملہ کرنا چاہا تو دیکھا کہ وہ ایک ''بزرگوار'' ہیں، اس نے ہاتھ روک لیا اور یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا: ''اے دوست! میرے اس احسان کو یاد رکھنا'' اور خندق کو پھاند کر اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔

ناظرین! یہاں پر ایک قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ کفار و مشرکین نے خود تو بھاگ کر جان بچالی مگر اپنے مقتولین کی لاشیں وہیں میدان جنگ میں پڑی رہنے دیں، بعد میں حضور پیغمبرِ خداؐ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ عمرو اور نوفل کے لاشے ہمارے حوالے کر دیئے جائیں، ہم اس کا عوض زر نقد کی صورت میں دینے کو تیار ہیں، حضورؐ نے فرمایا: ''هو لكم ما نا كل ثمن الميتة '' یہ تمہارا ہی مال ہے، ہم مردے بیچ کر نہیں کھایا کرتے'' انہیں اجازت مل گئی اور وہ لاشے اٹھا کر لے گئے۔

اس معرکہ میں مشرکین کے چار آدمی عمرو بن عبدود، نوفل بن عبد اللہ اور حسل بن عمرو بن عبدود، حضرت علی کے ہاتھ سے قتل ہوئے، منبہ بن عثمان، زخمی ہو کر بھاگا

اور مکہ پہنچ کر ختم ہوگیا، مسلمانوں نے صرف اتنا کیا کہ نوفل جب خندق میں گرا تو اس پر پتھر برسائے اور منبہ پر دور سے تیر چلائے، ایک بزرگ نے ضرار بن خطاب کا پیچھا کیا، مگر انہیں خود ہی اس کا ممنونِ احسان ہونا پڑا اور کفار کے ان مانے ہوئے شجاعوں سے نمٹنے والے صرف اور صرف ایمانِ مجسم علی بن ابی طالبؑ ہی تھے، جنہوں نے ضرب یداللّٰہی سے عمرو اور نوفل ایسے سورماؤں کو قتل کر کے انہیں میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور مشرکین کا ایسا زور توڑا کہ وہ آئندہ کے لیے مدینہ پر چڑھائی کی جرأت نہ کر سکے، سب دم خم جاتا رہا، تابِ مقاومت چھن گئی اور اپنی ناکامی و نامرادی پر صبر کر کے گھروں کے گوشوں میں بیٹھ گئے۔

ایمانِ مجسم فاتحِ خیبر

ہجرت کے ساتویں سال سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں کی اسلام کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں کا سد باب کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور اس قصد کی دو وجوہات تھیں:

۱۔ خیبر ایک نوخیز اسلامی حکومت کے خلاف سازشوں اور فتنہ انگیزیوں کے مرکز میں تبدیل ہو چکا تھا اور ویسے بھی اس قلعہ کے مکین یہودیوں نے بار ہا دشمنانِ اسلام کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ میں شرکت بھی کی تھی خاص طور پر جنگِ خندق کے موقعہ پر تو ان کا کردار نہایت ہی گھناؤنا تھا۔

۲۔ اس زمانے میں اگرچہ ایران اور روم سپر طاقتیں آپس کی جنگوں میں الجھی ہوئی تھیں، لیکن اسلام کا ظہور ان کے لیے ایک تیسری طاقت بن کر سامنے آرہا تھا، جو دونوں میں سے کسی کے

لیے بھی ناقابلِ برداشت طاقت تھی، اسی لیے کچھ بعید نہیں ہے کہ خیبر کے یہودی کسریٰ یا قیصر کے آلہ کار بن کر اسلام کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف ہوں، یا جس طرح مشرکین کو اسلام کے خلاف حملہ آور ہونے کے لیے اکساتے رہے اسی طرح اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے لیے ان دونوں طاقتوں کو آمادہ کر کے اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو جائیں۔

اسی وجہ سے سرکار رسالت مآب ﷺ اپنے ساتھ سولہ سو (۱۶۰۰) جانبازوں کا لشکر لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوگئے، خیبر چھوٹے بڑے سات قلعوں پر مشتمل تھا جن کے نام یہ ہیں: ناعم، کیتبہ، شق، نطاۃ، وطیح، سلالم، اور قموص، سب سے بڑا، محکم اور مضبوط قلعہ ''قموص'' تھا جو قلعہ خیبر کے نام سے مشہور تھا، اس قلعہ میں سولہ ہزار یہودی رہائش اختیار کئے ہوئے تھے، جن میں سے دس ہزار افراد جنگجو تھے، جو ہر وقت قلعے کی حفاظت کیے رہتے تھے اور لڑنے مرنے کے لیے آمادہ تھے اور ان میں وہ یہودی بھی شامل تھے جو مدینہ سے جلاوطن ہو کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔

ناظرین! لفظ ''خیبر'' عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''قلعہ'' جبکہ ایک دوسرا قول یہ ہے کہ قوم ''عمالقہ'' میں ''یثرب'' اور ''خیبر'' نام کے دو بھائی تھے، جنہوں نے جہاں جہاں رہائش اختیار کی وہ جگہیں ان کے نام سے موسوم ہوگئیں، چنانچہ ''یثرب'' کے نام پر یثرب یعنی مدینہ اور خیبر کے نام پر خیبر آباد ہوا اور خیبر مدینہ منورہ سے اَسی (۸۰) میل کے فاصلے پر حجاز اور شام کی سرحد پر واقع اور اپنی زرعی پیداوار کی وجہ سے دور دور تک مشہور تھا۔

غرض جب یہودیوں کو معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے قریش سے خائف ہو کر

حدیبیہ کے مقام پر صلح کر لی ہے تو انہوں نے سمجھا کہ اب مسلمان جنگ کرنے سے گھبرانے لگے ہیں اور ان میں دشمن سے ٹکرانے کی ہمت نہیں رہی، اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر انہوں نے قریش کو لڑنے کے لیے جرأت دلائی اور مسلمانوں کی صلح پسندانہ روش کو کمزوری پر محمول کرتے ہوئے اسلامی مرکز پر تاخت و تاراج کا منصوبہ بنایا، تا کہ غزوہ احزاب کی ناکامی کی خفت مٹائیں اور جلاوطنی کی ذلت کا دھبہ دھوئیں اپنے سے چھ میل پر واقع بنی غطفان سے بھی معاہدہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں ان کا ساتھ دیں گے اور وہ انہیں خیبر کی نصف پیداوار میں شریک بنائیں گے۔ بنی غطفان نے اسے منظور کیا اور ان کے چار ہزار نبرد آزما ان کے پرچم تلے جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔

چنانچہ حضور اکرم ﷺ بھی حدیبیہ سے مراجعت کے بیس دن بعد اپنے سولہ سو (۱۶۰۰) جانبازوں کے ساتھ جن میں دو سو (۱۰۰) سوار اور باقی پیادہ تھے، خیبر کی طرف روانہ ہو گئے، جب لشکر اسلام خیبر کے نواح میں پہنچا تو صبح ہو چکی تھی، اہلِ خیبر اپنے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے جا رہے تھے، لشکرِ اسلام کو آتے دیکھا تو بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے اور بدحواس ہو کر اپنے قلعوں کی طرف بھاگے، صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۵۹ میں ہے: حضورؐ نے انہیں بھاگتے دیکھا تو نعرہ تکبیر بلند کیا اور فرمایا: ''خیبر برباد ہو گیا، کیونکہ جب ہم کسی قوم کی سرحد پر اترتے ہیں تو ''ساء صباح المنذرین'' جن لوگوں کو ڈرایا گیا تھا ان پر برا وقت آپڑا۔

پیغمبر اکرمؐ کو معلوم ہو چکا تھا کہ بنی غطفان چونکہ اہلِ خیبر کے حلیف ہیں اور وہ جنگ میں ان کا ساتھ دیں گے، لہٰذا آپؐ نے خیبر اور بنی غطفان کی بستیوں کے درمیان پڑاؤ ڈال دیا تا کہ ان کی کمک کا راستہ بند کیا جائے، چنانچہ جب انہیں معلوم ہو گیا کہ مسلمان آ چکے ہیں تو وہ اپنے گاؤں کی تباہی کے پیش نظر اپنے گھروں کو واپس

چلے گئے اور مسلمان خیبر کے محاصرے کے لیے آگے بڑھے۔ یہودیوں نے عورتوں اور بچوں کو ''قلعہ کتیبہ'' میں محفوظ کر دیا اور خود دوسرے قلعوں میں سے مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کر دیئے۔ مسلمانوں نے مختصر جھڑپوں کے بعد باقی چھوٹے موٹے قلعے تو فتح کر لیے مگر، جس قلعہ پر فتح کا دارومدار تھا وہ ابن ابی الحقیق کا قلعہ تھا جو قموص نامی پہاڑی پر واقع تھا، جس سے یہ قلعہ بھی قموص کے نام سے مشہور ہو گیا اور یہی قلعہ حدیث و تاریخ میں قلعہ خیبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس کے سامنے ایک گہری خندق تھی لہٰذا وہ اپنی مضبوطی و استحکام کی وجہ سے ناقابلِ تسخیر تھا۔

ناظرین! غزوات میں سپہ سالاری کے فرائض عام طور پر پیغمبر اکرم ﷺ خود انجام دیا کرتے تھے اور علم برداری کا منصب ایمان مجسم علی بن ابی طالب علیہ السلام کے سپرد کیا جاتا تھا، مگر اس موقعہ پر مصلحتِ خداوندی ہی کہیے گا حضورؐ چند دنوں سے درد شقیقہ میں مبتلا تھے اور حضرت علیؑ آشوبِ چشم میں۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ شروع میں کچھ ابتدائی لڑائیاں ہوئیں جن میں مسلمان فتح یاب ہوئے۔ لیکن جب سب سے اہم اور مضبوط و مستحکم قلعہ کی باری آئی تو یہ منزل بڑی کٹھن ثابت ہوئی، ممکن ہے اگر پیغمبر خداؐ خود جنگ کے انتظامات کر رہے ہوتے تو قلعہ پر حملہ کو اس وقت تک ملتوی کر دیتے جب تک علیؑ اچھے ہو کر نہ آجاتے مگر آپ کا دردِ شقیقہ میں مبتلا ہو کر انتظامات جنگ سے کنارہ کش ہونا تھا کہ فتح کی امنگ رکھنے والے ''مجاہدین'' نے کہ جنہیں رسول سے ایک طرح کی شکایت تھی کہ ''ہمیں آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیتے'' خود انتظاماتِ جنگ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور قدم بھی اقدام کے لیے بڑھا دیا، جس کے بعد ناگوار صورت پیش آئی اور وہ اتنی طشت از بام ہوئی کہ تاریخ ہی نہیں کتبِ احادیث تک پہنچ گئی۔ عام کتب احادیث ہی نہیں چھ صحیح ترین کتابوں اور وہ بھی عام صحیح کتب نہیں بلکہ ''اصح الکتب بعد کتاب الباری'' میں جگہ پا گئی''

بہر حال کئی بزرگوں نے قلعہ قموص پر حملہ آور ہونے کے لیے بڑھنے کی کوشش کی، بڑے ہاتھ پاؤں مارے مگر کسی کی کوشش کامیاب نہ ہوسکی اور کئی مرتبہ گئے مگر ناکام واپس آئے اپنی ناکامی کی خفت کو مٹانے کے لیے فوج کو اس شکست کا ذمہ دار ٹھہرایا، لیکن فوج نے ان کی قیادت کو وجہ شکست قرار دیا۔

چنانچہ مورخ طبری نے اسے اپنی تاریخ طبری جلد۲ ص۳۰۰ میں اس ماجرا کو تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔

آخر کار حضور اکرمؐ کے درد سر میں کچھ کمی واقع ہوئی تو خیمہ سے باہر تشریف لائے اور اس شکست و ہزیمت سے فوج میں بددلی پھیلی ہوئی دیکھی تو تاریخ خمیس جلد۲ ص۵۳ میں ہے آپؐ نے فرمایا:

''اَمَا وَاللّٰهِ لَاُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا كَرَّارًا غَيْرَ فَرارٍ يُحِبُّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ وَ يُحِبُّهُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ''

یادرکھو! خدا کی قسم میں کل اُس ''مرد'' کو علم دوں گا جو مسلسل حملے کرنے والا ہوگا اور راہِ فرار اختیار کرنے والا نہ ہوگا، وہ خدا اور رسولؐ کو دوست رکھتا ہوگا اور خدا اور رسولؐ اسے دوست رکھتے ہوں گے اور اسی کے دونوں ہاتھوں پر اللہ فتح دے گا''

حضرت رسالت مآب ﷺ نے سردارِ لشکر کے اس الزام کے باوجود کہ فوج نے کم ہمتی اور بزدلی دکھائی، فوج میں ردوبدل نہیں کیا، بلکہ سردارِ لشکر کی تبدیلی کا اعلان فرمایا اس لیے کہ فوج کا ثبات سردار کے ثباتِ قدم پر منحصر ہوتا ہے، کیونکہ جب اس کے قدم اکھڑ جائیں تو فوج کے قدم نہیں جما کرتے۔

سرکارِ رسالت مآب ﷺ کے اس اعلان کے بعد ہر زبان پر اس کی گونج

سنائی دینے لگی اور اس کے تذکرے اور چرچے ہونے لگے، ہر ایک کو یہ انتظار کہ دیکھئے کل علم کس کو ملتا ہے۔ صحابہ کرام میں کوئی نمایاں شخصیت ایسی نہیں تھی جسے یہ توقع نہ رہی ہو کہ کل علم اسے ملے گا، بلکہ وہ افراد بھی کم امیدوار نہ تھے جو علم لے کر قسمت آزمائی کر چکے تھے۔ مورخ ابن اثیر اپنی تاریخ کامل کی جلد۲ ص۱۴۹ میں لکھتے ہیں:

''قریش میں سے ہر ایک یہ امید رکھتا تھا کہ وہی ''علمدار'' ہوگا۔

اس لیے کہ حضرت علیؑ کی طرف سے تو انہیں اطمینان تھا کہ وہ میدان میں نہیں جاسکتے کیونکہ آشوبِ چشم کی وجہ سے وہ قدم رکھنے کی جگہ کو نہیں دیکھ سکتے، ادھر یہ قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں اُدھر حضرت علیؑ سے پیغمبرِ خداؐ کے اس اعلان کا ذکر کیا گیا تو اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے:

''اَللّٰهُمَّ لا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِىَ لِمَا مَنَعْتَ''

بارالہا! جسے تو عطا کرے اسے کوئی محروم نہیں کرسکتا اور جسے تو محروم رکھنا چاہے اسے کوئی عطا نہیں کرسکتا۔

چنانچہ آنے والی کل کے انتظار میں لوگوں نے کروٹیں بدل بدل کر رات گزاری۔ صبح ہوئی تو پیغمبر اسلام کے خیمے کے سامنے جمع ہوئے درِ خیمہ پر نظریں لگا کر بیٹھ گئے۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری صحیح بخاری جلد اول ص۵۲۵ میں رقمطراز ہیں:

''فَغَدَوْا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ (ص) كُلُّهُمْ يَرْجُوْنَ اَنْ يُّعْطَاهَا'' وہ صبحدم رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہوگئے اور ہر ایک یہ امید لگائے ہوئے تھا کہ علم اسی کو ملے گا۔

پیغمبر اکرمؐ نمازِ صبح سے فارغ ہوکر ہاتھوں میں علم لیے ہوئے خیمے سے باہر تشریف لائے۔ علم پر نظر پڑتے ہی لوگوں میں ہلچل مچی۔ کچھ لوگ صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے، کسی نے گردن بلند کی اور کوئی گھٹنوں کے بل اونچا ہوا تاکہ حضورؐ

کی نظر اس پر پڑ سکے، یوں تو ہر ایک علم لینے کے لیے بے قرار اور فتح کا سہرا اپنے سر باندھنے کے لیے بے چین تھا۔ مگر کچھ لوگوں کی بے قراری اس حد تک بڑھی کہ تاریخ ان کے نام لیے بغیر نہ رہ سکی۔ ان کے نام معلوم کرنے کے لیے ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد جلد۲ ص ۴۸ تاریخ طبری جلد۲ ص ۳۰۰، دیار بکری کی تاریخ خمیس جلد۲ ص ۴۸۔

مگر پیغمبر اکرمؐ سے کسی کے کارنامے ڈھکے چھپے نہ تھے۔ آپؐ نے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور فرمایا: ''علیؑ کہاں ہیں؟'' کسی کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ علیؑ کا نام لیا جائے گا، ہر طرف سے شور اٹھا کہ ''جی، ان کی آنکھیں دکھ رہی ہیں!'' فرمایا: خواہ جو کچھ ہے، انہیں لے آؤ۔

چنانچہ سلمہ بن اکوع علیؑ کے خیمے میں گئے اور انہیں لے کر آئے، حضور سرورِ کائناتؐ نے ان کا سر اپنے زانو پر رکھ کر آنکھوں میں لعابِ دہن لگایا اور دعا دی:

''اَللّٰھُمَّ اَذْھِبْ عَنْہُ الْحَرَّ وَ الْبَرْدَ وَ انْصُرْہُ عَلٰی عَدُوِّہٖ'' بار الٰہا! انہیں گرمی اور سردی کے اثرات سے محفوظ رکھ اور دشمن کے مقابلے میں ان کی نصرت و مدد فرما۔

چنانچہ لعاب دہنِ رسول اللہؐ نے اکسیر شفا کا کام کیا اور اسی وقت آشوبِ چشم جاتا رہا اور سوزش و تکلیف ختم ہوگئی۔ ایمانِ مجسم حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ کی دعا کے طفیل اس دن کے بعد نہ مجھے گرمی کا احساس ہوا اور نہ سردی کا۔

غرض جب مولا کی آنکھیں روشن ہوگئیں تو تاریخ خمیس جلد۲ ص ۴۹ کے مطابق حضور سرورِ کائنات نے انہیں اپنے ہاتھ سے اپنی زرہ پہنائی، تلوارِ ذوالفقار ان کی کمر میں لگائی اور پھر علم عطا فرمایا کر خیبر فتح کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علی علیہ السلام علم لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور جاتے ہوئے رخ موڑ کر پیغمبر اکرمؐ سے پوچھا کہ کب تک لڑوں؟ فرمایا:

پہلے پر امن طریقے پر جا کر انہیں دعوتِ اسلام دو اور انہیں بتاؤ کہ ان پر اللہ کی طرف سے کیا فریضہ عائد ہوتا ہے، اگر نہ مانیں تو ان سے اس وقت تک لڑو جب تک وہ اسلام قبول نہ کرلیں، اگر آپ کے ذریعہ ایک شخص بھی راہِ راست پر آگیا وہ تمہارے لیے سرخ بالوں والے اونٹوں سے بہتر ہوگا۔

یہ ہدایات لے کر حضرت دوڑتے ہوئے میدان کی طرف بڑھے، کچھ لوگوں نے کہا: ''ذرا ٹھہریئے ہم بھی ساتھ ہولیں''، مگر حضرتؑ نے جوشِ شجاعت میں توقف نہ کیا اور قلعہ قموص کے قریب پہنچ کر کے اور علم سنگلاخ زمین پر گاڑ دیا، جو اس بات کے اعلان کی طرف اشارہ تھا کہ آج میدان میں آنے والا قلعہ فتح کیے بغیر واپس نہیں جائے گا، چنانچہ ایک یہودی نے قلعہ کے اوپر سے یہ منظر دیکھا تو حیران ہوکر پوچھا کہ ''آپ کون ہیں؟'' فرمایا: میں علی بن ابی طالبؑ ہوں، اس نے مولا علیؑ کے تیور کو دیکھ کر دوسرے یہودیوں سے کہا: ''غُلِبْتُمْ یَا مَعْشَرَ الْیَھُوْدِ!'' اے گروہِ یہود! اب تمہاری شکست یقینی ہے۔

یہودیوں کو قلعہ قموص کی مضبوطی پر بڑا ناز تھا اور پہلے آنے والے پرچم برداروں کی ناکامی سے ان کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے، مگر اپنی ہی جماعت کے ایک آدمی سے یہ حوصلہ شکن الفاظ سنے تو ان میں ہلچل مچ گئی اور دلوں پر رعب چھا گیا۔

اب لشکرِ اسلام سے کچھ لوگ بھی حضرت علی علیہ السلام کے پاس پہنچ چکے تھے اور قلعہ کے سامنے پرا جما کر کھڑے ہوگئے، قلعہ کا سردار مرحب تھا، اس کے ایک بھائی کا نام حارث تھا وہ اس سے پہلے بھی میدان میں نکل چکا تھا، اب کے ایک دستہ فوج کا لے کر قلعہ سے باہر آگیا اور ایک دم حملہ کر کے دو مسلمانوں کو شہید کر دیا، مولا امیر علیہ السلام نے آگے بڑھ کر اس پر حملہ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

مرحب نے جب یہ دیکھا کہ اس کا بھائی مارا جا چکا ہے، تو اس کی آنکھوں

میں خون اتر آیا، اس نے زرہ پر زرہ پہنی، سر پر پتھر کا تراشا ہوا خول رکھا اور دو تلواریں اور تین بھال کا نیزہ لے کر قلعہ سے باہر آیا اور یہ رجز پڑھتے ہوئے مبارز طلب ہوا:

قَدْ عَلِمَتْ خَيْبَرُ اَنِّی مَرْحَبٗ

شَاكِی السَّلَاحِ بَطَلٌ مُجَرَّبٗ

اہلِ خیبر جانتے ہیں کہ میں مرحب ہوں، ہتھیار بند بہادر اور آزمودہ کار ہوں۔

واقعاً مرحب تھا بھی بڑا تنومند اور شہزور، اس کے للکارنے پر کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس کے مقابلے کے لیے نکلتا۔ علامہ دیار بکری نے تو اپنی کتاب تاریخ خمیس جلد۲ ص۵۰ پر یہاں تک لکھا ہے کہ:

''لَمْ يَقْدِرْ أَحَدٌ فِی الْاِسْلَامِ اَنْ يُّقَاوِمَهٗ فِی الْحَرْبِ''

مسلمانوں میں سے کسی کے بس کی بات نہ تھی کہ جنگ میں اس کا مدمقابل ہوتا۔

جناب امیرؑ نے اس کا رجز سنا تو یہ رجز پڑھتے ہوئے اس کے مقابلے کے لیے نکلے:

اَنَا الَّذِیْ سَمَّتْنِیْ اُمِّی حَيْدَرَه

ضَرْغَامُ آجَامٍ وَ لَيْثٌ قَسْوَرَة

میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے۔

میں شیر نر اور اسد بیشہ شجاعت ہوں۔

جس کی کلائیاں مضبوط اور گردن موٹی ہے، جیسے جنگل کا وہ شیر جو دیکھنے میں ڈراؤنا ہوتا ہے۔

میں تم پر ایسا وار کروں گا جو جوڑ بند کو توڑ دے اور حریف کو درندوں

کا لقمہ بننے کے لیے چھوڑ دے۔

میں ایک باعزت اور طاقتور جوان کی طرح کفار کی صفوں پر تلوار چلاؤں گا اور تمہیں تلوار سے وسیع پیمانے پر قتل کروں گا۔

مرحب نے آگے بڑھ کر حضرتؑ پر تلوار کا وار کرنا چاہا مگر آپؑ نے اسے موقع نہ دیا اور پھر تاک کر تلوار اس کے سر پر ماری جو خود کو کاٹتی، سر کی ہڈی کو توڑتی ہوئی جبڑوں تک اتر آئی۔ مرحب زمین پر گرا اور گرتے ہی دم توڑ دیا۔

مرحب کے مارے جانے سے یہودیوں میں بددلی پیدا ہوگئی اور مرحب کے علاوہ چند اور بھی نامور شجاع حضرتؑ کے ہاتھ سے مارے گئے تو ان میں بھگدڑ مچ گئی اور سب کے سب قلعہ کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے، حضرت لڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، کہ ایک یہودی نے آپؑ کے ہاتھ پر ضرب لگائی جس سے سپر ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، آپؑ نے اعجازی قوت و طاقت سے ایک دروازہ اٹھا کر اسے سپر بنا لیا، یہ دروازہ اتنا وزنی تھا کہ بعد میں آٹھ آدمیوں نے اسے مل کر اٹھانا چاہا تو نہ اٹھا سکے۔ چنانچہ سیرت ابن ہشام جلد۳ ص۳۵۰ میں ہے، ابورافع کہتے ہیں: میرے ہمراہ سات آدمی تھے اور میں آٹھواں تھا، ہم سب نے پوری کوشش کی کہ اس دروازے کو پلٹیں مگر ہم اسے پلٹ نہ سکے۔

کتاب المناقب جلد۱ ص۴۴۴ میں ہے: حضرت عمر کو بھی اس پر بڑی حیرت تھی، چنانچہ انہوں نے حضرت علیؑ سے کہا کہ ''آپؑ نے اپنے ہاتھوں پر بڑا بوجھ اٹھایا'' تو آپؑ نے فرمایا: ''مَا كَانَ اِلَّا مِثْلَ جُنَّتِی الَّتِی فِی يَدِی'' مجھے اپنی سپر سے زیادہ وزنی معلوم نہیں ہوا۔

غرض یہ کیفیت دیکھ کر یہودی اس غیر معمولی مظاہرہ قوت سے متاثر ہو کر قلعہ کے اندر داخل ہوگئے، حضرتؑ نے آگے بڑھ کر قلعہ کے آہنی در کو جھٹکا دیا جس

کے دونوں پٹ اکھڑ کر آپ کے ہاتھوں میں آ گئے اور فتح نے جھوم کر آپ کے دونوں قدموں کو چوم لیا۔

یہ حیرت انگیز قوت، قوتِ روحانیہ ہی کا کرشمہ ہوسکتی ہے، ورنہ عام انسانی قوت و طاقت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی، چنانچہ تاریخ خمیس دیار بکری جلد۲ ص ۵۱ میں ہے: حضرت خود فرماتے ہیں:

''مَا قَلَعْتُ بَابَ خَيْبَرَ بِقُوَّةٍ جِسْمَانِيَّةٍ وَلٰكِنَّ بِقُوَّةٍ الٰهِيَّةٍ''

میں نے خیبر کا دروازہ اپنی جسمانی قوت سے نہیں اکھاڑا بلکہ ربانی قوت سے اکھاڑا ہے۔

بہر حال قبائل یہود جو پیغمبر خدا کے ساتھ بار بار معاہدہ امن کرنے کے بعد اسے توڑ دیا کرتے تھے اور اسلام کی بربادی پر تلے رہے ان دشمنانِ دین کی جارحانہ حرکتوں اور امن سوز سازشوں کو کچل دیا گیا، جس کے نتیجے میں حارث اور مرحب جیسے سرداران یہود موت کے گھاٹ اتر گئے، ۹۳ یہودی مارے گئے اور صرف ۱۵ مسلمان شہید ہوئے، یہودیوں کی کچھ عورتیں اسیر ہوئیں، جن میں حیی بن اخطب کی بیٹی صفیہ بھی تھیں جو آزاد ہونے کے بعد حرمِ رسول میں داخل ہوئیں اور باقی یہودیوں کو اس شرط پر رہا کر دیا گیا کہ وہ خیبر کی زمینوں پر کاشتکار کی حیثیت سے کام کریں گے اور پیداوار کا نصف حصہ خود لیں گے اور نصف حصہ مسلمانوں کو دیا کریں گے۔

اب مسلمانوں کے لیے معاشی وسعت کی راہیں کھل گئیں اور وہ مہاجرین جو مکہ سے نکلنے کے بعد فقر و افلاس سے دوچار تھے، نہ صرف معاشی اعتبار سے آسودہ ہوگئے بلکہ زمینوں اور جاگیروں کے مالک بھی بن گئے، صحیح بخاری جلد۲ ص ۴۰ میں ہے: حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں: ''فتح خیبر کے بعد ہمیں شکم سیر ہو کر کھانے کو ملا''

جبکہ ایک ام المومنین رضی اللہ عنہا کا اسی کتاب میں ارشاد ہے:

''لَمَّا فُتِحَتْ خَيْبَرُ قُلْنَا اَلْاٰنَ نَشْبَعُ مِنَ التَّمْرِ'' جب خیبر فتح ہوا تو ہم نے کہا: اب ہم پیٹ بھر کر کھجوریں کھا سکیں گے۔

یہ سب صدقہ ہے ایمانِ مجسم، امام معظم فرزند ابوطالب علی امیر المومنینؑ کی فداکاری و جاں نثاری اور ہمت و جرأت کا۔

بت شکنی ـــــ یا ـــــ تطہیر کعبہ

ایمانِ مجسم، امامِ معظم مولائے کائنات امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی باعظمت اور مقدس سیرت کا ایک اہم ترین جزو تطہیر کعبہ یا خانہ کعبہ میں بت شکنی ہے اور اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے تو اپنے ناظرین کی خدمت میں جزیرۃ العرب کی بت پرستی کے بارے میں بتائیں کہ اس کا آغاز کیسے ہوا اور اس کا خاتمہ کس طرح ہوا؟ سرزمین حجاز کے باشندے عمرو بن لُحی خزاعی نے ۲۰۷ء عیسوی میں مصرو شام کے علاقہ میں قوم ''عمالقہ'' کو بت پرستی کرتے دیکھا تو اسے بتوں کی پرستش میں اگرچہ کوئی خاص فائدہ تو نظر نہ آیا مگر ترشے ہوئے بتوں کی صنعت اسے بھا گئی۔ وہ چند بت اٹھا کر مکہ لے آیا اور انہیں خانہ کعبہ کے گرد و پیش نصب کر کے لوگوں کو بت پرستی کی دعوت دی۔ رفتہ رفتہ اہلِ مکہ کی اکثریت نے بت پرستی اختیار کر لی اور خانہ کعبہ صنم کدہ اور مکہ بت پرستی کا مرکز بن گیا، قریش کا سب سے بڑا دیوتا ''ھُبُل'' تھا جو خانہ کعبہ میں بلندی پر نصب تھا۔ اس کے آس پاس سینکڑوں بت ایک دوسرے سے جُڑے بندھے رکھے تھے۔ سال کے (۳۶۰) تین سو ساٹھ دنوں میں ایک ایک دن ایک ایک بت کی پوجا کے لیے خاص کر دیا گیا تھا۔

اہلِ مکہ کی دیکھا دیکھی اطراف و جوانب کے لوگ بھی بت پرستی کی طرف

مائل ہوگئے اور جب حج کے لیے مکہ آتے تو حرم سے پتھر اٹھا کر ساتھ لے جاتے اور انہیں مکہ کے بتوں کی صورت میں تراش کر اپنے ہاں نصب کر لیتے۔ یہاں تک کہ تمام عرب میں بت پرستی عام ہوگئی، ہر قبیلہ نے اپنے لئے علیحدہ علیحدہ بت بنا لیے۔

مکہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر مقامِ نخلہ میں عزیٰ کی مورتی نصب تھی جو قریش اور بنی کنانہ کی عقیدت کا مرکز تھی، طائف میں لات نصب تھا جو بنی ثقیف کا دیوتا تھا، مدینہ سے کچھ فاصلے پر مناۃ نصب تھا جو اوس وخزرج اور غسان کا دیوتا کہلاتا تھا، نجران میں قبیلہ ہمدان یعقوق کی پوجا کرتا تھا، ینبع کے اطراف میں بنی ہُذیل کا بت سواع نصب تھا اور دومۃ الجندل میں بنی کلب کا دیوتا وَدّ تھا، اسی طرح مختلف قبیلوں میں دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا ہوتی تھی، کچھ بت پرست ان حس وحرکت سے خالی اور فہم وشعور سے عاری پتھروں کو اللہ کا شریک کار سمجھتے تھے، ان کے سامنے گڑگڑاتے، جھولیاں پھیلاتے اور مرادیں مانگتے تھے وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ پتھر آخر پتھر ہے اس کی کیا طاقت کہ کسی کو کچھ دے سکے یا کسی سے کچھ چھین سکے۔ بعض انہیں وسیلہ مانتے ہوئے یہ کہتے کہ ہم ان کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ قرآن مجید سورہ زمر آیت نمبر۲ میں ان کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے:

''مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى''

ہم ان بتوں کو اس لیے پوجتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔

حضور سرورِ کائنات ﷺ کا مکہ پر فوج کشی کا مقصد یہ نہ تھا کہ اپنی مملکت کی حدود کو وسعت دیں اور فاتح وکشور کشا کہلائیں، بلکہ اصل مقصد بت پرستی کو مٹا کر توحید کا پرچم بلند کرنا تھا، چنانچہ مکہ کو زیرِ نگین کرنے کے بعد سے پہلے بتوں کے توڑنے کی طرف توجہ فرمائی، حالانکہ اس موقع پر یہ اندیشہ تھا کہ قریش کے بت پرستانہ جذبات بھڑک اٹھیں اور وہ اپنے بتوں کی تذلیل وتوہین دیکھ کر کہیں حملہ نہ کر دیں، مگر پیغمبر اکرمؐ

نے اپنے فرضِ منصبی کے سامنے اس خطرہ کو قابلِ اعتناء نہ سمجھا۔ پہلے دیواروں پر بنی ہوئی فرشتوں اور نبیوں کی تصویروں کو مٹایا اور پھر حضرت علیؑ کے ساتھ مل کر نیچے والے بتوں کو توڑا۔ جب نیچے والے بت توڑے جاچکے تو اوپر والے بتوں کو توڑنے کے لیے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ اے علیؑ! تم میرے کاندھوں پر بلند ہو کر بتوں کو توڑو گے یا میں تمہارے شانوں پر سوار ہو کر انہیں توڑوں، عرض کیا یا رسول اللہؐ آپؐ میرے کندھوں پر بلند ہو کر بتوں کو توڑ دیں، جب پیغمبرؐ آپؑ کے کاندھوں پر سوار ہوئے تو آپؑ نے کمزوری وضعف کا احساس کیا، پیغمبر آپؑ کے کاندھوں سے اتر آئے اور بعد میں فرمایا کہ اے علیؑ! تم میرے کاندھوں پر سوار ہو جاؤ، حضرت علیؑ دوشِ پیغمبرؐ پر بلند ہوئے اور چھوٹے موٹے بتوں کے علاوہ ہُبل کو جو آہنی میخوں سے گڑا ہوا تھا، جھٹکا دے کر اکھاڑ دیا اور زمین پر اس طرح پھینکا کہ پاش پاش ہوگیا، قریش کے لیے یہ منظر کتنا عبرت خیز ہوگا کہ کل تک جس کے آگے پیشانیاں رگڑتے رہتے تھے، اور اُحد میں جس کی جے کے نعرے لگائے تھے آج اس کے ٹکڑے پیغمبرؐ کے قدموں میں پڑے ہوئے عجز وبے بسی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

حضرت علیؑ اس صنمِ اکبر کو توڑنے کے بعد میزاب کی طرف سے نیچے اترے اور مسکراتے ہوئے پیغمبرؐ سے کہا کہ یا رسول اللہؐ میں اتنی بلندی پر سے کودا ہوں مگر کوئی چوٹ نہیں آئی، فرمایا:

''اَرْفَعَکَ مُحَمَّدٌ وَ نَزَلَ بِکَ جِبْرَائِیل''

اے علیؑ چوٹ کیوں آتی جبکہ محمدؐ نے تمہیں بلند کیا تھا اور جبرائیل امین نے تمہیں اتارا ہے۔

یہ تھی ایمان مجسم علیؑ کی رفعت و بلندی کہ جس کے ہاتھوں سے کائنات کو اوج وعروج حاصل ہوا، ان کے کاندھوں کا سہارا لے کر بلند ہوئے اور جن ہاتھوں

سے لوح محفوظ کی بلندیوں سے قرآن اترا انہی ہاتھوں سے سرزمین حرم پر اترے، گویا یہ علیؑ کی معراج تھی جو صاحبِ معراج کے کاندھوں پر ہوئی، خود حضرت کا ارشاد ہے:

''لَوْ شِئتُ لَنِلْتُ اُفُقَ السَّمَآءِ''

اگر میں چاہتا تو آسمان کی بلندیوں کو چھو لیتا۔

ع یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

اس موقع پر اور لوگ بھی موجود تھے جنہیں یہ کام سپرد کیا جا سکتا تھا یا اس میں شریک کیا جا سکتا تھا مگر پیغمبرؐ نے اس کارِ نبوت کی انجام دہی میں علیؑ کے علاوہ کسی کی شرکت کو گوارا نہ سمجھا۔ کیونکہ ایک علیؑ ہی تھے جو کبھی بتوں کے آگے نہ جھکے تھے اور ہمیشہ معبودِ حقیقی کے آگے سجدہ ریز رہتے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے افراد زندگی کے کسی نہ کسی دور میں مورتیوں کی پوجا کرتے رہتے تھے، اگر انہیں بت شکنی کا کام سپرد کیا جاتا اس میں شریک کیا جاتا تو ممکن تھا کہ بتوں پر ہاتھ اٹھانے سے گھبراتے اور انہیں توڑنے میں جھجک محسوس کرتے جیسا کہ اہلِ طائف نے مسلمان ہونے کے بعد اپنے ہاتھوں سے بتوں کو توڑنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے پیغمبرؐ کے دستِ حق پرست پر بیعت کرتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ! ہمارے بت خانہ کو ایک سال تک باقی رہنے دیا جائے مگر رسول خداؐ نے اسے منظور نہ کیا، تو کہا کہ ہم پھر اپنے ہاتھوں سے نہیں توڑیں گے کسی اور سے فرمایئے کہ وہ اسے توڑے۔

یمن میں نشرِ اسلام

۷ھ ہجری میں رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خالد بن ولید کو صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ تبلیغِ اسلام کے لیے یمن روانہ کیا، وہاں ان لوگوں نے چھ مہینے قیام کیا اور اس عرصہ میں وہاں کے باشندوں کو دعوتِ اسلام دیتے رہے مگر ان کی تبلیغی

کوششیں بار آور ثابت نہ ہوئیں۔

تاریخ طبری جلد۲ ص۳۸۹ (تین سو نواسی) میں ہے کہ براء بن عازب جو اس جماعت میں شریک تھے کہتے ہیں: ''رسول خداؐ نے خالد بن ولید کو اہلِ یمن کی طرف بھیجا تاکہ انہیں اسلام کی دعوت دیں، ان کے ساتھ جانے والوں میں میں بھی شامل تھا، وہ چھ مہینے وہاں ٹھہرے رہے مگر کسی نے کوئی بات نہ مانی''

جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے ایمانِ مجسم علی بن ابی طالب علیہ السلام کو اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے ادھر بھیجا اور فرمایا کہ خالد بن ولید اور اس کے ہمراہیوں کو واپس بھیج دو لیکن اگر کوئی اپنی مرضی سے آپ کے ساتھ رہنا چاہے تو رہ سکتا ہے۔

براء بن عازب کہتے ہیں کہ میں نے واپس آنے کی بجائے حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ رہنا پسند کیا۔

جب اہلِ یمن کو یہ اطلاع ہوئی کہ خالد اور اس کے ہمراہی واپس جا رہے ہیں اور حضرت علیؑ ایک داعی اور مبلغ کی حیثیت سے آئے ہیں تو وہ سب ایک جگہ جمع ہو گئے۔ حضرت علی علیہ السلام نماز صبح سے فارغ ہو کر ان کے ہاں گئے اور اہلِ یمن کے نام رسول خداؐ کا خط پڑھ کر سنایا، اس کے بعد اسلام کے محاسن پر ایک دلپذیر خطبہ دیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ جو لوگ خالد کی چھ ماہ کی تبلیغ سے ٹس سے مس نہ ہوئے تھے، اسلام کی خوبیوں کے معترف ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ مورخ طبری اپنی تاریخ کی جلد۲ ص۳۹۰ میں لکھتے ہیں: ''اَسْلَمَتْ هَمْدَانُ كُلُّهَا فِي يَوْمٍ وَاحِدٍ'' تمام قبیلہ ہمدان ایک ہی دن میں مسلمان ہو گیا۔

حضرت علیؑ نے رسول خداؐ کو قبیلہ ہمدان کے اسلام لانے کی اطلاع دی تو حضور پاک سجدۂ شکر بجا لائے اور تین مرتبہ فرمایا: ''اَلسَّلَامُ عَلٰی هَمْدَان'' ہمدان

پر میرا اسلام ہو۔

جنگِ صفین میں یہ قبیلہ ہمدان حضرت علی علیہ السلام کا بازوئے شمشیر زن تھا اور آپؑ ان کی جانفشانی اور معرکہ آرائیوں کو دیکھ کر فرمایا:

وَلَوْ کُنْتُ بَوَّابًا عَلٰی بَابِ جَنَّۃٍ

لَقُلْتُ لِھَمْدَانَ ادْخُلُوْا بِسَلَام

اگر میں جنت کے دروازے کا دربان ہوتا تو قبیلہ ہمدان سے کہتا

کہ سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔

چنانچہ قبیلہ ہمدان کے اسلام لانے کے بعد یمن میں اسلام کی ترقی اور فروغ کی راہیں کھل گئیں۔ لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کفر کی گھٹائیں چھٹ گئیں، آفتابِ ہدایت کی درخشندگیوں سے ظلمت کدہ کفر میں اجالا ہو گیا، ہر طرف توحید کی صدائیں گونجنے لگیں اور نسیمِ ایمان کے جھونکوں سے دل و دماغ تر و تازہ ہو گئے، جو نتیجہ ہے ایمانِ مجسم علی بن ابی طالبؑ کی خدمات کا۔

حضرت علیؑ کی ایک روزہ تبلیغ سے اہلِ یمن مسلمان ہو گئے، مگر ابھی اسلام کی تعلیمات سے پوری طرح باخبر نہ ہوئے تھے اس لیے ضرورت تھی کہ انہیں حلال و حرام کی تعلیم دی جائے اور واجبات و محرمات بتائے جائیں اور اسلامی نقطہ نظر سے ان کے مقدمات فیصل کیے جائیں، حضور سرورِ کائناتؐ نے ان امور کو سرانجام دینے کے لیے حضرت علیؑ کو دوبارہ یمن جانے کا حکم دیا، اس اہم منصب کے لیے ذہن رسا، فکرِ بلند اور تجربہ و مہارت کی ضرورت ناقابلِ انکار ہے، حضرت علی علیہ السلام کی ذہنی و فکری بلندی سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا مگر سرزمینِ حجاز سے باہر نکل کر اس طرح کے کام کا پہلا تجربہ تھا، (الاستیعاب جلد۳ ص ۳۶ میں ہے) اس عظیم ذمہ داری کے قبول کرنے میں کچھ متردد ہوئے اور پیغمبر اکرمؐ سے اس بارے میں دعا اور راہنمائی کے

طالب ہوئے، تو حضور گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ حضرت علیؑ کے سینے پر رکھا اور فرمایا:

''اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَلْبَہٗ وَ سَدِّدْ لِسَانَہٗ'' خداوندا! علیؑ کے دل کو ہدایت آشنا اور زبان کو عیب و غلطی سے پاک رکھ۔

چنانچہ ایمانِ مجسم حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: اس کے بعد مجھے دو شخصوں کے درمیان فیصلہ کرنے میں کبھی شک و تردد لاحق نہیں ہوا اور یقین و خود اعتمادی کا جوہر میرے اندر پیدا ہو گیا۔

ناظرین! اس موقع پر مہاجرین و انصار کی بڑی باعظمت شخصیتیں بھی تھیں مگر حضور اکرمؐ نے حضرت علی بن ابی طالبؑ کو جوانی کی منزل میں ہونے کے باوجود امارتِ یمن کے لیے نامزد کیا۔ اس سلسلے میں نہ کسی سے مشورہ لیا نہ کسی کی رائے دریافت کی، اس لیے کہ حضور گرامیؐ کو مکمل اعتماد اور سو فیصد وثوق تھا کہ علیؑ اس منصب کے لیے لائق ترین فرد ہیں اور جو کام انہیں سپرد کیا گیا ہے اسے باحسن وجوہ سرانجام دیں گے۔ اسی اعتماد کی بنا پر رسول خداؐ نے اپنی زندگی ہی میں امور امت کے حل و فصل، انتظام و انصرام اور فصل قضایا کا کام ان کے سپرد کیا اور زندگی کے بعد کے لیے بھی ان امور کی انجام دہی آپؑ کے سپرد کر گئے، چنانچہ مستدرک حاکم جلد۳ ص ۱۲۲ میں ہے: حضور پیغمبر خداؐ کا ارشاد ہے:

''تُبَیِّنُ لِاُمَّتِیْ مَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ بَعْدِیْ'' یا علیؑ! تم میرے بعد میری امت کے باہمی اختلاف کا تصفیہ کرو گے۔

یہاں پر یہ بات قابلِ غور ہے کہ امارت اور خلافت کے فرائض ایک سے ہیں، چنانچہ اسلامی تمدن کا تحفظ امامت نماز سے نہیں بلکہ مملکت کے نظم و انضباط اور اجرائے عدالت جیسے امور سے ہوتا ہے، جن کا تعلق امارت سے ہوتا ہے اور خلافت سے بھی، لہٰذا جسے امارت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا اہل قرار دیا تھا اسے ہی

خلافت کا اہل سمجھا جاسکتا ہے۔

غزوہ تبوک میں عدمِ شرکت اور منزلت حضرت ہارونؑ کا حصول :

غزوہ تبوک ہی ایک ایسا غزوہ ہے جس میں ایمانِ مجسم، فاتحِ بدر وحنین حضرت ولی اللہ الاعظم امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام شرکت نہ کر سکے، مگر یہ عدمِ شرکت جی چرانے یا جہاد سے پہلوتہی کرنے کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ حکمِ رسولؐ ہی یہ تھا کہ آپؑ مدینہ میں قیام فرما رہیں، ریاست کا نظم ونسق سنبھالیں اور اُن تمام امور کو سرانجام دیں جو پیغمبر خداؐ اپنی موجودگی میں انجام دیا کرتے تھے، یہ بھی جہاد کی طرح ایک فریضہ تھا جسے آپؑ نے پوری فرض شناسی کے ساتھ انجام دیا اور اپنی انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر نظم وضبط برقرار رکھا۔

پیغمبر اکرمؐ جب کسی غزوہ یا مہم پر تشریف لے جاتے تھے تو کسی کو مدینہ کا نگران مقرر کر جاتے تھے اور اسے ایک عام والی وعامل کی حیثیت دی جاتی تھی، مگر اس تقرری کی نوعیت عام حکام و والیان کی تقرری سے جداگانہ تھی، اسی جداگانہ حیثیت کو واضح کرنے کے لیے سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے دریافت کرنے پر ارشاد فرمایا: میں تمہیں مدینہ میں اس لیے چھوڑے جاتا ہوں کہ اس کا نظم و ضبط میرے یا تمہارے بغیر برقرار نہیں رہ سکتا اور تم میرے اہلِ بیتؑ اور میری امت میں میرے جانشین اور قائم مقام ہو، صحیح بخاری جلد ۳ ص ۵۴ کے مطابق حضورؐ نے فرمایا:

''اَمَا تَرْضیٰ اَنْ تَکُوْنَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسیٰ اِلَّا اَنَّهُ لَا نَبِیَّ بَعْدِی'' کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تمہیں

مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی، مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

حضرت علیؑ یہ نوید سن کر خوش ہوگئے اور رسول اسلامؐ لشکر کو لے کر سرحدِ شام کی طرف روانہ ہوگئے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ حضرت ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے یہ منزلت حاصل تھی کہ وہ ان کے وزیر، قوتِ بازو، نبوت میں شریکِ کار اور خلیفہ و جانشین تھے۔ قرآنِ مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کے سلسلے میں جو سورہ طہٰ میں ارشاد ہے:

''وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ، هٰرُوْنَ اَخِیْ. اشْدُدْ بِهٖ اَزْرِیْ. وَاَشْرِکْهُ فِیْ اَمْرِیْ''

میرے گھر والوں میں میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے اور اس کے ذریعہ میری کمر کو مضبوط کردے اور میرے کاموں میں شریک بنا۔

دوسرے مقام پر سورہ اعراف آیت ۱۴۲ میں ارشاد ہے:

'' وَقَالَ مُوْسیٰ لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ ''

موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون سے کہا: ''تم میری قوم میں میرے جانشین ہو اور امت کی اصلاح کرتے رہنا''

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو مثیلِ ہارون قرار دے کر یہ ظاہر کر دیا کہ جس طرح حضرت ہارون نبی تھے، اس لیے حضور پاکؐ نے ''لا نبی بعدی'' کہہ کر نبوت کا استثناء کر دیا، جب باستثنائے نبوت تمام مدارج وخصائص میں حضرت علیؑ کو مثیلِ ہارون قرار دیا گیا ہے تو پھر ان کے علاوہ کسی اور کو مثیلِ موسیٰ کا وارث وجانشین تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

یہ کہنا کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کو کوہِ طور پر جاتے وقت اپنا نائب
بنایا تھا، جو ایک محدود عرصہ کے لیے وقتی اور ہنگامی نیابت تھی، اسی طرح حضرت علیؑ کی
نیابت بھی وقتی تھی، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کسی اور کو نائب کیوں نہ
بنایا؟ ظاہر ہے کہ یہ انتخاب حضرت ہارون کی اہلیت اور امت پر برتری کی بنا پر تھا اور
انہی سے اس منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توقع کی جاسکتی تھی، اگر وہ
حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں انتقال نہ کر جاتے تو وہی ان کے خلیفہ و جانشین ہوتے،
اس لیے کہ جو زندگی میں اپنے کو نیابت اور قائم مقامی کا اہل ثابت کر چکا ہو، اگر وہ
زندہ رہتا تو کسی کو اس کی نیابت کے تسلیم کرنے میں عذر نہ ہوتا، اس طرح حضرت علیؑ
کی نیابت پیغمبرؐ کی زندگی ہی سے وابستہ نہ تھی کہ اسے وقتی اور عارضی کہہ کر نظر انداز
کر دیا جائے، اگر یہ نیابت وقتی اور ہنگامی ہوتی ''لا نبی بعدی'' کہنے کی ضرورت
ہی کیا تھی، اس جملہ سے صاف ظاہر ہے کہ حضور ختمی مرتبتؐ ایمان مجسم علی بن ابی
طالب علیہ السلام کو اپنی زندگی کے بعد کے لیے بھی نامزد کر رہے تھے۔

تبلیغ سورہ برائت یا پیغمبرؐ کی خصوصی نمائندگی :

بیس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا کہ سرزمین حجاز میں عرب کے مشرک
قبائل میں شرک اور بت پرستی کے خلاف اسلام کی منطق عام ہو چکی تھی۔ اس عرصے
میں ان عرب قبائل کی اکثریت بتوں اور بت پرستوں کے بارے میں اسلام کے نقطہ
نظر سے پوری طرح آگاہ ہو چکی تھی۔ وہ جان چکے تھے کہ بت پرستی صرف اور صرف
آبا و اجداد کی اندھی تقلید کے سوا کچھ نہیں ہے اور ان کے باطل معبود تو اس حد تک ذلیل
و خوار اور بدبخت و بے چارے ہیں کہ کسی کا کوئی کام بھی انجام نہیں دے سکتے، نہ کسی کو
فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، حتیٰ کہ اس قدر عاجز اور ناتوان ہیں کہ اپنے منہ پر بیٹھی

ہوئی مکھی تک کو نہیں اڑا سکتے، لہٰذا وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی پوجا پاٹ کی جائے۔
اکثر قبائل اپنے بیدار ضمیر اور روشن دل کے ساتھ اسلام کے عظیم الشان
رسولؐ کی گرانقدر گفتگو کو سن کر اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کر کے بت پرستی چھوڑ کر
آئین توحید و یکتا پرستی کو اختیار کر چکے تھے۔ خصوصاً جب مکہ فتح ہو چکا اور خانہ کعبہ کو
باطل معبودوں کے وجود سے پاک کر دیا گیا تو مذہبی مبلغین آزادانہ ماحول میں دین کی
تبلیغ اور احکام دین کے بیان کرنے کے لیے آزاد تھے۔ انہوں نے اپنے زورِ بیان
سے اسلام کا مقدس پیغام، شہر شہر، بستی بستی اور گاؤں گاؤں پہنچانا شروع کر دیا۔ یہ
مبلغین جہاں جاتے اسلام کا پیغام پہنچاتے اور وہاں کے ماحول کو بھی بتوں سے پاک
کر دیتے تھے۔ تو اس طرح سے سرزمین حجاز کے اکثر و بیشتر علاقے نعرہ توحید سے
گونج اٹھے، لیکن کچھ متعصب اور بے سمجھ ایسے بھی تھے جن کے لیے اپنی دیرینہ عادات
اور پرانی روایات کو ترک کرنا گراں گزر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے وجدان و ضمیر اور انسانی
سرشت سے دست و گریبان تھے، وہ اپنی غلط اور ناشائستہ عادتوں سے دستبردار ہونے
پر تیار نہیں تھے، ابھی تک وہ ایسے اوہام و خرافات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے
جن کی وجہ سے ہزاروں اخلاقی، اجتماعی، معاشرتی اور سماجی برائیاں جنم لے چکی تھیں۔
اسی بنا پر اب صورت حال اس بات کا تقاضا کر رہی تھی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
ہر قسم کی بت پرستی اور غیر انسانی حرکات کو سختی سے کچل دیں اور اس بارے میں اگر
ضرورت پڑے تو فوجی طاقت سے بھی کام لیا جائے، اس لیے کہ بت پرستی اخلاقی اور
معاشرتی برائیوں کا سرچشمہ ہے اور اصولی طور پر احترامِ انسانیت کی قاتل ہے، اس
سے بڑھ کر ایک اور برائی جو ان مشرکین اور کفار و بت پرستوں میں پائی جاتی تھی وہ یہ
کہ یہ لوگ خانہ کعبہ کا برہنہ حج کیا کرتے تھے اور فتح مکہ کے بعد بھی وہ حج کے لیے
آتے اور اپنے طور طریقہ پر حج بجالاتے رہتے، ان مراسم حج میں عریاں طواف کی جو

اخلاق سوز رسم تھی، اس کا انسداد ضروری تھا، چنانچہ ۹ھ ہجری کا واقعہ ہے کہ:

ایک مرتبہ ایک عورت جو ایک سے زیادہ مرتبہ طواف کرنا چاہتی تھی اور اس کے پاس کوئی دوسرا لباس نہ تھا اور وہ برہنہ طواف نہیں کرنا چاہتی تھی تو ان کافروں نے اسے برہنہ طواف کرنے پر مجبور کر دیا اور اس نے ایسا ہی کیا اور لوگ اسے دیکھتے رہے، یہ کیفیت مسلمانوں اور خود پیغمبر اسلامؐ کے لیے ناقابلِ برداشت تھی، جبکہ وہ اس وقت قدرت اور طاقت کے لحاظ سے بالادستی رکھتے تھے، لیکن پیغمبر خداؐ اس بارے میں فرمان خداوندی کے منتظر تھے کہ سورت برأت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی جس کی ابتدائی آیات کفار و مشرکین سے اظہارِ بیزاری کے سلسلے میں تھیں، تو اب حکمِ خداوندی کے پیشِ نظر انہیں روکنا ضروری ہو گیا۔

تاریخ و حدیث کی متفق علیہ حقیقت ہے کہ پہلے رسول خداؐ نے ان آیات کو حضرت ابوبکر کے سپرد کر کے مکہ روانہ کیا تا کہ وہ انہیں کفار مشرکین کو پڑھ کر سنائیں مگر جبرائیل امین اللہ کی طرف سے یہ پیغام لے کر آئے کہ ''یہ کام آپ خود کریں یا وہ کرے جو آپ میں سے ہو'' تو پھر ان کے پیچھے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے ناقہ ''عضباء'' پر سوار کر کے روانہ کیا تا کہ وہ اس عظیم الٰہی فریضہ کو انجام دیں، حضرت علیؑ تیزی سے ناقہ کو ہنکاتے ہوئے ان تک پہنچ گئے اور کہا: مجھے پیغمبرؐ نے حکم دیا ہے کہ میں وہ آیات آپ سے لے لوں، اگر آپ چاہیں تو میرے ساتھ مکہ چلیں ورنہ یہیں سے واپس ہو جائیں۔ چنانچہ کتاب جامع الاصول جلد ۹ ص ۴۷۵ میں، ابن اثیر لکھتے ہیں:

''پیغمبر اکرمؐ نے حضرت ابوبکر کو سورہ برأت دے کر بھیجا پھر انہیں واپس بلا لیا اور فرمایا کہ اس کی تبلیغ کے لیے وہ شخص مناسب ہے جو میرے گھر والوں میں سے ہو، چنانچہ حضرت علیؑ کو بلایا اور وہ آیتیں ان کے حوالہ کیں''

جبکہ مورخ طبری نے تاریخ طبری جلد ۲ ص ۳۸۳ میں اس واقعہ کو قدرے

تفصیل سے بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ نے جناب ابوبکر کو سورہ برأت کی آیتیں دے کر بھیجا اور انہیں ''امیر حج'' مقرر فرمایا، جب وہ وادی ذوالحلیفہ میں مسجد شجرہ تک پہنچے تو ان کے پیچھے حضرت علیؑ کو روانہ کیا، جنہوں نے آیتیں ان سے لے لیں، تو وہ جناب رسالت مآبؐ کے پاس واپس چلے آئے اور کہا: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! کیا میرے بارے میں کچھ نازل ہوا ہے؟ فرمایا: ان آیتوں کی تبلیغ مجھ سے متعلق ہے یا اس سے جو مجھ سے ہو''

چنانچہ رسول خداؐ نے یہ کام حضرت علیؑ کے ذمہ لگایا اور امیر المومنینؑ نے مکہ معظمہ پہنچ کر عرفات، مشعر الحرام اور منیٰ میں کھڑے ہو کر ان آیات کی تلاوت کی اور اعلان فرمایا: ''جن مشرکین نے بدعہدی کی ہے ان سے کیے ہوئے معاہدے چار ماہ کے بعد ختم ہو جائیں گے اور کوئی کافر و مشرک ایمان لائے بغیر خانہ کعبہ کے حدود میں آنے، طواف کرنے اور حج بجالانے کا مُجاز نہیں ہوگا، لہٰذا آئندہ سال کوئی کافر و مشرک یہاں نہ آئے''

اس اعلان سے کفار و مشرکین کی پیشانیوں پر بل پڑے مگر کسی کو روکنے ٹوکنے کی جرأت نہ ہو سکی، بلکہ اسلام کے تسلط اور اقتدار کے آگے بے بس ہو کر اسلام کی آڑ لینے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ مورخ طبری اپنی تاریخ جلد ۲ ص ۳۸۳ میں لکھتے ہیں:

''مشرکین ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہوئے واپس ہوئے اور کہنے لگے: اب جبکہ قریش مسلمان ہو چکے ہیں، تمہارے لیے کیا چارہ کار رہ گیا ہے؟'' چنانچہ وہ بھی مسلمان ہو گئے۔

حضرت علی علیہ السلام کا یہ اقدام اتنا آسان نہ تھا جتنا آسان نظر آتا ہے۔ مشرکین سے معاہدے ختم کیے جا رہے تھے، حج اور مسجد الحرام سے انہیں روکا جا رہا تھا، اس صورت میں ممکن تھا کہ وہ بغاوت اور سرکشی پر اتر آتے یا درپردہ سازش کر کے درپئے

آزار ہوتے۔

انہی خطرات کے پیشِ نظر حضرت رسالت مآب ﷺ ایمان مجسم حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے متفکر اور ان کی واپسی کے بڑی بے چینی سے منتظر تھے۔ جب حضرت ابوذرؓ نے آپ کی آمد کی اطلاع دی تو فکر و پریشانی دور ہوئی چہرہ مسرت سے کھل اٹھا، خوش خوش اٹھ کھڑے ہوئے اور شہر سے باہر نکل کر صحابہ کرام کے مجمع کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور انہیں ساتھ لے کر مدینہ میں داخل ہوئے۔ اس موقع پر ایک کا عزل اور دوسرے کا نصب پیغمبر خداؐ کی ذاتی رائے کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ وحی الٰہی کے تابع تھا اور قدرت کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے خالی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں یہ بھی مصلحت کارفرما رہی ہوگی کہ کام اور اس کے انجام دینے والے کی اہمیت کو نمایاں کردیا جائے اور اگر شروع ہی میں علی علیہ السلام کو بھیج دیا جاتا تو کام کی اہمیت دب کر رہ جاتی اور کہنے والے کہہ سکتے تھے کہ اس کام کے سرانجام دینے کی اہلیت علیؑ میں بھی تھی اور دوسروں میں بھی، ان میں سے کسی ایک کو تو منتخب ہونا ہی تھا اور وہ کسی وجہ سے علیؑ ہو گئے مگر ایک کے عزل اور دوسرے کے تقرر سے اور وہ بھی اس اعلان کے ساتھ کہ یہ کام نبیؐ کے کرنے کا ہے یا اس کے کرنے کا ہے جو نبی سے ہو، اس کام کی اہمیت عیاں ہوگئی اور کام کی اہمیت ہی سے کام کرنے والے کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا اور حضرت علی علیہ السلام کے ذریعے تلاوت کا یہ ماجرا مکتبِ خلفاء کی کتابوں میں بھی مذکور ہے، مثلاً مسند احمد بن حنبل، مستدرک الصحیحین، تفسیر المنار، تاریخ طبری اور تاریخ ابن کثیر وغیرہ۔

ناظرین! یہاں پر یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ حضرات نے اس ماجرا کو ''معمولی واقعہ'' کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ حضرت علی علیہ السلام کے لیے اس کی امتیازی حیثیت ثابت نہ ہونے پائے اور اس کی تاویل یہ پیش کی ہے

کہ ان آیات کی تلاوت سے حضرت علیؑ کی تالیف قلب مطلوب تھی، کوئی امتیازی خصوصیت نہیں تھی، حالانکہ کسی کے دل کو اپنانے کے لیے اسے آسان کام ذمہ لگایا جاتا ہے نا کہ مشرکین سے اظہارِ برائت کے لیے تلاوت آیات جیسا مشکل اور پرخطر کام اور وہ بھی مشرکین کے اپنے علاقے میں اور ایک ایسے شخص کے ذریعہ جس نے مختلف جنگوں میں بے شمار مشرکین کو تہہ تیغ کر کے ان کا کینہ اپنے لیے مول لے لیا ہوا اور جس کے متعلق مشرکین کے دل کینے سے بھرے ہوئے ہوں۔

ناظرین مقامِ انصاف ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذمہ یہ کام سونپا کہ فرعون کے پاس جا کر اسے توحید کی دعوت دیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: خداوندا! میں نے ان کے ایک آدمی کو قتل کیا ہوا ہے، مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس کے قصاص میں مجھے قتل نہ کردیں، میرے بھائی (ہارون) کو بھی میرے ساتھ بھیج، لیکن حضرت علی علیہ السلام نے تو مشرکین کی بے شمار تعداد کو واصلِ جہنم کیا ہوا تھا، وہ اکیلے وہاں تشریف لے گئے اور آیات برائت کو بڑے اطمینان کے ساتھ تلاوت فرمایا اور وہ بھی نہایت حساس مقامات یعنی عرفات، مشعر الحرام، منیٰ میں اور جمرہ عقبہ کے پاس۔ مولائے کائنات نے کفار و مشرکین کے سامنے جو نکات بیان فرمائے وہ یہ تھے:

۱۔ مشرکین سے اظہارِ برائت و بیزاری اور تمام قسم کے عہد و پیمان کا خاتمہ
۲۔ برہنہ حالت میں طواف پر قدغن
۳۔ خانہ خدا میں مشرکین کے داخلے پر پابندی

یہ خطرناک پیغام ایمانِ مجسم امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے بڑے اطمینان و سکون کے ساتھ مشرکین تک پہنچا کر اسلام اور مسلمین کو ہمیشہ کے لیے سرخرو اور سرفراز کردیا۔

ایمانِ مجسمؑ کی سیرت کا عملی نمونہ

مباہلہ

ایمانِ مجسم، امام معظم، امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی سیرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ کی ذاتِ گرامی دینِ اسلام کی دعوت اور تبلیغ کے لیے جہاں زبانی طور پر پیغام پہنچاتی وہاں اگر ضرورت پڑی تو عملی طور پر بھی یہ فریضہ انجام دیا، جس کا ایک جیتا جاگتا نمونہ واقعہ ''مباہلہ'' ہے، جس میں آپ کو خدا کی طرف سے ''نفسِ رسولؐ'' قرار دیا گیا، جس کا پس منظر یہ ہے کہ: ''فتحِ مکہ کے بعد غلبہ اسلام کا دور شروع ہوا اور اسلام نے جزیرہ نمائے عرب سے باہر پھیلنا شروع کیا، نجران کے عیسائی ان حالات سے نہایت پریشان تھے، چنانچہ شیعہ سنی تفاسیر اور بعض احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ ۱۰ھ میں کچھ لوگ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق بلادِ یمن کے علاقہ ''نجران'' میں تبلیغ اسلام کے فریضے کی ادائیگی کے لئے تشریف لے گئے نجران کے مسیحی پادریوں میں بے چینی پھیل گئی، ان کے ارباب حل وعقد اور سرداران قبائل ایک جگہ جمع ہو گئے اور اسلام سے بچنے کی تجاویز پر غور کرنا شروع کیا، آخر میں انہوں نے اپنے رہنماؤں ''سید'' اور ''عاقب'' کی رائے معلوم کی تو انہوں نے کہا: ''آپ لوگ دینِ محمدؐ کی حقیقت معلوم ہونے تک اپنے دین پر قائم رہیں، ہم خود یثرب جا کر اس دین کی حقیقت معلوم کرتے ہیں''

چنانچہ سید اور عاقب اپنے مذہبی پیشوا ''ابو حاتم'' کی معیت میں چودہ رکنی

وفد کے ہمراہ ستر افراد کے ساتھ یثرب روانہ ہوئے، یہ لوگ نہایت نفیس لباس زیب تن کئے نہایت تزک واحتشام کے ساتھ مدینہ میں داخل ہوئے، اہلِ مدینہ کا کہنا ہے کہ ''ہم نے اس سے پہلے ان سے زیبا ترین وفد نہیں دیکھا تھا''

جب وہ مسجد نبوی میں داخل ہوئے تو ان کی عبادت کا وقت آ گیا، ناقوس بجایا اور مشرق کی طرف رخ کر کے عبادت شروع کر دی، لوگوں نے روکنا چاہا مگر حضورؐ نے منع فرما دیا۔

یقیناً یہ آزادی عقیدہ وعمل کا بے مثال نمونہ ہے کہ مسجد نبویؐ کی چار دیواری کے اندر بھی غیر مسلموں کو اپنے مذہبی عقائد کا اظہار کرنے اور اعمال بجالانے کی اجازت دی جبکہ یہ لوگ حضور سرورِ کائناتؐ کی رسالت کے منکر تھے۔

ناظرین! یہاں ایک لمحہ فکریہ ہے کہ رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منکر تو حضورؐ کے سامنے اُنہی کی مسجد میں اپنی عبادت کر رہے ہیں اور اپنے عقیدے اور عمل کا کھلم کھلا اظہار کر رہے ہیں اور ذاتِ پیغمبر گرامیؐ ان کا دفاع کر رہی ہے، آپ نے دیکھ لیا کہ عقیدے کے معمولی اختلاف پر دیگر مسلمانوں کو ___ کافر اور ___ واجب القتل قرار دینے والے دہشت گردوں کی پالیسی اور رسول رحمتؐ کی پالیسی میں کس قدر فاصلہ نظر آتا ہے، اس کے باوجود بھی وہ خود کو مسلمان کہلاتے ہیں۔

تو بہر حال انہیں تین دن کی مہلت دی گئی تین دن کے بعد حضور نے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، تو انہوں نے کہا:

> حضرت مسیح (علیہ السلام) کے بعد آنے والے نبی سے متعلق توریت میں موجود تمام صفات آپ میں موجود ہیں، سوائے ایک صفت کے جو سب سے اہم بھی ہے، وہ یہ کہ آپ حضرت مسیحؑ کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کی تکذیب کرتے ہیں، انہیں ''عبداللہ''

یعنی خدا کا بندہ کہتے ہیں۔

مگر حضورؐ نے فرمایا:

میں مسیح کی تصدیق کرتا ہوں، ان پر ایمان رکھتا ہوں، اور گواہی دیتا ہوں کہ وہ نبی مرسل اور خدا کے بندے تھے!

انہوں نے کہا:

کیا وہ مردوں کو زندہ نہیں کرتے تھے؟ مادر زاد اندھوں کو بینائی نہیں دیتے تھے؟ اور برص کے مریضوں کو شفا عطا نہیں کرتے تھے؟

حضورؐ نے فرمایا:

''یہ سب کام باذن خدا انجام دیتے تھے''

انہوں نے کہا:

''مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوئے، بھلا کوئی بندہ بغیر باپ کے بھی پیدا ہوا؟''

حضورؐ نے ان تک اللہ کا حکم پہنچایا کہ:

اللہ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم (علیہ السلام) کی مثال جیسی ہے، اسے مٹی سے خلق فرمایا، پھر حکم دیا بن جاؤ تو وہ بن گیا۔

لیکن ارکان وفد اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے اور کسی دلیل و برہان کو تسلیم نہیں کیا، تو وحی نازل ہوئی جو سورہ آلِ عمران کی آیت ۶۱ میں ہے:

''فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَکُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَ

کُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَکُمْ. ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ''

آپ کے پاس علم آجانے کے بعد بھی اگر یہ لوگ عیسیٰ کے بارے میں آپؐ سے جھگڑا کریں تو آپ کہہ دیں آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی بیٹیوں کو بلاتے ہیں تم اپنی بیٹیوں کو بلاؤ، ہم اپنی جانوں کو بلاتے ہیں تم اپنی جانوں کو بلاؤ، پھر دونوں فریق مل کر دعا کریں، جو جھوٹا ہے اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

حضورؐ نے یہ آیت پڑھ کر حاضرین کو سنائی اور فرمایا کہ اگر تم ہٹ دھرمی پر قائم رہے تو اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارے ساتھ مباہلہ کروں۔

جونہی عیسائیوں کے نمائندہ وفد نے پیغمبر اسلامؐ سے مباہلہ کی پیشکش کو سنا تو ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگ گئے اور حیران و پریشان ہو گئے، انہوں نے آپ سے کچھ مہلت طلب کی تاکہ اس بارے میں کچھ سوچ سمجھ کر اور صلاح و مشورہ کر کے کوئی فیصلہ کریں، چنانچہ وہ آپ سے رخصت لے کر باہمی صلاح و مشورہ کرنے لگ گئے۔

وفد کے قائد نے انہیں کہا: ہمیں چاہئے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی اس پیشکش کو قبول کر لیں اور دیکھیں گے کہ اگر شور شرابے اور انبوہِ کثیر کے ساتھ لعنت کرنے آرہے ہیں، تو سمجھ لیں کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے، لیکن اگر وہ مختصر سے افراد کے ساتھ آتے ہیں، تو مباہلہ اور نفرین سے باز آجائیں اور ان کے ساتھ صلح کر کے جزیہ دینا منظور کر لیں۔

دوسری طرف رات بھر مسلمان چہ میگوئیاں اور قیاس آرائیاں کرتے رہے کہ کل رسول خداؐ ابنائنا، نسائنا، اور انفسنا کی جگہ کن کو لے کر جائیں گے؟

دوسرے دن کی صبح طلوع ہوئی اور حق و باطل میں ہمیشہ کے لیے فیصلہ کن مرحلہ آ گیا، سرکار رسالت مآب ﷺ نے حکم دیا کہ دو درختوں کی شاخوں کو کاٹ کر اوران کی درمیانی جگہ کو جھاڑو دے کر صاف کیا جائے، صبح صبح ان دونوں درختوں پر ایک سیاہ کساء یعنی چادر خیمے کی شکل میں ڈال دی گئی۔

ادھر نجرانی وفد میں سید اور عاقب اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ نکلے وفد کے دیگر ارکان یعنی قبائلی سردار بھی بہترین لباس زیب تن کئے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ان کے ہمراہ تھے۔

دوسری طرف حضرت رسول خدا ﷺ حسنین شریفین کا ہاتھ پکڑے باہر نکلے، پیچھے پیچھے حضرت فاطمہ زہراؑ اور ان کے پیچھے حضرت علی علیہ السلام تھے، اس کساء (چادر) کے نیچے ''پنج تن پاک'' تشریف فرما ہوئے اور حضور انورؐ نے فرمایا: میں دعا کروں تو تم آمین کہنا! اس کے بعد حضورؐ نے، سید اور عاقب کو مباہلہ کی دعوت دی، ان دونوں نے آپ سے عرض کی: آپ کن لوگوں کو ساتھ لے کر ہمارے ساتھ مباہلہ کررہے ہیں؟ فرمایا: ''میں اہلِ زمین کے سب سے افضل افراد کو ساتھ لے کر تمہارے ساتھ مباہلہ کررہا ہوں''

یہ سن کر وہ دونوں اپنے پادری کے پاس لوٹ گئے اور اس سے پوچھا کہ آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ تو اس پادری نے کہا:

''اِنّی لَارٰی وُجُوهًا لَوْ سَئَلَ اللّٰهُ بِهَا اَنْ یُّزِیْلَ جَبَلًا مِنْ مَکَانِهٖ لَاَ زَالَهٗ'' میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ شخص (یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) ان کو وسیلہ بنا کر خدا سے دعا کرے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو وہ ضرور ٹل جائے گا۔ خبردار ان کے ساتھ ہرگز مباہلہ نہ کرنا، ورنہ روئے زمین پر کوئی

نصرانی باقی نہیں رہے گا، چنانچہ وہ مباہلہ کی جرأت نہ کرسکے، اور اس سے ہاتھ اٹھالیا اور صلح کی پیشکش کردی کہ سالانہ دو ہزار حلے دیں گے جن میں سے ہر ایک کی قیمت چالیس درہم ہوگی اور یہ معاہدہ کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔

چوبیس یا پچیس ذی الحجہ کا دن ''روزِ مباہلہ'' قرار پایا، مقامِ مباہلہ حضرت رسالت مآب ﷺ کے دور میں شہرِ مدینہ سے باہر تھا اور اب یہ جگہ شہر کے اندر موجود ہے، اس جگہ پر ایک مسجد بنائی گئی ہے جس کا نام ''مسجد الاجابة'' ہے، یہاں سے مسجد نبویؐ اور قبرِ پیغمبر اکرم ﷺ کا فاصلہ دو کلومیٹر بنتا ہے۔ **(اللهم ارزقنا زیارته)**

ناظرین! اللہ اور اس کے رسولؐ نے ایسا کر کے قیامت تک کے لوگوں کو سمجھا دیا کہ یہی پاک ہستیاں حضرت رسالت مآبؐ کی دعوتِ حق اور ان کے اہداف و مقاصد میں ان کے شریک اور معاون و مددگار ہیں اور آپ کے ساتھ مل کر ہر قسم کا خطرہ مول لینے کے لئے ہمہ وقت تیار اور آپ کی مقدس تحریک کو آگے بڑھانے کے اہل ہیں۔

محدثین، مفسرین، مورخین اور سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضور انور ﷺ نے مباہلہ کے موقع پر حسنین شریفینؑ، علی بن ابی طالبؑ اور فاطمہ زہرا علیہم السلام کو اپنے ساتھ لیا اور صاحب تفسیر المیزان نے اسی کتاب کی تیسری جلد ص ۲۸۷ میں لکھا ہے کہ مباہلہ کا تاریخی واقعہ اکیاون صحابہ کرام سے متفقہ طور پر نقل کیا گیا ہے، تفسیر فخر رازی، تفسیرِ آلوسی اور تفسیر مراغی نیز کتاب کامل ابن اثیر جلد دوم صفحہ ۲۹۳، اسی طرح مستدرک حاکم جلد سوم ص ۱۵۰ اور مسند احمد بن حنبل جلد اول ۱۸۵، اسی طرح تفسیر روح البیان، تفسیر المنار اور تفسیر ابن کثیر اور دوسری بہت سی کتب فریقین میں اس واقعہ کو نقل کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ حضرت رسول خداؐ علی بن ابی

طالب، حضرت فاطمہ زہراؑ اور امام حسن و امام حسین علیہم السلام، مستجاب الدعوۃ تھے اور یہی چیز اہلِ بیت علیہم السلام کی عظمت کے لیے نہایت ہی معتبر سند ہے، اور کتاب ''احقاق الحق'' جلد سوم ص ۲۶ پر مکتب خلفاء کے ساٹھ بزرگ علماء کا ذکر کیا گیا ہے کہ جنہوں نے متفقہ طور پر کہا ہے کہ یہ آیت پیغمبرِ اسلامؐ اور ان کے اہلِ بیت علیہم السلام کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ہے کہ محدثین، مورخین، مفسرین اور سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضور سرورِ کائنات ﷺ نے مباہلہ کے موقع پر حضرات حسنین، حضرت فاطمہ زہراؑ اور جناب علی علیہم السلام کو ساتھ لیا، چنانچہ چوتھی صدی ہجری کے مستند عالم جناب ابوبکر جصاص لکھتے ہیں کہ: سیرت نگاروں اور مورخین میں سے کسی نے بھی اس بات سے اختلاف نہیں کیا کہ رسول خداؐ نے حسن اور حسین، فاطمہ اور علی رضی اللہ عنھم کا ہاتھ پکڑ کر نصاریٰ کو مقابلے کی دعوت دی۔

اب ہم ان چند صحابہ کرام کا ذکر کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں، جنہوں نے مباہلہ میں صرف اہلِ بیت اطہارؑ کی شرکت کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ سعد ابن ابی وقاص: ان کی روایت صحیح مسلم، جلد ۷ ص ۱۲۰ مطبوعہ مصر، مسند احمد بن حنبل جلد ۱ ص ۱۸۵ اور مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۵۰ میں ہے۔

۲۔ عبداللہ بن عباس: اس سلسلے میں امام حاکم کی کتاب ''معرفۃ علوم الحدیث'' ص ۵۰ اور تفسیر درمنثور کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ جابر بن عبد اللہ انصاری: سے دلائل النبوۃ ص ۲۹۷ اور اساب النزول ص ۴۷ میں۔

۴۔ سلمۃ بن یسوع: اپنے باپ سے اور وہ اپنے والد سے، اس کے لیے البدایۃ والنہایۃ جلد ۵ ص ۵۲، کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ سید ابن طاووس کی کتاب ''سعد السعودؒ'' میں ہے کہ میں نے کتاب ''مانزل من القرآن فی النبیؐ واہلِ بیتہ'' تالیف محمد بن عباس بن مروان میں دیکھا ہے کہ انہوں نے پچاس سے زائد صحابیوں سے حدیث مباہلہ کو روایت کیا ہے ان میں سے حسن بن علی علیہ السلام، عثمان بن عفان، سعد ابن ابی وقاص، بکر بن سمال، طلحہ، زبیر، عبد الرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن عباس، ابورافع، جابر بن عبداللہ انصاری، براء بن عازب اور انس بن مالک قابلِ ذکر ہیں۔

علامہ جاراللہ زمخشری نے اس جگہ پر ایک اہم نکتہ بیان فرمایا ہے کہ ''نسائنا'' اور ''انفسنا'' میں ایک ایک ہستی حضرت فاطمہ زہراؑ اور حضرت علی علیہ السلام پر اکتفا کی گئی ہے لیکن ''ابنائنا'' میں ایک ہستی پر اکتفا نہیں ہے، اس لئے کہ فاطمہ اور علی علیہما السلام کی کوئی نظیر نہیں تھی لہٰذا ان کے ساتھ کسی اور کیلئے کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن ''ابنائنا'' میں دو ہستیاں ایک دوسرے کی نظیر تھیں لہٰذا یہاں دونوں کو بلایا گیا ہے۔

یہاں پر ایک بات قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ بعض اردو مترجمین نے اس آیت میں ''انفسنا'' کا یہ ترجمہ کیا ہے ''آؤ ہم تم خود بھی آجاتے ہیں'' حالانکہ آیت میں ''آنے'' کا نہیں بلکہ ''بلانے'' کا ذکر ہے، اور انسان کبھی اپنے آپ کو نہیں بلایا کرتا، اور حقیقت یہ ہے کہ حضور پاکؐ نے ''انفسنا'' کی جگہ علی علیہ السلام کو بلایا جس پر سب کا اجماع ہے، لہٰذا علی علیہ السلام ہی ''نفس رسول'' ہیں۔

اگر نفس سے مراد خود رسول اللہ ﷺ ہیں تو حسنین شریفین اور حضرت زہرا علیہم السلام کو ساتھ لے جانے سے حکم کی تعمیل ہوجاتی اور علی علیہ السلام کو ساتھ لے جا کر پیغمبرِ خدا نے ثابت کردیا کہ ''علیؑ نفسِ رسولؐ'' ہیں۔

مفسر ''اسباب النزول'' نے اسی کتاب کے صفحہ ۷۵ میں ''شعبی'' کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''ابنائنا'' میں حسنؑ و حسینؑ ہیں اور ''نسائنا'' سے مراد فاطمہ زہراؑ ہیں اور

''انفسنا'' سے مراد علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔

جبکہ خود حضرت علی علیہ السلام نے شوریٰ کے موقع پر ان الفاظ کے ساتھ استدلال فرمایا، جیسا کہ صواعق محرقہ میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

''اُنْشِدُکُمُ اللّٰہَ ھَلْ فِیْکُمْ اَحَدٌ جَعَلَہُ اللّٰہُ نَفْسَ النَّبِیِّ وَ اَبْنَآئَہُ اَبْنَآئَہُ ، وِ نِسَائَہُ نِسَآئَہُ غَیْرِی، قَالُوا اللّٰھُمَّ لَا ''

تمہیں خدا کی قسم! مجھے یہ بتاؤ کہ کیا میرے علاوہ اور کوئی ایسا فرد موجود ہے جسے اللہ نے نفس رسولؐ قرار دیا ہو، جس کے بیٹوں کو رسول خدا ﷺ کے بیٹے اور جس کی خواتین کو رسول خداؐ کی خواتین قرار دیا ہو؟ لوگوں نے کہا: ''نہیں!''

اس روایت سے مولانا تھانوی کی ''بیان القرآن'' جلد ا ص ۲۰۰ میں یہ توجیہ غلط ثابت ہوگئی کہ ''حضرت علی (علیہ السلام) ''ابنائنا'' میں شامل ہیں''

اس آیت سے استفادہ کے لیے ہمیں بہت سے نکات ملتے ہیں: مثلاً

ا۔ ''ابنائنا'' کے کلمہ سے ثابت ہوا کہ حسنین شریفین اولادِ رسولؐ ہیں، یہی وجہ ہے حضور سرور کائناتؐ فرماتے ہیں: عام لوگوں کی نسل کا سلسلہ ان کے بیٹوں سے چلتا ہے اور میری نسل کا سلسلہ میری بیٹی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے چلتا ہے۔

۲۔ دین کی بنیاد اور بقا کا دارومدار صرف مذکورہ چند افراد پر ہے، ورنہ پیغمبر خدا اکیلے بھی نصرانیوں کے ساتھ مباہلہ کر سکتے تھے کیونکہ موضوع ''عیسائیت اور پیغمبر اسلام کی ذات'' تھا اور حضرت علی، حضرت فاطمہ زہرا حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہم السلام کے ساتھ براہِ راست ان کا تعلق نہیں تھا، لیکن

اللہ اور رسولؐ نے ایسا کر کے قیامت تک کی آنے والی نسلوں کو سمجھا دیا کہ یہی لوگ رسول خدا ﷺ کی دعوتِ حق اور ان کے اہداف و مقاصد میں ان کے شریک اور معاون و مددگار ہیں، اور آپ کے ساتھ مل کر ہر قسم کا خطرہ مول لینے کے لیے ہر وقت تیار اور حضورؐ کی تحریک کو آگے بڑھانے کے اہل ہیں۔

اور پھر یہ کہ ابنائنا، نسائنا اور انفسنا میں جمع ہونے کی وجہ سے مفہوم کے اعتبار سے بہت وسعت اور بڑی گنجائش تھی کہ حضور اصحاب وانصار بلکہ خود بنی ہاشم کے بہت سے بچوں کو ''ابنائنا'' کے تحت اور جلیل القدر خواتین کو ''نسائنا'' کے تحت اور بہت سی قد آور شخصیات کو ''انفسنا'' کے تحت اس تاریخ ساز مباہلے میں شریک فرماتے، لیکن ابنائنا میں صرف حسنین شریفین، نسائنا میں صرف حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور انفسنا میں علی علیہ السلام کو شامل فرمایا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت اسلام میں ان ہستیوں کے ساتھ خاص ربط ہے اور یہی ہستیاں ارکان دین میں شامل ہیں۔

یہاں پر ایک نکتہ نہایت ہی قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ کہ: ''علی الکٰذبین'' ''جھوٹوں پر لعنت'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مباہلہ کے دونوں فریق اپنا اپنا دعویٰ رکھتے تھے جس میں ایک فریق ''صادق'' یعنی سچا اور دوسرا ''کاذب'' یعنی جھوٹا ہوگا، اور ''نجعل'' صیغہ جمع سے معلوم ہوا کہ حضور کے ساتھ دیگر افراد بھی ہیں جو اس دعویٰ میں شریک اور دعوائے حقانیت میں حصہ دار ہیں، یہ ان ہستیوں کیلئے بڑی فضیلت ہے جو اس مباہلہ میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شریک ہیں۔

''کاذبین'' لعنت کے مستحق قرار پاتے ہیں، جبکہ ''صادقین'' پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے اور میدانِ مباہلہ میں خداوند عالم نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ ''صادقین'' کا تعارف کرایا ہے کہ اگر کہیں تمہیں ''صادقین'' کے ساتھ رہنے کا حکم

ملے تو بڑے اطمینان کے ساتھ انہی کی خدمت میں آجانا کیونکہ میرے نزدیک یہی "صادقین" ہیں۔

اس کے پیشِ نظر جب ہم سورہ توبہ کی آیت ۱۱۹ کی تلاوت کرتے ہیں کہ "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین یعنی سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ "الصادقین" سے مراد علی علیہ السلام ہیں، اور یہی روایت ابن عساکر نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کی ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ حقیقی معنوں میں "صادق" وہ ہوتا ہے جس سے کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہوا ہو جو اس کے ایمان اور عقیدے کے خلاف ہو اور اسے ہی معصوم کہتے ہیں، اسی وجہ سے فخر الدین رازی نے اس آیت سے یہ سمجھا ہے کہ معصوم کی اتباع واجب ہے اور ہر زمانے میں ایک معصوم کا ہونا لازمی ہے، ورنہ "کونوا مع الصادقین" کا حکم بے معنی ہو جاتا ہے، مگر وہ آگے چل کر اس معصوم کی تلاش میں راہ گم کر جاتے ہیں۔

فریقین کی روایات کے مطابق "صادقین" سے مراد حضرات محمد و آل محمد علیہم السلام ہیں اور صادقین (سچوں) کے ساتھ دوستی، ہم نشینی اور ہمراہی تربیت کے اہم عوامل میں سے ہے۔ جو انسان کو گمراہی سے بچانے کا موجب ہوتی ہے، اور ہمیں حکم ہے کہ الٰہی پیشواؤں کی معیت کو کبھی نہ چھوڑو، اس بنیاد پر کہ صادقین سے مراد خدا کے معصوم امام اور رہبر ہیں، اور معاشرہ کا ارتقاء، ایمان، تقویٰ اور معصوم رہبر کی اطاعت پر منحصر ہے، خدائی رہبر معصوم ہوتے ہیں ورنہ خدا، ان کے ساتھ رہنے کا حکم نہ دیتا اور ہر دور میں ایک معصوم رہبر کا ہونا ضروری ہے تاکہ مسلمان اس کے ساتھ رہیں۔

حجۃ الوداع

۶ھ میں پیغمبر اسلام مدینہ منورہ سے عمرہ کے ارادے سے نکلے مگر قریش سدِّ راہ ہوئے اور آپؐ حدیبیہ کے مقام پر مشرکین سے صلح کرنے کے بعد واپس مدینہ پلٹ آئے اور مکہ پہنچ کر عمرہ بجا نہ لا سکے، ۷ھ میں پھر عمرہ کے لیے تشریف لے گئے مگر قریش سے معاہدہ کی بنا پر تین دن تک مکہ میں قیام نہ کر سکے۔

۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور بتوں سے خانہ کعبہ کی تطہیر عمل میں آئی، ۹ھ میں حضرت علیؑ کو سورہ برائت کی آیتیں دے کر رسوم حج کو شرک کی آلودگیوں سے پاک کرنے کے لیے بھیجا، انہوں نے مشرکین سے بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان کر کے انہیں حرم کعبہ میں آئندہ کے لیے قدم رکھنے سے منع کر دیا، 10ھ میں ادائے حج کا قصد فرمایا اور دعوتِ حج کی صدا تمام اطراف و اکناف عالم میں گونج اٹھی۔ یہ ہجرت کا دسواں سال تھا اور یہی سال بعد میں رسول اسلامؐ کی زندگی کا آخری سال ثابت ہوا۔ اسی سال کے آخر میں یہ حج ہوا جس کے بعد پیغمبر خداؐ بہت کم مدت کے لیے دارِ دنیا میں زندہ رہے، اسی لیے حج کا نام بعد میں "حجۃ الوداع" مشہور ہو گیا، کتاب اعیان الشیعۃ جلد ۲ ص ۳۲۹ میں ہے کہ مورخ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ اس کے بعد آپ کو پھر کوئی حج کرنے کا موقع نہیں ملا تو گویا آپ کی کعبہ سے رخصت تھی یا یہ کہ حضورؐ نے مسلمانوں کو "الوداع" کہا اور یہ اطلاع دی کہ اب میں دنیا سے جانے والا ہوں۔

پیغمبر اکرمؐ کے ارادوں اور تیاری پر ہر سمت سے مسلمان کثیر تعداد میں مدینہ پہنچ گئے تاکہ حضورؐ کے ہمراہ فریضہ حج ادا کر سکیں اور آداب و احکام حج سیکھیں، حضور پاکؐ ۲۶ ذی قعدہ کو ہزاروں مسلمانوں کے جلو میں مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے،

حضرت سیدہ طاہرہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور حضور کی ازواج مطہرات بھی اس سفر میں شریک تھیں۔

ایمانِ مجسم حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ یمن ہی میں تھے کہ سرکار رسالت مآبؐ نے انہیں تحریر فرمایا کہ وہ مکہ پہنچ کر حج میں شریک ہوں، آپ اپنے دستہ سپاہ کے ساتھ وہاں سے چل دیئے اور وادی یلملم سے احرام باندھ کر حضورؐ کے مکہ وارد ہونے سے پہلے ان کی خدمت میں پہنچ گئے، پیغمبر خداؐ نے آپ کو دیکھا تو چہرہ فرطِ مسرت سے دمک اٹھا۔

حضرت علی علیہ السلام نے یمن کی تمام روداد اور جزیہ اور غنائم وصدقات کی تفصیل بیان کی، عرض کیا: اموال وغنیمت و جزیہ نگرانِ لشکر کے سپرد کر کے شوقِ زیارت میں پہلے چلا آیا ہوں، رسول خداؐ نے فرمایا: ''تم اپنے ہمراہیوں کے پاس جاؤ اور انہیں لے کر جلد مکہ پہنچ جاؤ'' چنانچہ حضرت علی علیہ السلام رخصت لے کر واپس پلٹے، ابھی تھوڑا راستہ طے کیا ہوگا کہ لشکر کو آتے دیکھا، جب وہ لوگ قریب پہنچے تو دیکھا کہ سب نے بندھی ہوئی گٹھڑیوں میں سے نئے کپڑے نکال کر احرام باندھ رکھے تھے، آپؑ نے نگرانِ لشکر سے پوچھا کہ تم نے میری اجازت کے بغیر یہ کپڑے کیوں تقسیم کیے؟ کہا: ان لوگوں نے مجھے اصرار کیا تھا کہ یہ کپڑے انہیں دے دیئے جائیں اور بعد میں واپس کر دیں گے، فرمایا: ''انہیں حضرت رسول پاکؐ کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے استعمال میں نہیں لایا جا سکتا، پھر حکم دیا کہ ان کپڑوں کو اتار کر بحفاظت رکھ دیا جائے۔

(تاریخ طبری جلد۲ ص۴۰۲) میں ہے: لوگوں نے کپڑے اتار تو دیئے مگر انہیں یہ بات ناگوار گزری۔ جب پیغمبر اسلام کی خدمت میں پہنچے تو ایمانِ مجسم حضرت امیرؑ کا گلہ شکوہ کیا، حضور پاکؐ نے کھڑے ہو کر فرمایا:

''اَیُّهَا النَّاسُ ! لَا تَشْکُوا عَلِیًا فَوَاللّٰہِ اِنَّهُ لَا خُشَن فِی ذَاتِ اللّٰہِ اَوْ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ'' اے لوگو! علیؑ کے بارے میں گلے شکوے کے لیے لب کشائی نہ کرو، وہ اللہ کے بارے میں بہت سخت گیر ہیں۔

جب حضرت رسالت مآب ﷺ مکہ معظّمہ پہنچے اور خانہ کعبہ کا طواف اور صفا ومروہ کے درمیان سعی فرما چکے تو حکمِ الٰہی نازل ہوا: (وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰہِ..................)

ناظرین کی خدمت میں عرض کرتے چلیں کہ حجۃ الوداع سے پہلے دو حج ہوتے تھے ایک حجِ قران اور دوسرا حجِ اِفراد، ان دونوں میں ''عمرہ'' ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے جو اعمال حج بجالانے کے بعد بجالایا جاتا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ حجِ قران میں قربانی کے جانور ساتھ ہوتے ہیں اور حجِ افراد میں قربانی کے جانور ساتھ نہیں ہوتے، اب اس موقع پر سورہ بقرہ کی آیت ۱۹۶ ''وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰہِ'' اللہ کے لیے حج اور عمرہ پورا کرو، نازل ہوئی تو ایک تیسری قسم کا اضافہ ہوگیا جسے ''حج تمتع'' کہتے ہیں، اس حج میں عمرہ حج ہی کا ایک جزو ہوتا ہے، جو ایامِ حج میں اس سے پہلے بجالایا جاتا ہے، اس حج کو ''تمتع'' اس لیے کہتے ہیں کہ عمرہ اور حج کے درمیان وقفہ میں احرام کے قیود اٹھ جاتے ہیں اور جو چیزیں احرام کی حالت میں جائز نہیں ہوتیں ان سے تمتع کیا جا سکتا ہے یعنی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، یہ حج ان لوگوں کے لیے ہے جو مکہ معظّمہ سے اڑتالیس میل یا اس سے زیادہ فاصلے پر رہتے ہیں، جبکہ حج قران و افراد اس فاصلے کے اندر رہنے والوں کے لیے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے ''حج تمتع'' کا قانون نافذ ہوا اور سرکار رسالت مآبؐ نے اعلان فرمایا: ''بس اب عمرہ حج کا جزو بن

گیا''۔ دریافت کیا گیا، یہ حکم اسی سال ہے یا ہمیشہ کے لیے ہے؟ تو حضرت نے زور دے کر کئی دفعہ فرمایا: ''ہمیشہ کے لیے ہے، عمرہ حج کا جزو قیامت تک کے لیے ہے''

مگر اس کے باجود بعض لوگوں کے دل کو یہ بات اس وقت اچھی نہیں لگی اور اس پر معترضانہ جملے زبان پر لائے جس پر پیغمبر خداؐ نے فرمایا: ''تم اس حکم پر کبھی ایمان نہیں لاؤ گے''

حج کی تفصیل:

تاریخ اسلام علامہ علی نقی مرحوم ص ۴۹۰ میں ہے: چونکہ اس سے پہلے دور رسالت میں حج نہیں ہوا تھا اور اس کے بعد رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی زندگی میں حج کا موقع ملا، اس لیے اس حج کی کیفیت کو راویوں نے پورے جزئیات کی تفصیل کے ساتھ محفوظ کیا اور ایک دوسرے سے بڑے وجد وکیف کے ساتھ بیان کرتے رہے اور پھر محدثین نے اپنی کتابوں میں اسی تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔

یہاں پر ہم اس کی مفصل کیفیت کو علامہ ابن عربی کی کتاب ''محاضرۃ الابرار'' مطبوعۃ مصر جلد ا ص ۱۹ سے نقل کرتے ہیں: ''رسول خداؐ مکہ کے قصد سے شجرہ کی راہ سے روز پنجشنبہ (جمعرات) ۲ ذیقعدہ ۱۰ھ کو روانہ ہوئے اور شجرہ کا یہ راستہ وہی ہے جس میں اب مدینہ سے نکل کر ''بیر علیؑ'' کے مقام پر حجاج احرام باندھتے ہیں اور یہی اہلِ مدینہ کا میقات ہے جس کے آگے بڑھنا احرام کے بغیر جائز نہیں ہے'' اس منزل پر آکر حضرتؐ نے نماز عصر پڑھی اور رات کو جو شبِ جمعہ تھی یہیں قیام فرمایا اور چونکہ یہیں احرام باندھ چکے تھے لہٰذا اب جو حضرتؐ اس منزل سے آگے بڑھنے لگے تو ''لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ ......'' کی صدا بلند کی جس پر ان ہزاروں آدمیوں نے جو آپ کی معیت میں تھے آپ کی پیروی کی اور دور دور تک وادیاں بارگاہِ الٰہی میں

حاضری کے اس اعلان سے گونج اٹھیں اور یوں ہی حضرت ''لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ'' کی صداؤں کے ساتھ آگے بڑھتے گئے، یہاں تک راستے ہی میں حضرتؐ کی روانگی کے آٹھویں دن شب پنجشنبہ ماہ ذی الحجہ کا چاند نمودار ہوا، اس کے بعد راستہ طے ہوتا رہا یہاں تک کہ شب یکشنبہ (اتوار کی رات) چار ذی الحجہ کو حضرت نے ''ذی طوی'' میں رات گزاری اور نماز صبح پڑھ کر روانہ ہوئے اور اسی اتوار کو صبح دن چڑھے مکہ معظّمہ میں داخل ہو گئے، حجر اسود کا استلام فرمایا اور سات مرتبہ کعبہ کا طواف فرمایا اور ہر مرتبہ آپ طواف میں حجر اسود اور رکن یمانی کا استلام فرماتے۔

غرض خانہ کعبہ کے تمام اعمال مکمل کر لیے، پھر پنجشنبہ (جمعرات) کے دن صبح کے وقت روز ترویہ یعنی آٹھ ذی الحجہ آپ تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ تشریف لے گئے اس طرح کہ اسی دن کی نماز ظہر منیٰ میں پڑھی، پھر شبِ جمعہ وہیں قیام فرما کر نماز صبح وہیں ادا فرمائی اور رروز عرفہ 9 ذی الحجہ کو جب سورج بلند ہو چکا تو اس وقت عرفات کی طرف روانہ ہوئے، وہاں پر آپ کے حکم سے آپ ہی کے لیے مقامِ نمرہ میں خیمہ نصب کر دیا گیا، حضورؐ نے اس قیام میں فرمایا۔ جب زوال آفتاب ہو گیا تو اپنے ناقہ ''قصوی'' کے تیار کرنے کا حکم دیا، چنانچہ وہ تیار ہو گیا اور حضور اکرمؐ اس میدان کے وسط میں تشریف لائے جس کے گرد و پیش تمام مسلمان مقیم تھے اور پشت ناقہ پر سے حضرت نے اس پورے مجمع کو مخاطب فرمایا، آپ کی چچی ام الفضل زوجہ عباسؓ نے اس وقت ایک پیالہ دودھ کا بھیجا جسے آپ نے اسی حالت میں ناقہ کی پشت پر نوش فرمایا، جس سے تمام مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا کہ آج آپ روزے سے نہیں ہیں۔ جب خطبہ پڑھ چکے تو ناقے سے اترے اور بلال کو حکم اذان دیا، چنانچہ اذان ہوئی، مسلمان نماز کے لیے صف بستہ ہو گئے اور بلال ہی نے اقامت کہی، جس کے بعد ظہر کی نماز ہوئی۔ پھر فوراً ہی حضرتؐ نے بلال کو دوسری دفعہ کی اقامت کا حکم دیا اور

اسی وقت عصر کی نماز ہوئی، ظہر اور عصر کے درمیان کسی دوسری نماز کا فاصلہ حضرت نے نہیں کیا، علامہ ابن عربی کے الفاظ یہ ہیں: ''فَصَلَّاهُمَا عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالنَّاسِ مَجْمُوعَتَيْنِ فِي وَقْتِ الظُّهْرِ بِاَذَانٍ وَّاحِدٍ لَهُمَا مَعًا بِاِقَامَتَيْنِ وَ لِكُلِّ صَلٰوةٍ اِقَامَةٌ'' یعنی یہ دونوں نمازیں حضرت نے باجماعت ایک ساتھ ظہر کے وقت میں ایک اذان کے ساتھ جو دونوں کے لیے تھی اور دو اقامتوں کے ساتھ کہ ہر نماز کے لیے اقامت الگ تھی ادا فرمائیں۔ (محاضرۃ الابرار جلد اول ص ۲۱ مطبوعہ مصر)

یہی وہ ترکیب نماز ہے شیعہ جس کے عمومی طور پر پابند ہو گئے ہیں، پھر حضرت اپنے مرکب پر سوار ہوئے اور وہیں تشریف لائے جہاں کھڑے ہوئے تھے، یہاں تک کہ جمعہ کا آفتاب غروب ہوا، اب یہاں ایک جملہ قابلِ توجہ ہے کہ غروب کے بعد لکھا ہے: ''وَ ذَهَبَتِ الصُّفْرَةُ'' یعنی صرف آفتاب کے غروب ہونے پر اکتفا نہیں فرمائی بلکہ انتظار کیا کہ زردی دور ہو جائے اور زردی کے لفظ کی تعبیر یہ ہے ''حمرہ مشرقیہ'' کے دور ہونے کی جسے شیعہ غروب آفتاب کا معیار قرار دیتے ہیں۔

اب حضرت روانہ ہوئے اور 10 ذی الحجہ کی رات کو کافی وقت گزرنے پر مزدلفہ پہنچے جسے مشعر الحرام بھی کہتے ہیں، جبکہ مغرب کی نماز کا جو عام طور پر وقت سمجھا جاتا ہے گزر چکا تھا، چنانچہ عشاء کے وقت میں مغرب اور عشاء کی نمازیں اُسی طرح ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ پڑھیں۔

اس طرح اس حجۃ الوداع کے تاریخی موقع پر حضور انورؐ نے ''جمع بین الصلوتین'' کی دونوں صورتوں پر عمل کر کے دکھا دیا، یعنی نماز ظہر کے وقت میں اس کے ساتھ عصر کی نماز اور پھر نماز عشا کے وقت میں اسی کے ساتھ مغرب کی نماز، جس سے یہ اصول ثابت ہو گیا کہ شروع اور آخر کے بس ذرا سے وقت کو چھوڑ کر جو عقلی طور پر پہلی اور آخری نماز کا مخصوص وقت ہے، باقی تمام وقت دونوں کا مشترک وقت ہے،

یہ اور بات ہے کہ فضیلت کے لحاظ سے اس میں ایک حصہ ظہر سے نسبت رکھتا ہے اور ایک حصہ عصر سے، اسی طرح غروب کے بعد ایک حصہ مغرب سے اور اس کے بعد کا حصہ عشاء سے، مگر اس درمیان کے وقت کے ہر جزء میں نماز ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء کا ہونا درست ہے جو ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام کے ارشادات سے ثابت ہے۔

مشعر الحرام میں رات کے گزارنے کے بعد روز عید صبح کے وقت منیٰ میں آئے اور جمرہ عقبہ پر رمی کرنے کے بعد قربانی کے تیس اونٹ اپنے ہاتھ سے نحر کئے اور بقیہ اونٹوں کے نحر کرنے پر حضرت علی علیہ السلام کو مامور فرمایا۔ جب اونٹ نحر ہو چکے تو ہر اونٹ میں سے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لے کر دیگ میں پکوایا اور حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ مل کر اس میں سے کچھ کھایا اور باقی تقسیم کروایا۔

قربانی سے فارغ ہو کر سر منڈوایا اور احرام کھول دیا اسی دن مکہ معظّمہ پہنچ کر کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی بجالائے اور منیٰ میں واپس آ گئے، جہاں ۱۳. ذی الحجہ تک قیام فرمایا اور رمی جمرات کا فریضہ ادا کیا، جب اعمال حج سے فارغ ہو گئے تو 4 ذی الحجہ کو مسلمانوں کے ساتھ مدینہ روانہ ہو گئے۔

واقعہ غدیر خم

ناظرین! جس طرح اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ایمان مجسم، امام معظم، حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی پاکیزہ سیرت کے مختلف پہلو ہیں ان میں سے ایک عملی پہلو بھی ہے اور وہ ہے ''واقعہ غدیر خم''

واقعہ غدیر خم ایمانِ مجسمؑ کی سیرت کا ہی اہم حصہ نہیں بلکہ تاریخ اسلام کا اہم ترین واقعہ بھی ہے، جس پر دین کی تکمیل، نعمتوں کی تحصیل، اسلام کی پسندیدگی اور رسالت کی قبولیت کا دارومدار ہے اور اس کی بنیاد اس وقت رکھ دی گئی جب حضور

سرور کائنات ﷺ نے حکمِ پروردگار سے اپنے سب سے پہلے پالیسی ساز خطاب سے اسلام کی تبلیغ کا آغاز فرمایا تھا، چنانچہ جب سورہ شعراء کی ۲۱۴ ویں آیت نازل ہوئی کہ ’’وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ‘‘ اے رسولؐ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو تنبیہ کیجیے، انذار کیجئے، خبردار کیجئے، ڈرایئے اور تبلیغ کیجئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ متعدد راویوں نے یہ واقعہ خود حضرت علی علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ دعوت ذوالعشیرہ کے موقع پر حضرت رسول خداؐ نے اپنے قبیلے کے عزیزوں سے فرمایا:

’’اے اولادِ عبدالمطلب! قسم بخدا میں نہیں جانتا کہ عربوں میں سے کسی نے اس چیز سے کوئی بہتر چیز پیش کی ہو جو میں پیش کرتا ہوں، میں تمہارے لیے دنیا و آخرت کی بہتری لے کر آیا ہوں، اللہ نے مجھے یہی حکم دیا ہے کہ میں تمہیں دعوت دوں، تم میں سے کون ہے جو اس معاملہ میں میرا ساتھ دے گا؟‘‘

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ’’یا رسول اللہ! میں آپ کا ساتھ دوں گا‘‘ حالانکہ میں عمر میں سب سے چھوٹا تھا، اس وقت لوگ ہنستے ہوئے چلے گئے، اس بات کو تفسیر درمنثور میں بیان کیا گیا ہے، اور معالم التنزیل ج ۴ ص ۲۷۸، تفسیر طبری ج ۱۹ ص ۷۴، سنن نسائی ج ۶ ص ۲۴۸ مختلف الفاظ کے ساتھ تفسیر مظہری ج ۸ ص ۳۷۰ میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی پیشکش کے جواب میں فرمایا: ’’یا علیؑ! تو میرا وارث، میرا وزیر اور میرا خلیفہ ہے‘‘

چنانچہ آج کے عہد و پیمان کے نتیجہ میں حضرت علی علیہ السلام نے نصرتِ رسولؐ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی علی علیہ السلام کے بطورِ وارث، وزیر اور خلیفہ کے تعارف کے لیے ہر مناسب موقع پر اعلان فرمایا، حتیٰ

کہ معراج کے موقع پر بھی خداوند عالم نے اپنے محبوب پیغمبرؐ سے اس بارے میں گفتگو فرمائی، لہٰذا حضور پیغمبر خداؐ کبھی چادرِ تطہیر کے اندر، کبھی معرکہ ہائے کارزار میں، کبھی مکہ کی فتح کے دن بت شکنی کے موقع پر، کبھی مباہلہ کے میدان میں کبھی اشاروں کنایوں میں اور کبھی واشگاف الفاظ میں بتاتے رہے کہ علیؑ ہی میرے وارث، میرے وزیر اور میرے بعد میرے خلیفہ ہیں۔

آخرکار آپ کی زندگی کے آخری ایام اور نبوت کے 23 ویں برس پروردگارِ عالم کی طرف سے

18 ذی الحجہ 10ھ بروز جمعرات حجۃ الوداع کی ادائیگی کے بعد حضرت رسول اللہؐ جب ’’غدیر خم‘‘ نامی جگہ پر پہنچے تو سورہ مائدہ کی آیت ۶۷ نازل ہوئی:

’’یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ . وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ . وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ . اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ‘‘ اے رسولؐ! جو آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے، اسے پہنچا دیجئے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا، بے شک اللہ کافروں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

چنانچہ یہ حکم ربی پا کر آپؐ نے آگے نکل جانے والوں کو جو مقام جُحفہ کے قریب پہنچ چکے تھے واپس بلایا اور آنے والوں کا انتظار کیا اور یہ وہ جگہ ہے جہاں پر پانی کا چشمہ بھی تھا اور کچھ درخت بھی، جو حجاز کی گرمی سے کچھ بچاؤ کا ذریعہ تھے اور پھر یہ کہ مکہ معظّمہ اور خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے آنے والے کاروانوں کے لیے مختلف ممالک مثلاً یمن، عراق، شام، حبشہ اور مدینہ کے راستے یہیں سے الگ ہوتے تھے۔

حضور پاکؐ نے اونٹوں کے پالانوں کا منبر بنانے کا حکم دیا، جب سب لوگ جمع ہو گئے جو کم از کم ایک لاکھ کی تعداد میں تھے آپ منبر پر تشریف لے گئے اور نہایت فصیح و بلیغ انداز میں ایک طولانی خطبہ ارشاد فرمایا: جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اہم ترین مسئلہ درپیش ہے، جس کے لیے ایک طویل خطبہ ارشاد فرمانے کی ضرورت پیش آئی ہے، جبکہ جھلسا دینے والی تپش، فضا میں زبردست گرمی، زمین اس قدر گرم کہ پاؤں کے نیچے اور سروں کے اوپر عباؤں اور چادروں سے کام لینا پڑا اور طولانی خطبہ سننا پڑا۔

خطبہ میں سب سے پہلے حمد و ثنائے ربِ جلیل، پھر توحید کی گواہی اور تبلیغِ نبوت اور قیامت کی گفتگو جو روزمرہ کا معمول تھا، کوئی نئی بات نہیں تھی نئی بات یہ تھی آپ نے اپنی رحلت کی خبر ان کو سنائی کہ عنقریب میں تم سے جدا ہونے والا ہوں، اپنے بارے میں ان کے نظریہ کو معلوم کیا کہ میں نے حقِ رسالت ادا کیا یا نہیں؟ سب نے اچھے لفظوں کے ساتھ آپ کی ۲۳ سالہ زندگی کی محنتوں، مشقتوں، زحمتوں اور تکلیفوں سے بھرپور خدمات کا شکریہ ادا کیا اور خداوند عالم سے آپ کے لئے جزائے خیر کے طالب ہوئے آپ کی عظمت، شرافت، خدمت اور رسالت کا اقرار کیا، جب آپ اچھی طرح مطمئن ہو گئے کہ چاروں طرف آپ کی آواز ہر ایک تک اچھے طریقے سے پہنچ رہی ہے تو آپؐ نے اپنا ایک اہم پیغام ان تک پہنچانے کے لیے پہلے ان سے اقرار لیا کہ:

''اَلَسْتُ اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ؟'' کیا میں تم سے زیادہ تمہاری جانوں پر اولیٰ بالتصرف نہیں ہوں؟ سب نے بلیٰ کہہ کر اعتراف کیا تو آپ نے اس وقت فرمایا: ''اِنَّ اللّٰہَ مَوْلَایَ وَ اَنَا مَوْلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَنَا اَولیٰ بِهِمْ مِنْ اَنْفُسِهِمْ، فَمَنْ

کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاه'' اللہ میرا مولا ہے اور میں مومنوں کا مولیٰ ہوں اور ان کے نفسوں سے اولیٰ ہوں، پس جس کا میں مولیٰ ہوں اس کے علیؑ مولا ہیں۔

رسالت مآبؐ نے اسی بات کو تین بار دہرایا بلکہ بقول امام احمد بن حنبل چار مرتبہ دہرایا اور اس کے بعد فرمایا:

''اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَّالَاهُ وَ عَادِ مَنْ عَادَاهُ وَ اَحِبَّ مَنْ اَحَبَّهُ وَابْغَضْ مَنْ اَبْغَضَهُ، وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَهُ وَ اَدِرِ الْحَقَّ مَعَه حَيْثُ دَارَ، اَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَآئِبَ''
اے اللہ جو اس سے دوستی رکھے تو اس سے دوستی رکھ، جو اس سے دشمنی رکھے تو اس سے دشمنی رکھ، جو اس سے محبت کرے تو اس سے محبت کر جو اس سے بغض رکھے تو اس سے بغض رکھ، جو اس کو چھوڑ دے تو اسے چھوڑ دے اور حق کو ادھر پھیر دے جہاں علیؑ ہوں۔

دیکھو! جو یہاں حاضر ہیں ان پر واجب ہے کہ وہ سب تک یہ بات پہنچا دیں۔

اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے چالیس طریقوں سے، ابن جریر طبری نے ستر (۷۰) سے زائد، علامہ جزری المقری نے ۸۰ (اسی) علامہ ابن عقدہ نے ۱۰۵، علامہ ابن سعید سجستانی نے ۱۲۰ (ایک سو بیس) اور علامہ ابوبکر جعابی نے ۱۲۵ طریقوں سے روایت کیا ہے جبکہ امیر محمد عینی سے منقول ہے کہ وہ حدیث غدیر کو ۱۵۰ طریقوں سے روایت کرتے ہیں۔

ان سب حوالوں کے لیے علامہ امینی مرحوم کی کتاب ''الغدیر'' کا مطالعہ کیا

جا سکتا ہے، علاوہ ازیں علامہ امینی اپنی اسی شہرہ آفاق کتاب الغدیر کی جلد اول میں ایک سو دس اصحاب رسول سے یہ روایت ثابت کرتے ہیں اور انہی کی تحقیق کے مطابق بہت سے اصحاب رسول سے یہ روایت کی ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے موقع پر حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جن میں سے بعض اصحاب کے اسماء گرامی آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں: زید بن ارقم، ابوسعید خدری عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ انصاری، ابوہریرہ اور براء بن عازب، جبکہ مفسرین شیعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت مقامِ غدیرِ خم پر حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

ہم اپنے ناظرین کو اس بارے میں کتاب ''الغدیر'' کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔

اس آیت میں غور کرنے سے بہت سے نکات ہمارے سامنے آتے ہیں، مثلاً

۱۔ آیتِ مجیدہ کا انداز اور طرزِ خطاب اس سے پہلے کو بعد کی آیات سے جدا کر رہا ہے، آپ کو پورے قرآن میں کہیں نہیں ملے گا کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت لہجے میں تہدید کی گئی ہو سوائے اس آیت کے کہ ''اگر آپ نے یہ کام نہ کیا تو آپ کی ۲۳ سالہ رسالت کی ساری کارکردگی ختم ہو جائے گی، تو اب ہمیں غور کرنا چاہئے کہ وہ کونسا ایسا کام ہے کہ جس کی بجا آوری پر سرکار کی رسالت کا دارومدار ہے؟

۲۔ سورہ مائدہ حضور کی زندگی کے آخری ایام میں نازل ہوئی، جبکہ مکہ، خیبر اور خندق سب فتح ہو چکے تھے، اس کے بعد تبلیغِ رسالت میں کوئی خطرہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔

۳۔ آیت میں ''یا ایھا النبی'' کی بجائے ''یا ایھا الرسول'' کے

لقب کے ساتھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے جو ایک اہم سرکاری پیغام کا آئینہ دار ہے، اور اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ آنے والا حکم منصبِ رسالت سے مربوط اہم معاملہ ہے، جس کا نہ پہنچانا ساری رسالت کے نہ پہنچانے کے مترادف ہے۔

۴۔ ''ابلغ'' کی بجائے ''بلغ'' کے ذریعہ پیغام پہنچانے کا حکم دیا جا رہا ہے جو اہم ترین، قطعی اور منصب رسالت سے متعلق ہے۔

۵۔ ''وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے حکم کی تبلیغ کی بات ہے جس پر اسلامی نظام کا دارومدار ہے۔

۶۔ حضور پاکؐ کو اپنی جان کا خطرہ نہیں تھا اور شان رسالت اس سے بالاتر ہے کہ کسی ذاتی خوف و خطرے کی وجہ سے تبلیغِ رسالت میں کوتاہی کریں اور پھر یہ کہ جب عالم کسمپرسی میں دعوتِ تبلیغ شروع کی تو تنہا تھے، اس دوران میں جنگیں بھی کیں، کبھی مشرکین سے کبھی کفار سے تو بھی نہیں ڈرے، بڑے بڑے خطرات کو خاطر میں نہیں لائے، پتھروں کی بارشیں ہوئیں، نہیں گھبرائے، دوست واحباب کو اذیتوں کا نشانہ بنتے دیکھا، پریشان نہیں ہوئے، اب جبکہ عمر کا بھی آخری حصہ ہے اور جان نثاروں کی بھی کمی نہیں، پھر کیونکر ڈریں، کیونکر گھبرائیں، کیوں خوف و ہراس کو خاطر میں لائیں لیکن آخر کوئی ایسا خوف تو دامن گیر ہے جس کے لیے خدا ضمانت دے رہا ہے کہ ''وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ'' خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا، لہٰذا جس خطرے کا آیت میں ذکر ہے وہ کوئی اور خطرہ ہے۔

اس لئے کہ اس آیت میں ایک ایسے پیغام کا پہنچانا ضروری ہے جو اہمیت کے لحاظ سے تمام عرصہ نبوت و رسالت کے برابر ہے، اگر اسے انجام نہ دیا گیا تو ساری رسالت بے کار ہوتی ہے، اس پیغام میں الٰہی تربیت کا راز مضمر ہے، اس پیغام کا مضمون ایک بنیادی اور اساسی مسئلہ ہے، ورنہ آج تک نہ ایسی تہدید نظر آتی ہے اور نہ

ہی تسلی کی یقین دہانی، اس پیغام کا تعلق نہ توحید و نبوت سے ہے اور نہ ہی معاد یعنی قیامت سے، کیونکہ تینوں اصول مکہ معظمہ ہی میں آغازِ بعثت کے ساتھ ہی بیان ہوتے رہے، اب آپ کی آخری عمر میں ان کے بارے میں آپ کو اسی قدر زیادہ تاکید کی ضرورت نہیں، اور اس کا تعلق فروع دین یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، جہاد وغیرہ سے بھی نہیں کیونکہ یہ سب آپ کی نبوی زندگی کے ۲۳ سالوں میں بیان ہوتے رہے، اور لوگ ان پر عمل کرتے چلے آتے رہے ہیں، اس میں خوف و ہراس کی کوئی ایسی بات نہیں ہے۔

تو پھر وہ کون سی ایسی بات ہے جس کے بارے میں خداوند عالم اپنے محبوب رسول کو اس کے خوف سے محفوظ رکھنے کی بات کر رہا ہے؟ تو اگر ہم آیت کے اس حصے پر غور کرتے ہیں: ''مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ '' تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم پہلے رسولؐ پر نازل ہو چکا تھا، شاید آپ ﷺ اس کی تبلیغ کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھے، اس لئے کہ حضور کو کفار و مشرکین سے کوئی خطرہ نہیں تھا اگر خطرہ تھا تو صرف اور صرف اہل اسلام سے، کیونکہ ان کی طرف سے اس الزام تراشی کا خطرہ تھا کہ رسول کنبہ پرستی کرتے ہیں، اس لئے کہ معاشرے میں اگرچہ مخلص مومنین کی کمی نہیں تھی لیکن اسی مسلم معاشرے میں منافقین بھی تھے، ضعیف الایمان لوگ بھی اور ایسے لوگ بھی تھے جو بقول قرآن ''فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَرَضٌ'' ان کے دلوں میں بیماری ہے، کچھ لوگ رسول اللہ کو دنیاوی بادشاہوں پر قیاس کرتے تھے اور قانون سازی میں خود رسول اللہ عمل دخل کو بعید قیاس نہیں سمجھتے تھے، اسی لئے رسول اسلام کو اللہ تعالیٰ تسلی دے رہا ہے کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، ''واللہ یعصمک من الناس '' اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضور کو کفار و مشرکین سے خطرہ نہیں تھا

تو پھر اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہ کیوں فرما رہا ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ '' تو اس کا جواب یہ ہے کہ کفر سے مراد اسی آیت کے اندر بیان ہونے والے پیغام اور مندرجات کا انکار ہے، جو ولایت کی صورت میں ہے۔

ناظرین آیت اور واقعہ میں غور کرنے سے کچھ اور نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ بعض بنیادی احکام ایسے ہوتے ہیں جن کی تبلیغ پر پوری رسالت موقوف ہے۔

۲۔ حضور اکرم ﷺ جب مطمئن ہو گئے کہ آپ کی آواز چہار اطراف میں پہنچ رہی ہے تو اپنے اہم ترین پیغام کو اس وقت بیان فرمایا اور اطمینان کا یہ حصول حضور کے حفظ ماتقدم کے طور پر تھا، کیونکہ آپ کی رحلت کے بعد جب آپ کی دختر حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا، حضرت علی علیہ السلام کے حق کے حصول کے لیے مہاجرین و انصار کے دروازے پر دستک دے کر ان سے سوال کرتی تھیں کہ: آیا تم اس وقت موجود نہیں تھے اور میرے بابا کی زبانی نہیں سنا تھا کہ غدیر خم میں انہوں نے کیا کہا تھا؟ آیا انہوں نے علیؑ کو امت کا رہبر اور پیشوا مقرر نہیں فرمایا تھا؟ تو وہ جواب میں کہتے کہ ہم ان سے دور بیٹھے ہوئے تھے اور حضور کی آواز کو نہیں سن سکے تھے، اللہ اکبر کس قدر حق پوشی، کس قدر خوف و ہراس، کس قدر بے وفائی، کس قدر دختر رسول کے ساتھ جھوٹ۔ الامان والحفیظ

۳۔ لوگ تو دو گواہوں کے ذریعے اپنا حق حاصل کر لیتے ہیں، مگر افسوس کہ علیؑ، ایک لاکھ گواہوں کے باوجود اپنا حق حاصل نہ کر سکے، پناہ بخدا دنیا کے ساتھ محبت اور حسد و کینے سے!!

واقعہ غدیر کی تکمیلی آیت

ناظرین محترم! جس طرح اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ایمانِ مجسم، حضرت علی علیہ السلام کی سیرت طیبہ کے مختلف پہلو ہیں ان میں سے ایک عملی پہلو بھی ہے اور اس کے ایک حصے یعنی واقعہ غدیر خم پر اس سے پہلے گفتگو کر چکے ہیں اور اس پر اس کا ایک انتہائی اہم پہلو یعنی خدا کی طرف سے تکمیل دین تحصیلِ نعمت، اسلام کی پسندیدگی اور رسالت کی قبولیت کی سنت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، اور وہ ہے سورہ مائدہ کی آیت 3

''اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلاَ تَخْشَوْھُمْ وَاخْشَوْنِ. اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلاَمَ دِیْنًا''

آج کافر لوگ تمہارے دین سے مایوس ہو چکے ہیں، پس تم ان (کافروں) سے نہیں مجھ سے ڈرو، آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا، اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطورِ دین پسند کر لیا۔

چنانچہ امامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ'' اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلاَمَ دِیْنًا ''غدیر خم کے موقع پر رسول اللہ کی طرف سے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے اعلان کے بعد نازل ہوئی، جبکہ امامیہ کے ساتھ مکتبِ خلفاء کے ائمہ حدیث کی ایک قابلِ توجہ جماعت نے بھی اپنی تصنیفات میں متعدد اصحاب رسولؐ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت مقامِ غدیر میں ولایتِ علیؑ کے اعلان کے بعد نازل ہوئی۔

مکتبِ خلفاء کے بعض مصادر میں ابن عباس، حضرت عمر، حضرت علی علیہ السلام سمرہ اور معاویہ سے منقول ہے کہ یہ آیت حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوئی

ہے، آیت میں'' اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ ...... ''یعنی آج کے دن کافر لوگ تمہارے دین سے مایوس ہو گئے، اس میں چند ایک مسائل قابلِ بحث ہیں:

''اَلْیَوْمَ'' سے مراد اس کے ظاہری اور لغوی معنی ہیں ___ یعنی ایک خاص دن ___ اس لئے کہ یہاں قرینہ یہی بتا رہا ہے کہ خاص کر آج ___ غدیر خم ___ کا دن مراد ہے، اور ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ...... '' آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا، یعنی دین کی تکمیل، اعلان امامت سے ہوئی اور آج یہ دین پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ کفار نے دینِ اسلام کی دعوت کو پھیلنے سے روکنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا لیکن ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، اُن کی آخری امید یہ تھی کہ دین اس کے بانی کے جانے کے ساتھ ختم ہو جائے گا اور یہ دعوت اس کے داعی کی موت سے مٹ جائے گی، کیونکہ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے اور بہت سے سلاطین اور شان و شوکت والے بادشاہوں کے موت کے منہ میں جانے کے بعد ان کے نام و نشان تک مٹ گئے اور قبر میں جاتے ہی ان کی حکومتیں زوال پذیر ہو گئیں۔

۳۔ جب رسول اللہ ﷺ نے حکمِ خدا سے اپنے بعد اس دین کے محافظ کا تعارف کرایا تو اس دین کے لیے بقا کی ضمانت فراہم ہو گئی اور بقول صاحب المیزان ''یہ دین مرحلہ وجود سے مرحلہ بقا میں داخل ہو گیا'' یہاں سے کافر مایوس ہو گئے کہ رسالت ایک فرد پر منحصر نہ رہی، اب یہ دعوت ایک شخص کے مرنے سے نہیں مرتی، چنانچہ تمام امامیہ کے متفقہ موقف اور غیر امامیہ کے بہت سے باشعور اور صاحبان دانش و بینش افراد کی تصریحات کے مطابق کفار کی مایوسی اور دین کی تکمیل واقعہ غدیر خم سے مربوط ہے۔

۴۔ ''وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ '' اس امت کو ولایت کی نعمت سے نوازا تو نعمتوں کی تکمیل ہو گئی، کیونکہ اس پوری کائنات میں سب سے بڑی نعمت،

توحید ہے اور توحید کا پرچار نبوت سے ہوا اور اسے تحفظ ''امامت'' سے ملا۔

۵۔ ''فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ'' اب تم کفار سے نہیں مجھ سے ڈرتے رہو، اس لہجہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اب بیرونی خطرات ٹل گئے ہیں، البتہ اس دین کو داخلی خطرات ہنوز لاحق ہیں۔ داخلی خطرات سے بچنے کے لئے خوفِ خدا درکار ہے، بالفاظ دیگر خوفِ خدا نہ رکھنے والوں کی طرف سے اس دین کو خطرہ لاحق ہے، یعنی اس دین کو اب کفار کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا، البتہ خود مسلمانوں کی طرف سے خطرہ باقی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ شیعہ وسنی روایات کے مطابق آیت کا یہ حصہ: ''الیوم'' سے لے کر ''اسلام دینا'' تک مقام غدیر میں علی بن ابی طالب علیہ السلام کے منصبِ امامت وخلافت پر فائز ہونے کے بعد نازل ہوا ہے، نقلی دلائل کے ساتھ عقلی تجزیہ وتحلیل بھی یہی رہنمائی کرتا ہے کیونکہ اس ''الیوم'' آج کے دن کی چار خصوصیات بیان ہوئی ہیں، اس دن میں:

۱۔ کفار کی مایوسی ۲۔ دین کا کمال ۳۔ لوگوں پر نعمتِ الٰہی کی تکمیل
اور ۴۔ دینِ اسلام کے لیے خدا کی پسندیدگی کا اظہار۔

اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ تاریخ اسلام میں بہت سے ایام ایسے ہیں جن کا نہایت ہی احترام سے کیا جاتا ہے، مثلاً بعثت کا دن، حضرت زہراؑ کی ولادت کا دن، ہجرت کا دن، ۱۳ رجب کا دن، ۱۵ شعبان کی رات اور دن وغیرہ کہ اپنی تمام خوبیوں اور فضیلتوں کے باوجود اس دن کے برابر پھر بھی نہیں ہو سکتے، کیونکہ یومِ غدیر، کو حاصل مذکورہ چار خصوصیات میں سے کوئی ایک بھی خصوصیت ان میں نہیں پائی جاتی، روزِ غدیر خم یعنی علی ابی طالب علیہ السلام کی بحیثیت خلیفۃ الرسول اور مولائے کائنات کی ولایت کے اعلان کا دن، اسلامی امہ کی قیادت کے اعلان کا دن، محافظ

دین کے تعارف کا دن، اسلام کی سربلندی کا دن، کفار کی مایوسی کا دن، دین کے کمال کا دن، نعمت کی تکمیل اور دین اسلام کی پسندیدگی کا دن۔

آیت میں غور کرنے سے چند نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ دین کا قیام اور پائیداری کا دارومدار اس کے صحیح رہبر پر ہے، اس کے ہوتے ہوئے تمام کفار جتنا وہ مایوس ہوتے ہیں، کسی اور چیز سے مایوس نہیں ہوتے۔

۲۔ مسلم امہ کا قائد اور رہبر اگر غدیر والا ہو تو پھر مسلمانوں کو کسی قسم کا خوف نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''فلا تخشوھم''

۳۔ کفار کی امیدوں اور آرزوؤں کا سب سے زیادہ دارومدار مسلمانوں کے قائد ورہبر کی موت پر تھا، لیکن علی بن ابی طالب علیہ السلام کے رہبر اور قائد منصوب ہوجانے کے بعد کفار کی تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور وہ مایوسی کا شکار ہوگئے۔

۴۔ اگر ہمیں بیرونی دشمن سے کوئی خطرہ نہ بھی ہو پھر بھی اندرونی دشمن اور گناہوں کے اسباب سے مطمئن نہیں ہوجانا چاہئے اور خوفِ خدا کے اسلحہ کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا چاہئے۔

۵۔ اگر رہبر نہ ہو، دین کامل نہیں ہوسکتا اور رہبر کے بغیر مذہب خدا کے لیے پسندیدہ نہیں ہوسکتا۔

۶۔ اگر کسی دن میں فقط دین کامل ہوجائے، یا فقط نعمت مکمل ہوجائے یا حق تعالیٰ راضی ہوجائے یا کفار کو مایوسی حاصل ہوجائے وہ دن ''یوم اللہ'' بننے کے لئے کافی ہے، چہ جائیکہ یہ تمام خصوصیات ''غدیرِ خم'' جیسے دن کو حاصل ہوں، اسی لئے تو اہلِ کتاب کہتے ہیں کہ: اگر اس جیسا دن ہماری کتابوں میں ہوتو ہم اس دن کو ''عید'' قرار دیں اور روایات اہلِ بیت اطہار علیہم السلام

میں بھی غدیر کو اسلام کی عظیم ترین عید قرار دیا گیا ہے۔

۷۔ کفار، کامل دین سے ڈرتے ہیں اور مسلمانوں سے مایوس ہوتے ہیں، نا کہ اس دین سے جس کا قائد ور ہبران کا ہمنوا، جس کا جہاد متروک، جس کے ذرائع آمدنی استعمار کے ہاتھ میں اور جس کے عوام انتشار کا شکار ہوں۔

۸۔ کفار کو عیدِ غدیر جیسے رہبر کے بغیر بڑی توقعات تھیں اور رہبرِ غدیر کے منصوب ہوجانے کے بعد مایوس ہو چکے ہیں، معلوم ہوا کہ تمام کفار ایک طرف اور علی علیہ السلام ایک طرف۔

۹۔ دین تو کامل ہوگیا لیکن لوگوں کے کامل ہونے کی ضرورت ہے۔

۱۰۔ امامت کے لیے حضرت علی علیہ السلام کا منصوب ہونا اللہ کی طرف سے نعمتوں کی تکمیل ہے اور ان کی ولایت کو چھوڑ دینا کفرانِ نعمت ہے اور نعمتوں کے کفران کا نتیجہ بہت خطرناک ہوتا ہے، الفضائل ص ۱۲۵، بحار الانوار ج ۳۹ ص ۲۹۹ میں ہے:

حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''وِلَایَتِیْ لِعَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ وِّلَادَتِیْ مِنْهُ، لِاَنَّ وِلَایَتِیْ لِعَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ فَرضٌ وَ وِلَادَتِیْ مِنْهُ فَضْلٌ''

علی بن ابی طالب علیہ کی ولایت مجھے ان کی نسبی رشتہ داری سے عزیز ہے، اس لئے کہ علی سے میری ولایت اور محبت فرض ہے اور نسبی رشتہ داری ایک فضیلت ہے۔

مشکوٰۃ الانوار ص ۳۳۲ میں ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''وِلَایَتِیْ لِآبَآئِیْ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ نَسَبِیْ، وِلَایَتِیْ لَهُم تَنْفَعُنِیْ مِنْ غَیْرِ نَسَبٍ وَنَسَبِیْ لَا یَنْفَعُنِیْ بِغَیْرِ وِلَایَة''

اپنے آباؤ اجداد سے میری محبت ان کی نسبی رشتہ داری سے زیادہ عزیز ہے چونکہ ان کی محبت، اگر نسب نہ بھی ہوتو بھی میرے لئے فائدہ مند ہے لیکن اگر محبت نہ ہوتو صرف نسب کا فائدہ نہیں ہوسکتا۔

پیغمبرؐ کا سفرِ آخرت

جب حضور سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا وقتِ وفات قریب آ گیا تو آپ نے اس سے ایک دن پہلے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے پاس بلا کر فرمایا: یا علیؑ! اب میرا وقتِ آخر قریب ہے، میری رحلت کے بعد آپؑ ہی نے مجھے غسل و کفن دینا اور لحد میں اتارنا ہے، میں نے جن لوگوں سے وعدے کر رکھے ہیں انہیں پورا کرنا، لشکرِ اسامہ کی تیاری کے سلسلہ میں فلاں یہودی کا مجھ پر قرضہ ہے اسے ادا کر دینا، پھر اپنے دستِ مبارک سے انگوٹھی اتار کر آپ کو دی اور فرمایا اسے پہن لیجئے اور اپنی تلوار، خود، زرہ، پٹکا اور دوسرے ہتھیار آپؑ کو عنایت فرمائے اور آج کا دن یوں گزر گیا۔

دوسرے دن بروز دوشنبہ یعنی سوموار ۲۸ صفر ۱۱ھ کو حضور انورؐ کی حالت غیر ہوگئی، کاشانہ نبوت پر موت کے بادل منڈلانے لگے، نزع کی سی حالت طاری ہوگئی اور وہ لمحہ قریب تھا کہ نفس کی آمد و شد بند ہوجائے، نبضیں اپنا کام کرنا چھوڑ دیں اور روحِ طیب اپنے مرکزِ ملکوت اعلیٰ کو پرواز کر جائے کہ غشی سے آنکھیں کھولیں، حضرت علی علیہ السلام کسی کام سے اِدھر اُدھر گئے ہوئے تھے، نظر نہ آئے تو فرمایا: ''ادعوا لی حبیبی'' میرے حبیب کو بلاؤ، کتاب ''الریاض النضرۃ'' جلد ۲ ص ۲۳۸ میں ہے کہ پہلے تو کوئی

دوسرے لوگوں کو بلایا گیا مگر حضورؐ نے ان سے منہ پھیر لیا اور فرمایا: میرے حبیب کو بلاؤ! اب حضرت علیؑ کو بلایا گیا۔ حضورؐ نے ان کو دیکھا تو اپنی چادر میں لے لیا جو وہ اوڑھے ہوئے تھے اور پہلو میں لیے رہے یہاں تک کہ آپؐ رحلت فرما گئے اور آپؐ کا ہاتھ حضرت علیؑ کے اوپر تھا۔

ناظرین! یہ حادثہ دنیائے اسلام کا عظیم ترین حادثہ تھا یوں تو اس سانحے سے ہر شخص متاثر تھا، مگر بنی ہاشم اور افرادِ خاندان پر غم والم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، دخترِ رسولؐ کا یہ حال تھا کہ گویا ان سے زندگی چھین لی گئی ہے، ان کے بچے نانا کی شفقتیں یاد کر کے تڑپ رہے تھے اور علیؑ کی تو دنیا ہی بدل چکی تھی، رگوں میں خون منجمد ہو کر رہ گیا اور صبر وضبط کے باوجود آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا، آپؑ نے روتے ہوئے اپنا ہاتھ حضورؐ کے چہرہ اقدس سے مس کیا اور اپنے منہ پر پھیرا، میت کی آنکھوں کو بند کیا اور نعش اطہر پر چادر پھیلا دی اور حسب وصیت رسولؐ غسل وکفن کی طرف متوجہ ہو گئے، چنانچہ ابن سعد اپنی کتاب طبقات جلد۲ ص ۲۶۳ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"تُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ رَأْسُهٗ فِیْ حِجْرِ عَلِیٍّ وَ غَسَّلَهٗ عَلِیٌّ وَ الْفَضْلُ مُحْتَضِنُهٗ وَ اُسَامَةُ یُنَاوِلُ الْفَضْلَ الْمَاءَ"

یعنی جب رسول اللہ نے انتقال فرمایا تو آپؐ کا سر اقدس حضرت علی علیہ السلام کی گود میں تھا اور علیؑ ہی نے آپ کو غسل دیا، فضل بن عباس حضور کو سنبھالے ہوئے تھے اور اسامہ انہیں پانی دیتے جا رہے تھے۔

جب امیر المومنینؑ غسل دینے سے فارغ ہو گئے تو کفن پہنایا اور تنہا نماز جنازہ پڑھی، مسجد میں جو لوگ جمع تھے وہ آپس میں مشورہ کر رہے تھے کہ کسے نماز جنازہ

کی امامت کے لیے کہیں اور کون سی جگہ دفن کے لیے تجویز کریں، کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ صحن مسجد میں دفن کئے جائیں اور کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ جنت البقیع میں دفن ہوں، حضرت علی علیہ السلام کو معلوم ہوا تو آپ نے حجرے سے باہر نکل کر فرمایا: "پیغمبر اکرمؐ زندگی میں بھی ہمارے امام و پیشوا تھے اور رحلت کے بعد بھی ہمارے امام و پیشوا ہیں، لہٰذا ایک ایک آدمی اندر جائے اور فرادیٰ نماز پڑھ کر باہر نکل آئے، رہا حضورؐ کے دفن کا سوال، تو وہ اسی مقام پر دفن کیے جائیں گے جہاں انہوں نے رحلت فرمائی ہے"

چنانچہ بنو ہاشم نے سب سے پہلے، پھر مہاجرین اور انصار نے نماز ادا کی۔ البتہ ایک گروہ جو تشکیل حکومت کی فکر میں تھا، تجہیز و تکفین میں شرکت اور نماز جنازہ کی سعادت سے محروم رہا۔ نماز جنازہ کے بعد اسی حجرے میں جہاں آپؐ نے انتقال فرمایا تھا زید بن سہل سے قبر کھدوائی گئی۔

حجرے کے اندر دفن کرنے والے حضرت علیؑ، عباس بن عبد المطلب، فضل بن عباس اور اسامہ بن زید تھے، جب دفن کا وقت آیا تو انصار نے باہر پکار کر کہا: یا علی! ہمارا ایک آدمی بھی اس میں شریک کر لیجئے تاکہ ہم اس شرف سے محروم نہ رہ جائیں، حضرت علیؑ نے اوس بن خولی کو شریک کر لیا اور انہیں قبر میں اترنے کی اجازت دے دی، حضرت علیؑ نے نعش اقدس کو دونوں ہاتھوں پر لے کر قبر میں اتارا، جب لحد میں رکھا تو چہرے پر سے کفن کو اتارا اور نعش کو قبلہ رو کر کے رخسارِ مبارک کو خاک پر رکھا، اپنے ہاتھوں سے قبر میں مٹی ڈالی اور قبر کو ہموار کر کے اس پر پانی چھڑکا۔

وصیت کی تعمیل

انسان اپنی زندگی میں جن چیزوں کی تکمیل نہیں کر پاتا یا ان پر عملدرآمد کا موقع ہی مرنے کے بعد آتا ہے، تو وہ انہیں بطور وصیت کسی ایسے شخص کے متعلق کر جاتا

ہے، جس پر اسے مکمل طور پر اعتماد و یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کی وصیت سے انحراف نہیں کرے گا، خواہ اسے کتنی ہی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ ایک فرض شناس انسان کی فرض شناسی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وصیت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد ہر حال میں اس کی پابندی کرے۔ پیغمبر اکرمؐ نے اسی اعتماد کی بنا پر علی علیہ السلام کو اپنا وصی مقرر کیا تھا کہ ان پر جو ذمہ داریاں عائد کی جائیں گی وہ انہیں فریضہ سمجھ کر پورا کریں گے، چنانچہ حضرت علیؑ نے ایک فرض شناس کی طرح وصیت کے ہر پہلو کو پیشِ نظر رکھا اور ایک ایک ہدایت پر عمل کیا، تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں خود غسل دیا، خود کفن پہنایا، خود قبر میں اترے اور گرد و پیش کے بدلے ہوئے حالات سے آنکھیں بند کر کے ہمہ تن ادھر ہی متوجہ رہے، ان عمومی فرائض کے علاوہ حضورؐ کے وعدوں کے ایفا کا ذمہ اور ادائے حقوق و ادائے قرض کا بار بھی آپؑ پر تھا، جیسا کہ حدیث پیغمبرؐ میں ہے: ''**علی ینجز عداتی و یقضی دینی** ''علی میرے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کریں گے اور میرا قرضہ ادا کریں گے اور آپ کے وصی یعنی علی بن ابی طالبؑ بھی ان ذمہ داریوں سے اس طرح عہدہ برآ ہوئے کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۳۱۹ میں ہے: عبد الواحد بن عوان کہتے ہیں کہ: ''جب پیغمبر اکرمؐ کی رحلت ہوئی تو حضرت علیؑ نے ایک اعلان کرنے والے کو حکم دیا کہ وہ اعلان کرے کہ جس کسی سے رسول اللہ نے کوئی وعدہ کیا ہو یا جس کسی کا قرضہ ان کے ذمہ ہو وہ میرے پاس آئے اور ہر سال زمانہ حج میں کسی اعلان کرنے والے کو بھیجتے جو قربانی کے دن عقبہ کے پاس اعلان کرتا اور آپ کی زندگی تک ایسا ہوتا رہا۔ آپؑ کے بعد حضرت امام حسن بن علیؑ زندگی بھر اس پر کاربند رہے اور اُن کے بعد حسین بن علیؑ کی طرف سے اعلان ہوتا رہا اور پھر یہ سلسلہ بند ہو گیا''

اس سے بڑھ کر احساس فرض اور ادائے فرض کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ

حج کے موقع پر جہاں ہر سمت کے لوگ سمٹ کر جمع ہو جاتے ہیں، مسلسل پچاس برس تک یہ اعلان ہوتا رہا کہ کسی کا کوئی مطالبہ باقی نہ رہ جائے، اس سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام نے نہ کسی تحریری دستاویز کی شرط رکھی، نہ کسی گواہ کی ضرورت محسوس کی بلکہ عبد الواحد بن عوان کہتے ہیں کہ جس نے طلب کیا آپ نے بلا حیل و حجت دے دیا خواہ اس نے سچ کہا ہو یا جھوٹ اور یہ تھا ایمانِ مجسم کا سرکارِ رسالت مآب ﷺ کی ذات سے والہانہ محبت کا ثبوت۔

۴۔ رحلت پیغمبرؐ سے خلافت ظاہری تک

ناظرین! جیسا کہ ہم ابتدا میں بتا چکے ہیں کہ ایمانِ مجسم، امام معظم حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت باسعادت بعثت رسالت مآب ﷺ سے دس سال پہلے ہوئی اور حضور رسالت مآبؐ کی رحلت کے تیس سال بعد تک آپ نے اپنی پاکیزہ زندگی کو اطاعتِ رب کی صورت میں بسر کیا اور آپؑ کی ۶۳ سالہ مجموعی زندگی کو پانچ دورانیوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ ولادت سے بعثت ختمی مرتبت تک
۲۔ بعثت سے ہجرت تک
۳۔ ہجرت سے رحلت سرورِ کائنات تک
۴۔ رحلت سرورِ انبیاء سے اپنی ظاہری خلافت تک اور
۵۔ خلافتِ ظاہری سے شہادت کے عظیم مرتبہ پر فائز ہونے تک۔

جبکہ اس سے پہلے ایمان مجسم کی زندگی کے پہلے تین دورانیوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال چکے ہیں اس وقت ہم چوتھے دورانئے یعنی ''رحلت سرورِ انبیاء سے اپنی ظاہری خلافت تک''، تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں

اور قبل اس کے کہ اس موضوع کے بارے میں کچھ عرض کریں بطور مقدمہ اس بات کی یاد آوری اپنے ناظرین کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ امامت کے جلیل القدر سلسلہ نے پیغمبرؐ کی ۲۸ صفر ۱۱ ہجری سے لے کر شہادت امام حسن عسکری علیہ السلام ۸ ربیع الاول ۲۶۰ ہجری تک تقریباً چار مراحل میں سفر طے کیا ہے اور ہر مرحلہ میں اپنے وقت کے امامؑ نے برسرِ اقتدار حکمران سے خصوصی حکمت عملی اختیار کر کے اسلام کے مبین و مقدس دین کی حفاظت فرمائی ہے۔

۱۔ پہلا مرحلہ جس کا تعلق ایمان مجسم جناب امیر المومنین علیہ السلام کے ساتھ تعلق رکھتا ہے آپ نے صبر اور ''با دوستان محبت با دشمنان مدارا'' کے اصول کے ساتھ صاحبان اقتدار کی ہر سختی اور پابندی کو صبر وتحمل کے ساتھ برداشت کیا اور صبر و استقلال کا یہ عرصہ حضرت رسالت مآبؐ کی ۱۱ ہجری میں ہجرت سے لے کر سرکار کی ظاہری خلافت ۳۵ ہجری تک پچاس برس پر مشتمل ہے۔

۲۔ دوسرا مرحلہ، امام وقت کا برسرِ اقتدار ہونے کا مرحلہ ہے اور یہ مرحلہ صرف چار سال نو ماہ پر مشتمل ہے جو امیر المومنین علیؑ اور آپؑ کے فرزند ارجمند امام حسن مجتبیٰ علیہما السلام کے عرصہ خلافت کا دورانیہ ہے، جو ہر قسم کی مشکلات اور دشمن کی ہر طرح کی ریشہ دوانیوں اور انواع و اقسام کی سازشوں کے باوجود ''اسلامی حکومت'' کے روشن ترین سالوں میں شمار ہوتا ہے۔

۳۔ تیسرا مرحلہ: اسلامی حکمت کی تشکیل کے مختصر عرصے پر مشتمل ایک تعمیری کوشش سے عبارت ہے جو تقریباً بیس سال پر محیط ہے، یعنی ۴۱ ہجری میں حضرت امام حسن علیہ السلام کے امیر شام کے ساتھ صلح کے عرصہ سے لے کر ۶۱ ہجری کے کربلا کے خونین معرکے تک کا دورانیہ ہے۔

چنانچہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی صلح کے بعد، آپ کے پیروکاروں اور

جانثاروں کا نیم مخفی کاروائیوں کا عملی سلسلہ شروع ہو گیا اور کسی مناسب پر موقع پر خاندانِ رسالت کی طرف حکومت اور اقتدار کو واپس پلٹانے کے ہدف کو پیشِ نظر رکھ کر اس سلسلے کو شروع کر دیا گیا اور اگر ظاہری طور پر دیکھا جائے تو اس کا حصول ناممکن بھی نہیں تھا اور امیر شام کی زندگی کے خاتمے پر اس کی امید تھی۔

۴۔ چوتھا اور آخری مرحلہ: مذکورہ روش کو جاری رکھنے کا مرحلہ ہے جو دو صدیوں کے طویل عرصے پر محیط ہے، جس میں کبھی یہ کوشش ہوتی تھی تو کبھی کامیاب ہو جاتی تو کبھی ناکام ہوتی، اس کوشش کی خوبی یہ ہے کہ یہ خلوص اور فداکاری کے جذبوں سے سرشار تھی جو نظریاتی سلسلے میں جاری رہی اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خالص دین کی حفاظت میں کامیاب وکامران رہی۔

حضورؐ کی رحلت اور مسئلہ خلافت:

قرآنِ مجسم، رسول معظم ہادی اعظم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد صرف اور صرف ایمان مجسم، امام معظم مولائے کائنات علی بن ابی طالب علیہ السلام ہی کی ذات تھی جو اسلام اور اسلامی معاشرہ کو اس کے اصلی خطوط پر چلانے کی صلاحیت رکھتی تھی، اس لیے کہ حضور پیغمبر ختمی مرتبتؐ کے بعد فضیلت، تقویٰ، فقہی وعدالتی اور راہِ خدا میں جہاد وکوشش اور دوسری صفاتِ عالیہ میں کوئی بھی علی بن ابی طالب علیہ السلام کے پائے کی شخصیت نہیں تھی۔

انہی صلاحیتوں کی بنا پر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؑ کو اپنے خالق کے حکم سے کئی مرتبہ مسلمانوں کے آئندہ حاکم، رہبر، امام، پیشوا اور خلیفہ کے عنوان سے متعارف کرایا، جن میں تعارف کا سب سے اہم موقعہ ''غدیر'' کا ہے، اسی لیے حق پرست، حق پسند اور حق بین افراد کو یہی توقع تھی کہ حضرت پیغمبر ختمی مرتبت کی المناک

رحلت کے فوراً بعد امام علی علیہ السلام ہی زمام امور کو اپنے مبارک ہاتھوں میں لے لیں
گے اور اسلامی امہ کی امامت، قیادت، رہنمائی اور پیشوائی کا تسلسل نہ صرف ٹوٹنے نہیں
پائے گا بلکہ حسبِ سابق جاری اور ساری رہے گا۔

لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا اور سرورِ کائناتؐ کی رحلت کے بعد خلافت کے
راستے کو یکسر تبدیل کر دیا گیا اور رسول خداؐ کے حقیقی وارث اور جانشین کو نہ صرف کوئی
اہمیت نہیں دی گئی بلکہ اس فہرست ہی سے انہیں نکال دیا گیا۔

ایمان مجسم زندگی کے دوراہے پر

ایمان مجسم علی امیرالمومنینؑ نے اس بے انصافی اور کجروی کو نہ صرف
برداشت ہی نہیں کیا بلکہ اس بارے میں سکوت اور خاموشی کو گناہ بھی سمجھا اور متین و
وزنی دلائل اور احتجاجات کا رخ خلیفہ اور اس کے ہواداروں کی طرف کر دیا، لیکن وقت
کے گزرنے اور حوادثات کے پے در پے رونما ہونے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آپ
کے یہ استدلالات اور احتجاجات ان کے لیے چنداں موثر ثابت نہیں ہوئے اور وہ
اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے اور حکومت کو مضبوط کرنے پر مُصر ہیں، اب علیؑ کے
سامنے صرف دو ہی راستے تھے یا تو آپ حکومت وقت کو غیر قانونی اور ناحق سمجھنے والے
خاندانِ رسالت کے جوانوں اور اپنے سچے حبداروں اور تہہ دل سے چاہنے والوں کی
مدد کے ساتھ حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتے، طاقت کو استعمال میں لاتے
ہوئے حکومت اور خلافت پر قبضہ کر لیتے یا پھر موجودہ صورت حال کو برداشت کرتے
ہوئے، اپنی امکانی حد تک مسلمانوں کی مشکلات کو حل فرماتے اور اپنے شرعی فریضہ کو
انجام دیتے رہتے۔

چونکہ الٰہی قیادت اور امامت میں اقتدار، حکومت، مقام و منصب کا حصول

زندگی کا اصل مقصد نہیں ہوتے بلکہ ہدف اور مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہوتا ہے، لہٰذا
اگر کسی دن امام اور رہبر ایسے دوراہے پر آ کھڑا ہوا اور اسے عہدے اور تکمیل مقصد میں
سے کسی ایک کو انتخاب کرنا پڑے تو وہ عہدے کو ٹھکرا کر تکمیل مقصد کا انتخاب کرے گا
اور یہی چیز اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتی ہے، اور ایمان مجسم علی بن ابی طالبؑ کو
ایسی ہی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا اور آپ نے اسی دوسرے راستے کو اختیار کیا، کیونکہ
انہوں نے اسلامی امہ کے حالات کا اچھی طرح سے جائزہ لیا اور اپنی باریک بین
نگاہوں اور الٰہی سیاسی بصیرت کے ساتھ خوب غور وفکر سے کام لیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ
اگر مقام و منصب اور عہدہ کے حصول پر اصرار کرتے ہیں تو ایسی صورت حال پیدا ہو
جاتی ہے کہ حضور سرورِ کائنات ﷺ کی ۲۳ سالہ زحمات اور آپؐ کے مقدس ہدف
کے حصول میں شجرِ اسلام کی آبیاری کے لیے جو پاکیزہ خون بہائے گئے ہیں وہ سب
رائیگاں جائیں گے لہٰذا آپ نے قیام پر قعود کو ترجیح دی اور تلوار نیام میں بند کر دی۔

ایمانِ مجسم کا نہج البلاغہ میں ''شقشقیہ'' نام کا خطبہ ہے جس میں آپ فرماتے
ہیں:

> ''............میں نے خلافت کی ردا کو چھوڑ دیا اور اپنا دامن اس
> سے چھڑا لیا، یعنی پیچھے ہٹ گیا، جبکہ میں اس سوچ میں پڑ گیا تھا
> کہ آیا (کسی معاون و مددگار کے بغیر) اکیلا تلوار لے کر کھڑا
> ہو جاؤں (اور اپنا اور عوام کا حق ان سے چھین لوں) یا اس گھٹن
> اور تاریکی کے ماحول میں جو میرے لیے پیدا کر دیا گیا ہے صبر
> کے ساتھ بیٹھ جاؤں؟ وہ ایسا ماحول تھا جس نے جوانوں کو بوڑھا
> کر دیا تھا اور مومن افراد کو مرتے دم تک رنج و غم میں مبتلا کر دیا
> تھا، (آخر کار) میں نے دیکھا کہ صبر و بردباری ہی قرین عقل

ہے، لہٰذا میں نے صبر کو اختیار کیا، حالانکہ اس وقت میری کیفیت
یہ ہو چکی تھی جس طرح کسی کی آنکھوں میں تنکے اور گلے میں
کانٹے ہوں اور میں خاموشی کے ساتھ اپنی میراث کو اپنی آنکھوں
سے لٹتا دیکھ رہا تھا''

امام عالی مقامؑ نے اساس اسلام کی حفاظت کے لیے صبر سے جو کام لیا اور ایک دوسرے مقام پر اسی کی طرف اس وقت اشارہ کیا جب دوسری خلافت کے خاتمے کے بعد تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے لیے مجلس شوریٰ تشکیل دی گئی اور آپ کو ایک مرتبہ پھر جان بوجھ کر اپنے حق سے محروم کر دیا گیا تو آپ نے اس وقت ارکانِ شوریٰ کو مخاطب کر کے کہا: جو نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۷۲ میں ہے کہ:

''لَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّیْ اَحَقُّ النَّاسِ بِهَا مِنْ غَيْرِیْ، وَ وَاللّٰهِ
لَاُسْلِمَنَّ مَا سَلِمَتْ اُمُوْرُ الْمُسْلِمِيْنَ وَ لَمْ يَكُنْ فِيْهَا
جَوْرٌ اِلَّا عَلَیَّ خَاصَّةً''

تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ہی دوسرے لوگوں سے
زیادہ خلافت کا حقدار ہوں، خدا کی قسم جو کام تم نے کیا ہے، میں
اس پر اب خاموش ہی رہوں گا اور جب تک اسلامی امہ کے
حالات بہتر رہیں گے اور ان میں بگاڑ پیدا نہیں ہوگا اور میرے
علاوہ کسی اور پر ستم روا نہیں رکھا جائے گا۔ صرف میری ہی ذات
ظلم و جور کا نشانہ بنتی رہے گی۔

داخلی و خارجی خطرات

ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ اگر ایمان مجسم، امیر المومنین علیہ السلام تلوار لے کر

کھڑے ہو جاتے اور فریق مخالف سے اپنا حق حاصل کرتے تو یہ چیز ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی، مگر اس طرح سے اسلام اور اسلامی امہ کو جو نقصان پہنچتا اس کی قیامت تک تلافی نہ ہو سکتی۔

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سے خطرات تھے جو نوخیز اسلام اور اسلامی امہ کو درپیش تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دو قسم کے خطرات تھے جن کا اسلام اور اسلامی معاشرے کو سامنا تھا، ایک داخلی اور دوسرے خارجی، چنانچہ:

۱۔ اگر امامؑ اپنی قدرت اور طاقت کے بل بوتے پر تلوار لے کر کھڑے ہو جاتے اور حکومت و خلافت پر قبضہ کرنے کے لیے آگے قدم بڑھاتے تو اپنے ان بہت سے عزیزوں کو اس جنگ کی بھینٹ چڑھا دیتے جو دل و جان سے آپؑ کی امامت و خلافت اور رہبری کے قائل اور معتقد تھے اور ساتھ ہی اس دار و گیر میں حضور پیغمبر خدا کے وہ صحابہ کرام بھی مارے جاتے جو آپ کے خلیفہ اور امام بننے پر راضی نہیں تھے، وہ بھی اس کی بھینٹ چڑھ جاتے یہ ٹھیک ہے کہ یہ لوگ خلافت کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام کے مخالف گروہ میں تھے اور اپنی خاص وجوہات کی بنا پر آپ کے مخالف تھے اسی لیے وہ آپ کو سریر خلافت پر جلوہ افروز ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے تھے، باقی دوسرے امور میں تو وہ آپؑ سے مخالفت نہیں رکھتے تھے، آپ خود ہی اندازہ کیجیے کہ اگر صحابہ کرام کی یہ تعداد ماری جاتی تو اسلام کی افرادی قوت میں کمزوری پیدا ہو جاتی جو کفر و شرک، بت پرستی، عیسائیت اور یہودیت کے مقابلے میں ایک طاقت شمار ہوتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرکز میں مسلمانوں کی قوت اور طاقت میں بڑی حد تک کمی واقع ہو جاتی۔

ایمانِ مجسم علی بن ابی طالب علیہ السلام جب ناکثین (بیعت توڑنے والوں) کی سرکوبی کے لیے عازمِ بصرہ تھے تو آپ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں آپ نے

اس حساس موضوع کی طرف خصوصی توجہ دلائی اور یہ خطبہ شرح ابن ابی الحدید میں موجود ہے، ارشاد ہوتا ہے:

''جب خداوند عالم نے اپنے پیغمبرؐ کی روح کو قبض فرمایا تو قریش اپنی سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم پر سبقت لے گئے حالانکہ ہم ہی اس امت کی امامت اور پیشوائی کے لیے سب سے زیادہ اہلیت رکھتے ہیں، انہوں نے ہم سے ہمارا حق چھین لیا، لیکن میں نے دیکھا کہ اس معاملے میں صبر اور خاموشی سے کام لیا جائے، بہتر ہے اس بات سے کہ مسلمانوں میں تفرقہ ایجاد کر کے ان کا خون بہایا جائے، کیونکہ لوگوں نے ابھی تازہ تازہ اسلام قبول کیا ہے اور دین ایک مشک کی مانند تھا جس میں دودھ بھرا ہوا ہوتا ہے اور اس کے بلوئے جانے کا وقت پہنچ چکا ہوتا ہے لیکن اس سے ذرہ برابر سستی اسے خراب کر دیتی ہے اور ایک معمولی سا آدمی بھی اسے پلٹ کر رکھ دیتا ہے''

۲۔ (دوسری بات یہ کہ) چونکہ عرب کے بہت سے قبائل اور گروہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی زندگی کے آخری سالوں میں مسلمان ہوئے تھے، ابھی صحیح معنوں میں اسلامی تعلیمات کا علم بھی حاصل نہیں ہوا تھا اور نورِ اسلام پورے طور پر ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا تھا، جب رسالت مآب ﷺ کی خبرِ وفات دنیا میں منتشر ہوئی تو ایک گروہ نے ''ارتداد'' کا علم بلند کر دیا اور لوگوں کو بت پرستی کی طرف پلٹانے کے درپے ہوگئے اور مدینہ میں اسلامی حکومت کی عملی طور پر مخالفت پر اتر آئے، اسلامی حکومت کو مالیات کی ادائیگی روک دی اور جنگجو افراد کو اکٹھا کر کے مدینہ پر حملہ آور ہونے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔

تو اب ایسی صورت حال کے پیشِ نظر جبکہ اسلام کے رجعت پسند دشمن ارتداد کا پرچم بلند کیے اسلامی حکومت کو ڈرا دھمکا رہے تھے، ہرگز مناسب نہیں تھا کہ امام علیہ السلام ایک اور علم ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو جاتے اور حکومت وقت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتے۔

ایمانِ مجسم، امام معظم، امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اہل مصر کے نام ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''............پھر جب رسول خداؐ کی وفات ہوگئی تو ان کے بعد مسلمانوں نے خلافت کے بارے میں کھینچا تانی شروع کر دی، اس موقع پر بخدا مجھے یہ کبھی تصور بھی نہیں ہوا تھا اور نہ ہی میرے دل میں یہ خیال گزرا تھا کہ پیغمبرؐ کے بعد عرب، خلافت کا رخ ان کے اہلِ بیت سے موڑ دیں گے اور نہ یہ کہ ان کے بعد اسے مجھ سے ہٹا دیں گے، مگر ایک دم میرے سامنے یہ منظر آیا کہ لوگ فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے دوڑ پڑے، ان حالات میں میں نے اپنا ہاتھ روکے رکھا، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ مرتد ہونے والے اسلام سے مرتد ہو کر محمد مصطفیؐ کے دین کو مٹا ڈالنے کی دعوت دے رہیں ہیں، اب میں ڈرا کہ کوئی رخنہ یا خرابی دیکھتے ہوئے میں اسلام اور اہلِ اسلام کی مدد نہ کروں گا تو یہ میرے لیے اس سے بڑھ کر مصیبت ہوگی جتنی یہ مصیبت کہ تمہاری یہ حکومت میرے ہاتھ سے چلی جائے گی، جو تھوڑے دنوں کا اثاثہ ہیں اس میں کی ہر چیز زائل ہو جائے گی۔ اس طرح جیسے سراب بے حقیقت ہو جاتا ہے یا جس طرح بدلی

چھٹ جاتی ہے، چنانچہ میں درپیش آنے والے حالات کے اس
ہجوم میں اٹھ کھڑا ہوا، یہاں تک کہ باطل دب کر فنا ہوگیا اور دین
محفوظ ہوکر تباہی سے بچ گیا''

ہمارے ناظرین سے یہ بات مخفی نہیں ہوگی کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایمان مجسم امام معظم امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے بارے میں ''ھٰذا اخی و وصیی و خلیفتی فیکم ''یعنی یہ میرا بھائی، میرا اوصی اور تم لوگوں میں میرا جانشین ہے اور حجۃ الوداع سے پلٹتے ہوئے غدیر خم کے مقام پر ''من کنت مولاہ فعلی مولاہ'' فرما کر نیابت اور جانشینی کا مسئلہ طے کر دیا تھا، جس کے بعد کسی انتخاب کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی خیال اور تصور کیا جا سکتا تھا کہ اہلِ مدینہ انتخاب کی ضرورت محسوس کریں گے، مگر کچھ افراد نے ان واضح ارشادات کو اس طرح نظر انداز کر دیا کہ گویا ان کے کان کبھی ان سے آشنا ہی نہیں تھے اور انتخاب کو اس قدر ضروری سمجھا گیا کہ رسول رب العالمین کی تجہیز و تکفین کو چھوڑ چھاڑ کر ایک جگہ جمع ہو گئے اور جمہوریت کے نام پر علیؑ کے علاوہ کسی اور کو رسول کا خلیفہ منتخب کر لیا۔

یہ موقع ایمان مجسم، امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ کے لیے انتہائی کشمکش کا تھا، کیونکہ ایک طرف کچھ مفاد پرست لوگ یہ چاہ رہے تھے کہ آپ شمشیر بکف میدان میں اتر آئیں اور دوسری طرف آپ یہ دیکھ رہے تھے کہ وہ عرب جو اسلام کی طاقت سے مرعوب ہو کر اسلام لائے تھے مرتد ہوتے جا رہے ہیں اور مسیلمہ کذاب وطلیحہ بن خویلد اور ''سجاح'' قبیلوں کے قبیلوں کو گمراہی کی طرف جھونک رہے ہیں، ان حالات میں اگر خانہ جنگی شروع ہوگئی اور مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے مقابلے میں بے نیام ہو کر نکل آئیں تو ارتداد اور نفاق کی قوتیں مل کر اسلام کو صفحہ ہستی سے نابود کر دیں گی، اس لیے آپ نے جنگ پر وقتی سکوت کو ترجیح دی اور وحدت اسلامی کو برقرار رکھنے

کے لیے تلوار کا سہارا لینے کی بجائے خاموشی کے ساتھ احتجاج کافی سمجھا، کیونکہ آپ کو ظاہری اقتدار اتنا عزیز نہ تھا جتنی اسلامی امہ کی فلاح و بہبود عزیز تھی اور منافقین کی ریشہ دوانیوں کے سدباب اور فتنہ پردازوں کے عزائم کو ناکام بنانے کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ آپ اپنے حق سے دستبردار ہو کر جنگ کو ہوا نہ دیں اور یہ بقائے ملت و اسلام کے سلسلہ میں اتنا بڑا کارنامہ ہے جس کا تمام فرق اسلامیہ کو اعتراف ہے۔

اس امر کی مزید وضاحت کے لیے امام علی علیہ السلام کے وہ فرمودات ہیں جو آپ نے اپنی ظاہری خلافت کے ابتدائی دنوں میں ایک خطبہ کے دوران ارشاد فرمائے، جیسا کہ شرح ابن ابی الحدید ج اص ۳۰۷ میں ہے: ''عبداللہ بن جنادہ'' کہتے ہیں کہ میں علی بن ابی طالب علیہ السلام کی خلافت کے ابتدائی دنوں میں مکہ سے مدینہ آیا تو دیکھا کہ تمام لوگ مسجد نبویؐ میں جمع ہیں اور امام علیہ السلام کی تشریف آوری کے منتظر ہیں، تو اتنے میں علیؑ تلوار حمائل کیے ہوئے اپنے دولت کدہ سے مسجد میں تشریف لے آئے، سب کی آنکھیں آپ کی طرف اٹھ گئیں، آپ منبر پر تشریف لے آئے اور خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے سب سے پہلے حمد و ثنائے پروردگار کے بعد فرمایا: ''اے لوگو! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس دن سرورِ کائنات ہم سے جدا ہوئے ہمیں اس بات کی قطعاً فکر نہیں تھی کہ آنحضرتؐ کی قائم کردہ اسلامی حکومت کے بارے میں کوئی شخص ہم سے کسی قسم کا نزاع یا رقابت کرے گا اور ہمارے حق کو چشم طمع سے دیکھے گا، کیونکہ ہم پیغمبر خداؐ کے وارث، ولی اور عترت تھے، لیکن افسوس کہ ہماری ان توقعات کے برعکس، ہماری اپنی ہی قوم سے کچھ لوگوں نے ہمارے حق خلافت کو ہم سے چھین لیا اور حکومت دوسروں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

خدا کی قسم! اگر مسلمانوں کے درمیان رخنہ اور اختلاف پیدا ہونے کا خوف نہ ہوتا اور اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ سرزمین اسلام میں ایک بار پھر کفر اور بت پرستی

لوٹ آئے گی اور اسلام کا نام ونشان مٹ جائے گا تو ہم ان لوگوں کے ساتھ کسی اور طریقے سے پیش آتے''

۳۔(تیسری بات یہ کہ) سلطنت روم جو اس وقت اپنے دور کی سپر طاقت سمجھی جاتی تھی اور اسلام کی شدید ترین مخالف تھی اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک اور خطرے کی حیثیت اختیار کر لیتی، کیونکہ اس وقت تک مسلمان رومیوں کے ساتھ آمنا سامنا کر چکے تھے اور اہلِ روم مسلمانوں کو اپنے لیے ایک حقیقی خطرہ سمجھتے تھے اور وہ اس بہانے کی تلاش میں رہتے تھے کہ کسی طرح اسلامی مرکز پر حملہ کریں، چنانچہ اگر امام علی علیہ السلام تلوار لے کر کھڑے ہو جاتے اس وقت مسلمانوں کا داخلی محاذ کمزور ہو جاتا اور رومیوں کے لیے ایک بہترین موقع ثابت ہوتا جس سے وہ فائدہ اٹھا کر مرکز اسلام کو تباہ کر دیتے اور اسلام اور مسلمانوں کو ایسا ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتے کہ ان کے لیے دوبارہ سنبھلنا مشکل ہو جاتا۔

خلیفہ ثالث نے ۷۰ برس کی عمر میں یکم محرم ۲۴ ہجری کو زمام حکومت سنبھالی، بدقسمتی سے ان کا دورِ حکومت امویوں کے علاوہ عام مسلمانوں کے لیے خوشگوار ثابت نہ ہوا ان کی حکومت کے طرزِ عمل کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں، عوام کے جذبات بھڑک اٹھے اور دلوں میں غم وغصہ کی ایک لہر دوڑ گئی، آخر اس عام ناراضگی کے نتیجے میں ۱۸، ذی الحجہ ۳۵ ہجری کو گھر کے اندر قتل کر دیئے گئے۔

بارہ سالہ اس دورِ حکومت نے اس سے پہلے ساڑھے بارہ سالہ دورِ حکومت نے مسلمانوں کے سوئے ہوئے احساسات کو جھنجھوڑا اور حکام کے رویہ کو آزمانے اور اس کے نتائج کو بھگتنے کے بعد ان کی آنکھیں کھلیں اور یہ احساس شدت سے ابھرا کہ قیادت کو اس شخص کے ہاتھ میں ہونا چاہیے جو عوامی فلاح و بہبود اور اجتماعی مفادات پر نظر رکھے اور مملکت کی دولت سمٹ کر اس کی ذات اور اس کے خاندان کے افراد تک

محدود ہو کر نہ رہ جائے، چنانچہ مسند خلافت کے خالی ہوتے ہی اکابر صحابہ اور عوام و خواص کی نظریں حضرت علی علیہ السلام کی طرف اٹھنے لگیں۔

اگر خلیفہ ثالث عام حالات طبعی موت سے ہمکنار ہوتے تو خلافت نے جو سقیفائی اور شورائی نظام کے تحت جو رخ اختیار تھا اسے دیکھتے ہوئے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ خلافت اپنے اصلی مرکز کی طرف پلٹ کر آئے گی اور حضرت علیؑ کو مسند خلافت پر متمکن ہونے کا موقع دیا جائے گا، اس لیے کہ حضرت عثمان کے اہالی موالی وہ لوگ تھے جو انہیں عمومی مفاد کے بجائے ذاتی مفاد میں استعمال کرنے کے عادی ہو چکے تھے اور وہ کبھی گوارہ نہیں کر سکتے تھے کہ ایسے شخص کو برسرِ اقتدار آنے دیا جائے جو ان کے بگڑے ہوئے اطوار پر قدغن لگائے اور انہیں اپنی سابقہ عادتوں میں تبدیلی پر مجبور کرے، مگر حالات نے کچھ اس طرح پلٹا کھایا کہ ان کے لیے یہ موقع ہی نہ رہا کہ وہ خلافت کے سلسلے میں کوئی لائحہ عمل ترتیب دیتے یا کوئی خاص ہدایت کرتے اور اگر کرتے بھی تو اس ہنگامہ وشورش میں ان کی سنتا کون؟ جبکہ لوگ ان کی خویش نوازیوں اور ان کے عُمال کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے انہی کی خلافت کو انتہائی ناپسند کر رہے تھے اور انہیں جیتے جی یا قتل کر کے خلافت سے الگ کرنے پر تلے ہوئے تھے اور آخر کار نتیجہ وہی ہوا جو سب کے سامنے ہے۔

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امیر المومنینؑ نے ایک طویل عرصہ جس بے غرضی اور بے نفسی کے ساتھ گزارا اور جس اعتدال پسندی اور اصول پرستی کا مظاہرہ کیا وہ دلوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

اس تاثر نے عوام کے ذہن بدل دیئے اور گرد و پیش پر نظر دوڑانے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ایمان مجسم امام معظم امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام سے بہتر کوئی شخصیت نہیں ہے جو امت کی امامت وقیادت کا بار اٹھا سکے اور موجودہ انتشار،

بدامنی اور بگڑے ہوئے حالات پر قابو پا سکے۔

چنانچہ مہاجرین وانصار کے نمایاں افراد مسجد نبویؐ میں جمع ہوئے اور اتفاق رائے کے ساتھ فیصلہ کیا کہ حضرت علی علیہ السلام سے خلافت کی درخواست کی جائے، اس فیصلہ کے بعد ایک وفد جس میں طلحہ وزبیر بھی شامل تھے، حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے زمام کار اپنے ہاتھوں میں لینے کی التجا کی، حضرت نے ان کی پیشکش کو قبول کرنے میں توقف کیا اور فرمایا: میں تمہارے معاملات میں دخیل نہیں ہونا چاہتا، تم جسے چاہو اپنا امیر منتخب کرلو اور مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو، کامل ابن اثیر ج۳ ص۹۸ کے مطابق ان لوگوں نے کہا:

"اِنَّا لا نَعلَمُ اَحَدًا اَحَقُّ بِهِ مِنکَ وَلا اَقدَمَ سَابِقَةٍ وَلا اَقْرَبُ قَرَابَةٍ مِن رَّسُوْلِ اللّٰهِ"

ہم آپ سے زیادہ کسی کو خلافت کا حقدار نہیں سمجھتے اور نہ ہی سابقہ خدمات کے لحاظ سے آپ سے کوئی مقدم ہے اور نہ کوئی رسول اللہ سے قرابت میں آپ سے قریب تر ہے۔

لیکن مولا نے پھر انکار کر دیا مگر وہ لوگ باصرار آمادہ کرتے رہے اور جب یہ دیکھا کہ حضرت کسی طرح خلافت کے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں تو اسی کتاب کے ص۹۹ کے مطابق گڑگڑا کر کہنے لگے:

"نُنشِدُکَ اللّٰهَ اَلا تَرىٰ مَا نَحنُ فِيهِ؟ اَلا تَرى الْاِسْلامَ؟ اَلا تَخَافُ اللّٰهَ؟"

ہم آپ کو اللہ کا واسطہ دیتے ہیں آیا آپؑ نہیں دیکھ رہے کہ ہم کس حالت میں ہیں؟ کیا آپ اسلام کی حالت اور فتنوں کو ابھرتے دیکھ نہیں رہے؟ کیا آپ اللہ سے بھی نہیں ڈرتے؟

جب امیرالمومنین علیہ السلام نے دیکھا کہ اصرار حد سے بڑھ گیا ہے اور حالات لاکھ نامساعد سہی مگر اتمام حجت کے بعد اب ادائے فرض سے پہلو تہی نہیں کی جاسکتی، تو آپؑ نے فرمایا:

"قَدْ اَجَبْتُکُمْ رَكِبْتُ بِكُمْ مَا اَعْلَمُ"

مجھے منظور ہے مگر یہ بات جان لو کہ یہ منظوری اس صورت میں ہے کہ میں تمہیں اس راہ پر چلاؤں جسے بہتر سمجھوں۔

ناظرین! یہ عوامی رجحانات اور تبدیلی حالات کا کرشمہ ہے کہ یا تو حصول خدمت کے لیے سیرت شیخین پر عمل کرنے کی شرط عائد کی گئی تھی جسے آپ نے رد کر دیا تھا اور اب جبکہ انہیں خلافت سونپی جاتی ہے تو بجائے اس کے وہ حضرتؑ کو کسی شرط کا پابند کریں حضرت انہیں اپنی شرط کا پابند کرتے ہیں کہ وہ دوسروں کی صوابدید کی بجائے اپنی صوابدید پر عمل پیرا ہوں گے اور انہیں بھی وہ راہ اختیار کرنا ہوگی جسے آپ تجویز فرمائیں اور بہتر سمجھیں، یہ حضرت کی اصول پسندی کی نمایاں فتح ہے، جس کے سامنے مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور بلا چون و چرا اسے تسلیم کرلیا اور صحیح اصول کی پاسداری دوسروں کو جھکنے پر مجبور کر دیا کرتی ہے۔

غرض حضرت کی منظوری کے بعد ۲۵۔ذی الحجہ بروز جمعۃ المبارک ۳۵ ہجری کو عمومی بیعت کا اہتمام کیا گیا، ایمانِ مجسم، امیرالمومنین علیہ السلام بیت الشرف سے نکل کر مسجد نبوی کی طرف آئے جہاں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور حضرت بے حد سادگی کے ساتھ سر پر معمولی عمامہ رکھے ایک ہاتھ میں جوتے اٹھائے اور دوسرے ہاتھ میں عصا کے بجائے کمان لیے تلوار حمائل کیے مسجد میں داخل ہوئے، حضرت کی آمد پر مجمع میں حرکت پیدا ہوئی، آپؑ مجمع کو چیرتے ہوئے منبر کی طرف بڑھے اور اُس مقام پر جا بیٹھے جہاں رسول اللہ (ص) بیٹھا کرتے تھے، کمان پر ٹیک لگائی اور بیعت کا

سلسلہ شروع ہوگیا، طلحہ وزُبیر نے پہل کی اور بیعت کے لیے ہاتھ بڑھائے، حسین دیار بکری اپنی کتاب تاریخ خمیس جلد۲ص۲۷۶ میں لکھتے ہیں:

''**اول من بایعه طلحة و الزبیر ثم سائر الناس** ''سب سے پہلے طلحہ وزُبیر نے بیعت کی اور پھر دوسرے لوگوں نے۔

اس کے بعد لوگ بیعت کے لیے آپ پر اس طرح ٹوٹ پڑے جس طرح پیاسے پانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں، اصحاب بدر میں سے کوئی فرد ایسا نہیں تھا جس نے بیعت نہ کی ہو، چنانچہ علامہ ابن حجر مکی صواعق محرقہ ص۱۱۸ میں فرماتے ہیں:

''**فَلَمْ یَبْقَ مِنْ اَهْلِ بَدْرٍ اِلَّا اَتٰی عَلِیًّا فَقَالُوا مَانَرٰی اَحَدًا اَحَقُّ مِنْکَ مُدَّ یَدَکَ نُبَایِعْکَ فَبَایِعُوْهُ**''

اہلِ بدر میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا اور سب کے سب حضرت کے پاس آئے اور کہا ہم آپ سے زیادہ کسی کو خلافت کا حقدار نہیں سمجھتے، ہاتھ بڑھایئے تاکہ ہم آپ کی بیعت کریں، چنانچہ انہوں نے بیعت کی۔

ان بیعت کرنے والوں میں صرف اہلِ مدینہ ہی نہیں تھے بلکہ یمن، مصر اور عراق کے باشندے بھی تھے، سب نے خوشی سے بیعت کی اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اس طرح سے متفقہ طور پر آپ کی خلافت تسلیم کر لی گئی۔

تاریخ یعقوبی ج۲ص۱۵۵ میں ہے: بیعت کی تکمیل کے بعد خطیب انصار ''ثابت بن قیس'' نے انصار کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا اور انصار نے بیعت کے سلسلے میں عمومی طور پر بڑی سرگرمی سے حصہ لیا مگر ان میں سے چند نے جو''گروہِ عثمانی'' کہلاتے تھے، بیعت سے انکار کیا، چنانچہ حسان بن ثابت، کعب بن مالک، مسلمہ بن مخلد، ابوسعید خدری، محمد بن مسلمہ، نعمان بن بشیر، زید

بن ثابت، رافع بن خدیج، فضالہ بن عُبید اور کعب بن عُجرہ نے بیعت نہیں کی، ان کے علاوہ کچھ اور لوگوں نے بھی بیعت سے پہلو تہی کی، چنانچہ قدامہ بن مظعون، عبداللہ بن سلام، مغیرہ بن شعبہ، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر، صہیب بن سنان، سلمہ بن وقش، اسامہ بن زید اور وہبان بن سیفی، بیعت سے منہ موڑ کر گھروں میں بیٹھے رہے، یہ لوگ بھی حضرت عثمان سے وابستہ رہے تھے اور یہی وابستگی ان کے لیے بیعت سے مانع رہی۔

امیر المومنینؑ نے کسی شخص کو آزادی رائے سے محروم نہیں کیا بلکہ ہر شخص کو اس کی رائے پر آزاد چھوڑ دیا نہ کسی پر دباؤ ڈالا نہ کسی پر سختی گوارا کی، جس نے برضا و رغبت بیعت کرنا چاہی اس سے بیعت لے لی اور جس نے بیعت سے علیحدگی اختیار کرنا چاہی اس سے مطالبہ نہ کیا۔

ایمان مجسم امیر المومنین علیؑ کے دست حق پرست پر بیعت کرنے والوں میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جنہوں نے بیعت کے موقع پر بڑی سرگرمی دکھائی مگر بعد میں بیعت سے منحرف ہوگئے، ان میں طلحہ و زبیر بھی شامل تھے، جنہوں نے مجمع عام میں بیعت کی اور جب انہیں اپنے توقعات پورے ہوتے نظر نہ آئے تو بیعت توڑ کر الگ ہوگئے۔

ایمان مجسم امام معظم امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی بیعت سے دینی و دنیوی اقتدار ایک مرکز پر جمع ہوگیا، دنیوی اقتدار کو حکومت سے اور دینی اقتدار کو خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حکومت کی تشکیل میں تو عوامی انتخاب کارفرما ہوسکتا ہے، مگر خلافت میں نہ انتخاب کا دخل ہوتا ہے اور نہ کسی اصول کے تحت اسے کسی کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ خلافت، اللہ کی جانب سے اس کے احکام کے اجرأ و نفاذ کے لیے وجود میں آتی ہے، جو نبوت کی طرح عوام کے چناؤ پر منحصر نہیں ہوتی، اس لئے کہ اسلام

کا کوئی جزوی اور فرعی حکم بھی ایسا نہیں ہے، جسے عوام کی رائے پر چھوڑ اگیا ہو تو خلافت ایسے اہم معاملہ کو جس پر حیات ملی اور بقائے دین کا انحصار ہے عوام کی رائے پر کیونکر چھوڑا جا سکتا ہے، اس اعتبار سے امیر المومنینؑ کی خلافت جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہے، عوام کی رائے اور ان کی بیعت پر موقوف نہ تھی، اس مرحلے پر جس خلافت کی پیشکش آپ کے سامنے کی گئی وہ صرف ایک انتخابی اصول کے تحت اقتدار کی منتقلی تھی، جسے جمہوری خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی لیے امیر المومنینؑ نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا تھا اور اصرار کے بعد اسے قبول کیا تو اس مقصد کے پیشِ نظر کہ قیام حجت کے بعد ان فرائض کو انجام دے سکیں، جو بحیثیت امام و جانشینِ رسولؐ ان پر عائد ہوتے تھے، چنانچہ اس مقصد کو حضرت نے اپنے ایک خطبہ میں یوں بیان فرمایا ہے:

''لَوْلَا حُضُوْرِ الْحَاضِرِ وَ قِیَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُوْدِ النَّاصِرِ وَ مَا اَخَذَ اللّٰهُ عَلَی الْعُلَمَآءِ اَنْ لَّا یُقَآرُّوْا عَلٰی كِظَّةِ ظَالِمٍ وَلَا سَغَبِ مَظْلُوْمٍ لَاَلْقَیْتُ حَبْلَهَا عَلٰی غَارِبِهَا وَ لَسَقَیْتُ آخِرِهَا بِكَاسِ اَوَّلِهَا''

اگر بیعت کرنے والوں کی موجودگی اور مدد کرنے والوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے علماء سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی بھوک پر سکون وقرار سے نہ بیٹھیں، تو میں خلافت کی باگ ڈور اسی کے کندھے پر ڈال دیتا اور اس کے آخر کو اسی پیالے سے سیراب کرتا جس سے اس کے اول کو سیراب کیا تھا۔

دنیوی اقتدار اوروں کے لیے اوج و سربلندی کا باعث ہو تو ہو مگر امیر المومنینؑ کی قدر و منزلت اس سے بالاتر ہے کہ حکومت و اقتدار ان کے لیے وجہ

افتخار بن سکے، اس ظاہری خلافت سے پہلے نہ آپ میں کوئی کمی تھی اور نہ اب کوئی اضافہ ہوا، جہاں ہر سربلندی سرنگم ہو، وہاں تخت و تاج کی بلندی و رفعت کا سامان مہیا نہیں کرتی اور جہاں امامت کا جوہر ضیابار ہو وہاں شہنشاہیت کا کروفر زینت افزا نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے تاریخ یعقوبی ج ۱ ص ۱۳۵ میں ہے: صعصعہ بن صوحان عبدی نے بیعت کے موقع پر حضرت امیرؑ سے مخاطب ہو کر کہا:

''والله امیرَالمومنین! لقد زینت الخلافة و اما زانتک و رفعتها و ما رفعتک ولهی احوج الیک منک الیها''

خدا کی قسم اے امیر المومنین! آپ نے خلافت کو زینت بخشی ہے خلافت نے آپ کو زینت نہیں دی، آپ اسے بلندی پر لے گئے، اس نے آپ کا پایہ بلند نہیں کیا، آپ کو اس کی اتنا ضرورت نہیں جتنا اسے آپ کی ضرورت تھی۔

تاریخ خطیب بغدادی جلد ۱ ص ۱۳۵ میں ہے ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل کے سامنے خلافت کی بحث چھڑی تو انہوں نے کہا:

''یا هؤلاء قد اکثرتم فی علی و الخلافة و الخلافة و علی، ان الخلافة لم تزین علیا بل علی زینها''

اے لوگو! تم علیؑ اور خلافت، خلافت اور علیؑ کو طول دے رہے ہو، خلافت نے علیؑ کے لیے زینت کا سامان نہیں کیا بلکہ علیؑ نے خلافت کو زینت دی ہے۔

ایمان مجسم کا طرزِ حکومت

زمانہ قدیم سے انسانوں پر شہنشاہی نظام مسلط رہا ہے جس کے نتیجہ میں انسانی مزاج اقتدار پرستی کا خوگر ہوگیا اور جذبہ نیاز مندی پرستش کی حد کو پہنچ گیا، اسی لیے بعض قدیم ممالک کے باسیوں نے اپنے حکمرانوں کے بارے میں یہ نظریہ قائم کرلیا تھا کہ وہ پیدا ہی حکمرانی کے لیے ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ پیدائشی طور پر ان کے غلام اور خدمتگزار ہیں اور ان کا مقصد حیات ہی یہی ہے کہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے ان کے عیش وعشرت کا سامان کرتے اور ان کے شبستانوں کی رونق بڑھاتے رہیں۔

جب سرزمین عرب پر اسلام کی آواز بلند ہوئی تو اس وقت کے حالات بھی کچھ ایسے تھے۔ کمزور طاقتور کے سامنے بے بس تھے، غریب سود خواروں کی گرفت میں اور غلام آقاؤں کے پنجے میں جکڑے ہوئے تھے، اسلام نے ان جکڑے بندھے انسانوں کو حریت و مساوات کا مژدہ سنایا، رنگ ونسل کا امتیاز مٹایا۔ غلاموں کو انسانی حقوق سے بہرہ یاب کیا اور انسانوں پر انسانوں کی حکومت کو ختم کر کے حکومتِ الٰہیہ کا پیغام دیا۔ حکومت الٰہیہ کا مطلب یہ ہے کہ صرف خدا کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کا اعتراف کیا جائے اور دل کی گہرائیوں میں عقیدہ سمولیا جائے کہ وہی ہمارا اور سب کا مالک ہے، وہ ہمارے ہر قول وفعل کے سننے اور دیکھنے والا ہے اور سب اسی کے احکام کے پابند اور اسی کے سامنے جوابدہ ہیں۔ اس حاکمیت کا اعتراف استبدادیت کے بتوں کو پاش پاش کر کے دل ودماغ میں برادری اور برابری کا احساس پیدا کرتا ہے اور تمام ناروا پابندیوں سے چھڑا کر فطری اور طبعی آزادی کی راہ پر لے چلتا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا مطمحِ نظر حکومت یا سیاسی اقتدار نہ تھا بلکہ مقصدِ بعثت ''حکومت الٰہیہ'' کی تشکیل اور خداوندی اقتدار کا قیام تھا، چنانچہ انہوں نے درسِ توحید دے کر تمام مسلمانوں کو ایک مرکز وحدت پر جمع ہونے کی دعوت دی، تاکہ اللہ کے

احکام کا اجرا اور اس کے قوانین کا نفاذ کر کے ایک پاک وپاکیزہ اور معیاری معاشرہ قائم کریں جس میں ظلم کی بجائے عدل وانصاف کو جہالت کی بجائے علم وحکمت کو اور انسانوں کی بجائے اللہ کی حاکمیت کو فروغ حاصل ہو، تاکہ فرزندانِ توحید اللہ کے علاوہ کسی اور کے آگے سرنگوں نہ ہوں۔

سرکار رسالت مآب ﷺ نے صرف اپنے دور ہی میں حکومتِ الٰہیہ کی تشکیل نہیں کی بلکہ اپنے بعد کے لیے بھی ایک ایسے ابدی نظام کی راہنمائی فرما گئے، جو اللہ کی حاکمیت پر مبنی تھا، اس نظام کا نام ''خلافتِ الٰہیہ'' ہے، جس کے قیام کا ذمہ دار وہ ہوگا جو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اپنے قول وفعل سے عوام کو الٰہی حاکمیت کے تصور سے ادھر اُدھر نہ ہونے دے اور ہر حرکت وسکون اور ہر قول وفعل میں اللہ کے احکام کا بندہ ہو اور اس کے قوانین کا نگران ہو اور خود اس کا مقرر کردہ ہو تاکہ زمین میں اسے اللہ کا نمائندہ سمجھ کر اس کے احکام کے آگے سر تسلیم واطاعت خم کیا جائے، کیونکہ خدا کے احکام کی تکمیل اسی کے احکام کی بجا آوری میں مضمر ہوتی ہے، چنانچہ سورہ نساء آیت ۵۹ میں ارشادِ الٰہی ہے:

''اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ''

اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ اور جو تم میں سے صاحبانِ امر ہوں ان کی اطاعت کرو۔

ایمانِ مجسم، امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی حکومت صحیح معنوں میں اسلامی حکومت تھی اور آپؑ نے حکومت کی ذمہ داری اسی شرط پر قبول کی تھی کہ اسے قالب میں ڈھالنے اور منہاج نبوت پر چلانے میں کوئی دخل انداز ہونے کی کوشش نہ کرے، چنانچہ آپؑ نے حالات کی تبدیلی اور انسانی مزاج کی تغیر پذیری کے باوجود حکومت ربانیہ کے تقاضوں کے مطابق حکومت کی تشکیل کی اور رسول خدا ﷺ کے

طرزِ حکومت پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھی، اگر چہ آپ کا دورِ حکومت انتہائی مختصر اور وہ بھی شورش اور ہنگاموں کی آماجگاہ بن گیا، مگر اس تھوڑے سے عرصے میں بھی اسلامی حکومت کے خدوخال کو اس طرح نمایاں کر کے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا کہ دورِ نبوی کی تصویر سامنے آ گئی، اگر آپ زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں نہ لیتے تو مسلمانوں پر حکومتِ اسلامیہ کا حقیقی مفہوم واضح نہ ہوتا اور اسے بھی مادی حکومتوں کی طرح ایک حکومت تصور کر لیا جاتا، جس کا مقصد ملک گیری اور کشور کشائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، مگر آپ نے اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے کر ان تمام پردوں کو ایک ایک کر کے اٹھا دیا جو اسلامی حکومت پر ڈالے گئے تھے اور اپنے طرزِ عمل سے واضح کر دیا کہ اسلامی اصول و آئین کے ماتحت حکومت کا قیام اور ہے اور سیاسی تقاضوں کے مطابق اسلام کا نام لے کر حکومت کی تشکیل ہے۔

اگر آپ کو ذاتی اقتدار کی خواہش ہوتی تو آپ کو مشورے دیئے جا رہے تھے کہ سابقہ حکومتوں کے عُمال کو ان عہدوں سے نہ ہٹائیں تاکہ حکومت کے استحکام کو نقصان نہ پہنچے، مگر آپ نے اس نقصان کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا، کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ اگر انہیں ان کے عہدوں پر بحال رہنے دیا گیا تو وہ خداوندی اقتدار کی بجائے اپنا اقتدار قائم کریں گے، حالانکہ آپ نے حکومت قبول ہی اس لیے کی تھی کہ شخصی اقتدار کو ختم کیا جائے۔

ایمان مجسم مولائے کائنات امیر المومنین علیہ السلام کو اگر اقتدار عزیز ہوتا تو ہر جائز و ناجائز سے آنکھیں بند کر کے تمام استحکامی تدبیروں پر عمل کرتے اور شر انگیز عناصر سے سازگاری کر کے اپنا دور کامیاب بناتے مگر حضرت کی نگاہوں میں شخصی حکومت کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، ان کی نظروں میں اگر کسی چیز کی اہمیت تھی تو امت کی عملی تربیت اور اسلامی شعائر کے احیاء کی۔

چنانچہ ایک مرتبہ اپنا جوتا گانٹھتے ہوئے ابن عباس سے پوچھا کہ اس جوتے کی قیمت کیا ہو گی؟ کہا اب تو اس کی قیمت کچھ بھی نہیں ہے، فرمایا:

’’ ’’خدا کی قسم! اگر میرے پیشِ نظر حق کا قیام اور باطل کا مٹانا نہ ہوتا تو تم لوگوں پر حکومت کرنے سے یہ جوتا مجھے کہیں زیادہ عزیز ہے، یہ بات نہج البلاغہ میں موجود ہے۔

عُمال اور حُکام کے تقرر کا معیار

چونکہ امیر المومنین علی علیہ السلام کی سیاست عین اسلامی سیاست تھی اور اسلامی سیاست ایک ایسا نظام ہے جس میں زندگی کے تمام شعبوں کو دین سے وابستہ کر دیا گیا ہے اسی لیے حکومت علویہ کا کوئی شعبہ معیشت سے متعلق ہو یا معاشرت سے، رعایا سے متعلق ہو یا راعی سے، دین کے حدود سے خارج تصور نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ عوام اپنے حکام کے طرزِ عمل سے متاثر ہوتے ہیں اور وہی طریقہ اختیار کرتے ہیں جو ان کے حکام کا ہوتا ہے، اگر حکام بلند کردار، نیک سیرت اور اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ ہوں گے تو عوام میں بھی حسنِ عمل کا جذبہ پیدا ہو گا اور اگر خود غرض، رشوت خور اور استحصال پسند ہوں گے تو رعایا بھی خود غرضی کی ڈگر پر چل نکلے گی اور تمام اخلاقی قدروں کو اپنے ذاتی مفاد کی بھینٹ چڑھا کر ملکی فضا کو مکدر کر کے رکھ دے گی، جس کا نتیجہ انتشار، بے اطمینانی، بدامنی اور آخر میں حکومت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو گا، اس لیے مملکت کی بہبود اور عوام کی فلاح کا تقاضا یہ ہے کہ حکام و عمال کے تقرر میں باریک بینی سے کام لیا جائے، ان کے اطوار و عادات پرکھ لیے جائیں اگر وہ معیار پر پورا اتریں تو ان کا تقرر عمل میں لایا جائے۔

امیر المومنین علیہ السلام تقویٰ، دیانت اور صلاحیتِ کار ہی کو عہدوں کا معیار سمجھتے

تھے اور اپنے دورِ حکومت میں کلیدی عہدے اُنہی لوگوں کے سپرد کیے جن کی امانت، دیانت، نیکی اور راستبازی پر پورا اعتبار تھا، چنانچہ ابن عبد البر اپنی کتاب الاستیعاب ج ۳ ص ۴۷ میں لکھتے ہیں: ''حضرت علیؑ اُنہی لوگوں کو والی و حاکم مقرر کرتے جو امین اور دیانتدار ہوتے'' اس سلسلے میں خاندانی اثرات، قبائلی طاقت، قرابت اور سفارش سے قطعاً متاثر نہ ہوتے تھے، صرف دیانت اور نظم وضبط کی اہلیت کو دیکھتے یا آج کی اصطلاح میں میرٹ کو پیشِ نظر رکھتے تھے اور اپنے عمال کو بھی ہدایت کرتے تھے کہ سفارش پر عہدے نہ دیں، چنانچہ ایک موقع پر فرمایا: ''لَا تَقْبَلَنَّ فِیْ اِسْتِعْمَالِ عُمَّالِکَ وَ اُمَرَائِکَ شَفَاعَةً اِلَّا شَفَاعَةَ الْکِفَایَةِ وَالْاَمَانَةِ '' کارندوں اور کار پردازوں کو عہدہ دینے میں کسی کی سفارش قبول نہ کرو، بلکہ یہ دیکھو کہ وہ امین اور اس کام کے لیے موزوں ہیں۔

عمال کا محاسبہ

عمال حکومت مملکت میں تعمیر اور تخریب دونوں کا کردار ادا کر سکتے ہیں، ان کی تعمیری صلاحیتوں سے نظم مملکت سنورتا ہے اور انہی کی تخریبی کاروائیوں سے نظم و نسق بگڑتا ہے، حزم واحتیاط اور احساس فرض کا تقاضا یہ ہے کہ سربراہِ مملکت عمال کے حالات و معاملات سے باخبر رہے، امیر المومنین علیہ السلام انسانی مزاج کی بے ثباتی کو خوب سمجھتے تھے وہ آنکھ بند کر کے اعتماد کر لینے کے قائل نہ تھے، ان کے رہن سہن، طور طریقہ اور چھوٹے بڑے معاملہ پر نظر رکھتے، ان کی کارکردگیوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی کوتاہیوں پر تنبیہ وسرزنش کرتے، بیت المال کا حساب جانچتے اور جائز و ناجائز مصرف کو دِقّتِ نظر سے دیکھتے، اگر کسی کے متعلق خیانت کی خبر آتی تو نظریں آسمان کی طرف اٹھا کر بارگاہِ خداوندی میں عرض کرتے: جیسا کہ استیعاب ج ۳ ص ۴۸ میں ہے:

''بارالہا! تو جانتا ہے کہ میں نے انہیں تیری مخلوق پر ظلم کرنے اور تیرے حق کو نظر انداز کرنے کا حکم نہیں دیا تھا''

پھر عملاً مواخذہ اور محاسبہ کرتے اور جرم کی سبکی اور سنگینی کے لحاظ سے کسی کو فقط تنبیہ وسرزنش کرتے، کسی سے غبن کیا ہوا سرمایہ اگلواتے اور کسی کو قید و بند کی سزا دیتے، اس سلسلے کے متعدد واقعات تاریخ میں درج ہیں۔

ایمان مجسم اور محکمہ قضا

حکومت کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ رعایا کے نزاعی امور کا بے لاگ فیصلہ کرنے کے لیے ایسی عدالت گاہیں قائم کرے جہاں پر ادنی واعلیٰ اور امیر وغریب کو حصولِ انصاف کا یکساں موقع ہو، تاکہ کمزور کی حق تلفی نہ ہونے پائے اور مظلوم کسی دادرسی سے محروم نہ رہے، اگر کمزور و درماندہ افراد کو حکومت کی طرف سے یہ تحفظ نہ ہو تو نہ اجتماعی نظم باقی رہ سکتا ہے اور نہ ہی امن کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اور کمزور و ناتواں افراد اگر ظلم سہتے رہیں گے تو وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جائیں گے آخر کار اندرونی گھٹن انہیں بغاوت پر آمادہ کرے گی اور جب بغاوت کا آتش فشاں پھٹتا ہے تو حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کیے بغیر نہیں رہتا، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ''اَلْمُلْکُ یَبْقیٰ مَعَ الْکُفْرِ وَلَا یَبْقٰی مَعَ الظُّلْمِ '' کفر کے ساتھ تو ملک باقی رہ سکتا ہے ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتا۔

امیر المومنینؑ نے اپنے دور خلافت میں محکمہ قضا کو خاص اہمیت دی اور ہر مرکزی مقام پر اس کا شعبہ قائم کیا اور ان لوگوں کو منصبِ قضا کے لیے نامزد فرمایا جو تقویٰ، دیانت اور علمی اہلیت کے لحاظ سے اسلام کے مقرر کردہ معیار پر پورا اترتے تھے، خود حضرت امیر علیہ السلام بھی رسالت مآبؐ کے دور میں منصب قضا پر فائز رہے

تھے اور اپنی انصاف پروری، معاملہ فہمی اور نکتہ رسی کا سکہ دلوں پر بٹھا چکے تھے۔

اس عملی تجربہ کے بعد ان سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا کہ محکمہ قضا کن خطوط پر قائم ہونا چاہیے، حکام عدلیہ کے فرائض کیا ہیں اور کس نہج پر انہیں تربیت دینا چاہیے کہ وہ رشوت، سفارش اور جنبہ داری سے بچ کر انصاف کے تقاضوں کو پورا کرسکیں۔

اسلام مذہبِ عدل ہے اور عدل ہی کو ہر شعبے میں کارفرما دیکھنا چاہتا ہے اور محکمہ قضا کا تو بنیادی مقصد ہی قیام عدل ہے، چنانچہ سورہ نساء کی آیت ۵۸ میں حکم ہوتا ہے:

''وَ اِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ''

جب لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرو تو عدل وانصاف سے فیصلہ کرو۔

اس عدل کا تقاضا ہے کہ مقدمہ کی سماعت کے دوران فریقین سے یکساں طرزِ عمل اختیار کیا جائے اور دعویٰ، جوابِ دعویٰ پر یکساں توجہ دی جائے، بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے اگر قاضی سلام کرے تو الگ الگ سلام کرنے کی بجائے ایک ساتھ سلام کرے، جواب سلام دے تو ایک ساتھ جواب دے۔

کھڑا ہونے کو کہے تو دونوں کو، بیٹھنے کے لیے کہے تو دونوں کو، کسی ایک فریق کی طرف اپنا میلان ظاہر نہ کرے، تاکہ یکطرفہ التفات دوسرے فریق کے دل میں انصاف سے محرومی کا احساس پیدا نہ کردے، اس کی ایک عمدہ مثال یہ ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام صفین سے پلٹتے ہوئے ایک زرہ کھو بیٹھے، چند دنوں کے بعد ایک نصرانی کو وہی زرہ پہنے ہوئے دیکھا تو اس سے کہا یہ زرہ تو میری ہے، اس نے اپنی ملکیت ظاہر کیا، حضرت نے اس کا مقدمہ قاضی شریح کی عدالت میں دائر کردیا۔ قاضی کے دریافت کرنے پر اس نصرانی نے کہا یہ میری زرہ ہے اور میرا قبضہ میری ملکیت کی

دلیل ہے۔ قاضی نے آپ کی طرف متوجہ ہوکر پوچھا: آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ زرہ آپ کی ہے؟ حضرت نے فرمایا:

''هٰذِهِ دِرۡعِیۡ لَمۡ اَبِعۡ وَ لَمۡ اَهَبۡ'' یہ زرہ میری ہے نہ میں نے اسے بیچا ہے اور نہ ہبہ کیا ہے۔

قاضی نے دیکھا کہ ایک طرف یہ احتمال بھی نہیں کہ دعویٰ غلط کیا ہوگا اور دوسری طرف شرعی قانون کا تقاضا یہ ہے کہ قبضہ کو دلیل ملکیت سمجھا جائے جب تک اس کے خلاف ثبوت مہیا نہیں ہوتا، فیصلہ حضرت کے خلاف جاتا ہے، قاضی کو آپ کے خلاف فیصلہ دینے میں تردد ہوا، حضرت نے اس کی تردد کی حالت دیکھی تو فرمایا تم وہی فیصلہ کرو جو منصب قضا کا تقاضا ہے، چنانچہ فیصلہ حضرت کے خلاف ہوا اور وہ زرہ اس نصرانی کو مل گئی۔

اس واقعہ کا تجزیہ کیا جائے تو عدل کے ایسے گوشے سامنے آتے ہیں جو حضرت کی عدل پسندی اور انصاف شعاری کا روشن ثبوت ہیں، آپ خود ہی سربراہِ مملکت ہونے کی حیثیت سے اس کا فیصلہ کرسکتے تھے اور وہ فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوتا، مگر آپ نے پسند نہ کیا کہ مدعی فیصلہ خود کرے، اس لیے اس کا فیصلہ قاضی کے سپرد کیا اور قاضی سے یہ کہنے کی بجائے کہ اس نے چوری کی ہے یا چوری کرنے والے سے خریدی ہے یہ کہا میں نے نہ اس کے ہاتھ بیچی ہے نہ ہبہ کی ہے۔

اگرچہ مقصد یہی تھا کہ یہ چوری کا مرتکب ہوا ہے کیونکہ جب بیچی بھی نہیں گئی اور ہبہ بھی نہیں کی گئی تو پھر چوری ہی کے ذریعہ اس تک پہنچ سکتی ہے، اگر حضرت اسکی طرف چوری کی نسبت دیتے تو خلاف واقعہ نہ ہوتا، مگر آپؑ اسے چور کہہ کر نہ اس کے جذبات کو ٹھیس لگانا چاہتے ہیں اور نہ اس کے وقار کو مجروح کرنا چاہتے ہیں، اس لیے کہ آپ کی نظروں میں ایک زرہ کے مقابلے میں انسانی اقدار کا تحفظ زیادہ عزیز تھا،

اگر چہ فیصلہ آپ کے خلاف ہوا اور مقدمہ ہار گئے، مگر حقیقت میں حضرتؑ کی یہ اخلاقی جیت تھی، جس کا ردعمل یہ ہوا کہ اس نصرانی کو جیت کے باجود اپنی شکست کا احساس ہوا ور اس کے ضمیر نے اسے جھنجھوڑا اور جب عدالت گاہ سے باہر نکلا تو حضرت سے آنکھیں چار نہ کر سکا، دبے لہجے میں معذرت کرتے ہوئے کہا: ''یہ زرہ آپؑ کی ہے، میں نے صفین کے راستے سے اسے اٹھایا تھا، اب یہ زرہ حاضر ہے اور میں آپ کی بلند نفسی، عالی ظرفی اور عدل پسندی کو دیکھ کر اسلام قبول کرتا ہوں، حضرتؑ زرہ کی واپسی پر تو کیا خوش ہوتے البتہ اس کے اسلام لانے پر ضرور خوش ہوئے اور وہ زرہ اسے ہبہ کر دی اور ایک گھوڑا بھی اس کے ساتھ مرحمت فرمایا''

ایمان مجسم اور قضا وشہادات

شرعی احکام کے مطابق باہمی تنازعوں اور جھگڑوں کے تصفیہ کا نام قضا ہے، اس کام کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ عدل وانصاف کا حصول، حقوق عامہ کا تحفظ اور تمدنی نظم کا نظام اسی سے وابستہ ہے، لیکن جتنا یہ فریضہ اہم ہے اتنا ہی گوناگوں پیچیدگیوں کی وجہ سے کٹھن اور دشوار بھی ہے اور اچھے اچھے ذی فہم صحیح نتیجہ پر پہنچنے سے قاصر ہوتے ہیں، اور اگر پہنچ بھی جائیں تو مالی مفادات اور تعلقات و روابط کی فولادی دیواریں ان کی راہ میں حائل ہوجاتی ہیں اور انصاف وحق رسی کی بجائے ضیاع حقوق پر آمادہ ہوجاتے ہیں، صرف وہی افراد اس سے عہدہ برآ ہوسکتے ہیں جن کا قلب وضمیر مادی آلائشوں سے پاک وصاف ہو اور احساس فرض کے پیشِ نظر اس منصب کی ذمہ داریوں کی تکمیل میں فرق نہ آنے دیں۔

اس منصب کا تقاضا یہ ہے کہ قاضی جو فیصلہ کرے پوری دیانتداری کے ساتھ کرے اور بے جا رُو رعایت، جانبداری، خیانت اور بے راہروی سے کنارہ کش

رہے، فیصلہ کرنے کے لیے رشوت نہ لے، خواہ فیصلہ صحیح ہی کرنا ہو، رشوت کبھی تحفہ وہدیہ یعنی گفٹ کے نام سے بھی پیش کی جاتی ہے، لہذا ان لوگوں سے جنہوں نے اس کے ہاں مقدمہ دائر کر رکھا ہے، تحفہ قبول کرنے کا جواز نہیں ہے، جب تک دعویٰ اور جواب دعویٰ سن کر معاملہ کی تہہ تک نہ پہنچے فیصلہ نہ کرے، غصہ اور اونگھ کی حالت میں فیصلہ نہ کیا جائے، اس سلسلے میں کسی سے مشورہ اور رائے نہ لی جائے کیونکہ دین کے احکام وضوابط مشورہ کے محتاج نہیں ہیں اور نہ ہی قیاس ورائے سے طے پاتے ہیں، مشورہ، جنگ یا دنیوی مصالح کے سلسلہ میں ہوتا ہے اور دین رائے کے تابع نہیں ہوتا، بلکہ احکامِ شرع کے اتباع کا نام ہے اور قاضی کو چاہیے کہ فریقین کے دعویٰ میں سے ایک فریق کو اپنی توجہ کا مرکز قرار نہ دے، بلکہ دونوں سے یکساں رویہ رکھے۔

ایمانِ مجسم امیر المومنین علیہ السلام کی ذات والا صفات میں صحیح علمی ذوق اور قوت فیصلہ کے امتزاج نے واقعات سے اخذ نتائج کا ملکہ بدرجہ اتم پیدا کر دیا تھا اور آپ ان پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کے لیے دوسرے لوگ جن سے عاجز و درماندہ ہوجاتے تھے اس طرح حل کر دیتے کہ اصل واقعہ کا ایک ایک گوشہ بے نقاب ہوکر سامنے آجاتا اور یہ حضرت کا وہ امتیازی وصف تھا، جس میں کوئی آپ کا مثیل ونظیر نہ تھا، چنانچہ اکابر صحابہ حل قضایا اور فصل خصومات میں آپ کی طرف رجوع کرتے اور آپ کے فیصلے پر مطمئن ہوجاتے اور اس کا برملا اعلان بھی کرتے ہیں۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی قوت فیصلہ اور مہارت قضا کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمانِ ذی شان کفایۃ الطالب ص ۱۹۰ میں ہے، آپ فرماتے ہیں: ''اَعْلَمُ اُمَّتِی بِالسُّنَّةِ وَالْقَضَآءِ بَعْدِیْ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ'' میری امت میں میرے بعد سب سے بڑھ کر سنت وقضا کے جاننے والے علی بن ابی طالب ہیں۔

صواعق محرقہ ص ۱۶۶ میں حضرت عمر فرماتے ہیں: ''علی اقضانا'' علیؑ ہم سب سے

بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔

کتاب الاستیعاب ج۳ ص۴۱ میں ہے، حضرت ابن مسعود کہتے ہیں: ''کُنَّا نَتَحَدَّثُ اِنَّ اَقْضٰی اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ عَلِیٌّ''، ہم یہ تذکرہ کیا کرتے تھے کہ اہلِ مدینہ میں علیؑ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں، فتح الباری جلد۸ ص۱۳۶ میں ہے ابو سعید خدری اور قتادہ انصاری کہتے ہیں: ''اَقْضَاهُمْ عَلِی'' سب لوگوں سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والے علیؑ ہیں۔

ایمان مجسم، امیر المومنین امام علی علیہ السلام کے سامنے جو بھی مقدمات پیش ہوتے آپ ان کا فیصلہ قرآن وسنت کے مطابق فرماتے جیسا کہ امالی شیخ مفید میں ہے، امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ''مَا رَأَیْتُ عَلِیًّا قَضٰی قَضَآءً اِلَّا وَوَجَدْتُ لَهٗ اَصْلًا فِی السُّنَّةِ''، میں نے علی علیہ السلام کے جس فیصلہ پر نظر کی اس کی اصل و بنیاد سنت میں موجود پائی۔

باب مدینۃ العلم کا ہر فیصلہ چونکہ کتاب وسنت کی بنیاد پر ہوتا، اس لیے وہ آخر کی حیثیت رکھتا تھا، جس میں نہ رد و بدل کی گنجائش ہوتی تھی اور نہ ہی ترمیم و تنسیخ کی، چنانچہ مستدرک الوسائل میں ہے حضرت امیرؑ خود فرماتے ہیں: ''اگر میرے پاس دو شخص کوئی جھگڑا نمٹانے کے لیے آئیں اور میں کوئی فیصلہ کروں اور پھر ایک طویل مدت کے بعد دوبارہ اسی قضیہ کو لے کر آئیں تو میرا فیصلہ وہی ہوگا جو پہلے تھا ''لِاَنَّ الْقَضَآءَ لَایَحُوْلُ وَلَا یَزُوْلُ اَبَدًا'' کیونکہ فیصلے میں نہ تو رد و بدل ہوتا ہے اور نہ ہی حکم کبھی برطرف ہوتا ہے۔

مقدمات کا فیصلہ کرنے کے سلسلے میں امیر المومنینؑ کا طریق کار یہ تھا کہ اگر ایک چیز کی ملکیت کے دو دعویدار ہوتے اور دونوں کا اس پر قبضہ ہوتا تو دونوں کو نصف، نصف کا مالک قرار دیتے، چنانچہ دو آدمیوں نے ایک اونٹ کے بارے میں دعویٰ کیا

اور دونوں نے اپنی اپنی ملکیت کے گواہ پیش کیے، حضرتؑ نے ان دونوں سے قسم کا مطالبہ کیا، ان میں سے ایک نے قسم کھانے سے انکار کر دیا اور دوسرے نے قسم کھائی، آپؑ نے وہ چوپایہ قسم کھانے والے کے حوالے کر دیا، اگر دونوں گواہ پیش کرتے مگر ان کی تعداد میں فرق ہوتا تو ان کی کمی بیشی کے اعتبار سے فیصلہ کرتے، چنانچہ دو شخصوں نے ایک خچر کی ملکیت کا دعویٰ کیا، ایک نے پانچ گواہ اور دوسرے نے دو گواہ ملکیت کے پیش کیے، حضرتؑ نے پانچ گواہ پیش کرنے والے کو پانچ حصوں کا اور دو گواہ پیش کرنے والے کو دو حصوں کا مالک قرار دیا اگر کوئی پیچیدہ صورتحال پیش آتی تو قرعہ سے کام لیتے، چنانچہ یمن میں ایک چھت کے بیٹھنے سے گھر کے افراد دب کر ہلاک ہو گئے مگر دو کمسن بچے زندہ بچ رہے، ان میں سے ایک آزاد تھا اور ایک غلام، مگر آزاد اور غلام میں تمیز نہ ہو سکی، حضرت کے سامنے قضیہ پیش ہوا، آپ نے قرعہ ڈالا اور ایک کو آزاد قرار دے کر وارث ٹھہرایا اور دوسرے کو آزاد کر دیا۔

شہادات:

عدلیہ کے روبرو کسی واقعہ کو ثابت کرنے یا رد کرنے کے لیے جو بیان دیا جائے ''شہادت'' کہلاتا ہے، تا کہ حاکم اس شہادت کی روشنی میں مجرم کو اس کے جرم کی سزا دے یا کسی کا حق متاثر ہوتا ہو تو اس کی حق رسی کرے لہٰذا اگر کسی واقعہ یا حق کا اثبات کسی کی شہادت پر منحصر ہو اور اسے گواہی کے لیے طلب کیا جائے تو اسے اپنے علم و مشاہدہ کے مطابق گواہی دینا چاہیے اور اس سے پہلو تہی نہیں کرنا چاہیے، چنانچہ سورہ بقرہ آیت ۲۸۲ میں ارشاد باری ہے: ''وَلَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا'' جب گواہ گواہی کے لیے گواہ طلب کیے جائیں تو انکار نہ کریں۔

اسلام میں گواہی کے لیے عادل اور صحیح العقیدہ ہونا ضروری ہے تا کہ اس کی

گواہی پر اعتماد کیا جاسکے اور کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے، اگر وہ فاسد العقیدہ اور غیر عادل ہوگا تو اس کی گواہی قابلِ قبول نہ ہوگی، جیسا کہ مستدرک الوسائل میں امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے: ''کسی خارجی، قدری، مرجی، اموی، ناصبی اور فاسق کی گواہی صحیح نہیں ہے''

البتہ اگر فاسق صدق دل کے ساتھ تائب ہو چکا ہو تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی، چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام کے سامنے ایک ایسے شخص نے گواہی دی جس کا ایک ہاتھ اور ایک پیر چوری کے جرم میں کاٹا جا چکا تھا، حضرتؑ نے اس کی گواہی کو قابلِ قبول سمجھا، کیونکہ وہ صدقِ دل سے توبہ کر چکا تھا اور لوگوں نے بھی اس کی نیک چلنی کی تصدیق کی تھی۔

اگر گواہ غلام ہو مگر وہ عادل ہو تو یہ غلامی گواہی کو قبول کرنے سے مانع نہ ہوگی، جیسا کہ وسائل الشیعۃ میں ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے: ''لَا بَأْسَ فِیْ شَهَادَةِ الْمَمْلُوْكِ اِذَا كَانَ عَادِلًا'' غلام کی گواہی میں کوئی ہرج نہیں جبکہ وہ عادل ہو۔

اگر دو گواہوں کی گواہی میں اختلاف ہو تو اسے رد کر دیا جائے گا اور اگر دونوں شہادتوں کا عنوان تو مختلف ہو مگر ان میں باہمی لزوم پایا جاتا ہو تو وہ قابلِ قبول ہوں گی، جیسا کہ حضرت عمر کے سامنے قدامہ بن مظعون کو پیش کیا گیا اور عمرو تمیمی اور معلّی بن جارود نے گواہی دی کہ اس نے شراب پی ہے، ان میں سے ایک نے کہا: میں نے اسے شراب پیتے دیکھا ہے اور دوسرے نے کہا: میں نے اسے شراب کی قے کرتے دیکھا ہے، حضرت عمر نے امیر المومنینؑ سے دریافت کیا کہ آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں: جبکہ دونوں گواہوں کی گواہی مختلف ہے، امامؑ نے فرمایا: گواہی میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اس نے شراب پی ہے جب ہی تو شراب کی قے کی ہے۔

اگر دو گواہ کسی شخص کے بارے میں گواہی دیں کہ اس نے چوری کی ہے اور اس کی پاداش میں اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور پھر ان گواہوں میں سے ایک منحرف ہو جائے اور یہ کہے کہ مجھے اشتباہ یعنی غلط فہمی ہوئی ہے تو اسے ہاتھ کاٹنے کی آدھی دیت دینا ہوگی اور اگر دو آدمیوں نے ایک شخص کے بارے میں چوری کی گواہی دی جس پر اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا، پھر کہیں کہ ہمیں اشتباہ ہو گیا تھا تو پوری دیت دیں گے، چنانچہ دو آدمیوں نے ایک شخص کے بارے میں چوری کی گواہی دی اور حضرت نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا مگر کچھ دنوں بعد ایک اور شخص کو لائے اور کہا: ہمیں غلط فہمی ہوئی وہ چور نہ تھا جس کا ہاتھ کاٹا گیا تھا بلکہ چور یہ ہے، حضرتؑ نے حکم دیا کہ وہ دونوں پہلے شخص کے ___ قطعِ ید ___ ہاتھ کاٹنے، کی دیت دیں اور دوسرے شخص کے بارے میں ان کی گواہی رد کر دی۔

اگر کسی شخص کے بارے میں قتل یا زنا کی گواہی دی جائے اور اس کے نتیجے میں اسے قتل یا سنگسار کر دیا جائے اور بعد میں گواہ کہیں کہ ہمیں اشتباہ یعنی غلط فہمی ہوگئی تھی تو ان گواہوں پر قتل کی دیت عائد ہوگی اور اگر یہ کہیں کہ ہم نے عمداً غلط شہادت دی تھی تو وہ قتل کے سزاوار ہوں گے، چنانچہ چار آدمیوں نے ایک شخص کے بارے میں زنا کی گواہی دی اور اس شہادت کی بنا پر اسے سنگبار کر دیا گیا، بعد میں ایک گواہ منحرف ہو گیا، حضرتؑ نے فرمایا اگر وہ یہ کہتا ہے کہ مجھے اشتباہ ہو گیا تھا تو وہ ایک چوتھائی دیت دے اور اگر دو گواہ ایسا کہیں تو وہ نصف دیت دیں، اگر تین گواہ غلط فہمی کا کہیں تو یہ تین چوتھائی دیت دیں، اگر چاروں گواہ یہ کہیں کہ ہمیں اشتباہ ہو گیا تھا تو پوری دیت ادا کریں گے، لیکن اگر یہ کہیں کہ ہم نے جھوٹی گواہی دی تھی وہ قتل کے سزاوار ہوں گے۔

اگر یہ اندیشہ ہو کہ گواہوں سے ایک دوسرے کے سامنے گواہی طلب کی گئی تو ایک کی گواہی دوسروں کی گواہی پر اثر انداز ہوگی تو اس صورت میں گواہوں سے الگ الگ

گواہی لینا چاہیے، امیر المومنین ایسے موارد پر گواہوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے گواہی لیتے، تا کہ ان کے اتفاق یا اختلاف سے اصل واقعہ کی صحت یا عدم صحت واضح ہو سکے۔

چنانچہ ایک شخص سفر میں گیا اور اس کے گھر میں اس کی بیوی اور دوسری ایک یتیم لڑکی تھی، اس کی بیوی کو یہ خیال ہوا کہ کہیں اس کا شوہر اس لڑکی سے عقد نہ کر لے اُس نے کوئی نشہ آور چیز اسے پلائی اور اپنی چند ہمسایہ عورتوں کی مدد سے اس کی بکارت زائل کر دی، جب اس کا شوہر سفر سے پلٹ کر آیا تو اس کی بیوی نے بتایا کہ یہ لڑکی بدکاری کی مرتکب ہوئی ہے اور اپنی شریکِ کار ہمسائیوں سے بھی کہلوایا، چنانچہ اس بارے میں امیر المومنینؑ کی طرف رجوع کیا گیا، تو آپ نے اس عورت کو بلا کر پوچھا کہ تیرے پاس اس الزام کا ثبوت کیا ہے؟ اس نے اپنی ہمسائیوں کو گواہی کے لیے پیش کیا، آپ نے انہیں ایک دوسرے سے الگ کر کے ان میں سے ایک کو طلب کیا اور اس سے کہا: اگر تو نے صحیح واقعہ نہ بتایا تو میری تلوار سے نہ بچ سکے گی، اس نے جان کی امان مانگی، اور صحیح صحیح واقعہ بیان کر دیا، جب اس عورت کی فریب کاری ظاہر ہو گئی تو آپ نے اس عورت اور اس کی ہمسایوں سے چار سو درہم اس لڑکی کو دلوائے اور اس شخص کو کہا کہ وہ اس عورت کو طلاق دے کر علیحدہ کر دے اور اس لڑکی کو اپنے عقد میں لے لے، وسائل الشیعہ میں ہے کہ اس کے بعد آپ نے فرمایا: ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَنَا اَوَّلُ مَنْ فَرَّقَ بَیْنَ الشُّھُوْدِ اِلَّا دَانِیَالَ النَّبِی'' اللہ بزرگ و برتر ہے! میں حضرت دانیال پیغمبر کے بعد وہ پہلا فرد ہوں جس نے گواہوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے گواہی کے لیے طلب کیا۔

بنیادی حقوق:

ایمان مجسم، امام معظم، امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے جہاں محکمہ قضاو شہادات کو صحیح اسلامی خطوط پر چلایا وہاں اسلامی معاشرہ میں انسان کے بنیادی حقوق کا تحفظ بھی کیا اور یہ حقوق بنیادی طور پر چار ہیں:

۱۔ پہلا حق، حقِ حیات ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کو اس دنیا میں جینے کا حق ہے اور کسی فرد یا گروہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کو زندگی سے محروم کر دے، اسلام جو پُر امن زندگی کا داعی اور حیاتِ انسان کا پاسبان ہے، قتل کو انتہائی سنگین جرم قرار دیتا ہے اور ایک خون ناحق کو اتنی اہمیت دی ہے جتنی سب لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیئے جانے کو دی جا سکتی ہے اور امیر المومنینؑ نے اس کی مکمل پاسداری کی۔

۲۔ دوسرا حق، آزادیٔ فکر کا حق ہے، اسلام اسی فکری آزادی کا حق لے کر آیا اور تمام تقلیدی بندشوں کو توڑ کر آزادانہ فکر کی دعوت دی، اس نے نہ فکری آزادی پر پہرا بٹھایا اور نہ اس کی اجازت دی کہ مذہبیات میں جبر و اکراہ سے کام لیا جائے، امیر المومنینؑ کا دور، حریت فکر کا شاہکار ہے، آپ نے آزادی فکر کا پرچم بلند کیا اور انسان کو اس کی بھولی بسری آزادی یاد دلاتے ہوئے فرمایا: ''لَا تَکُنْ عَبْدَ غَیْرِکَ وَقَدْ جَعَلَکَ اللّٰہُ حُرًّا'' جب اللہ نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے تو دوسروں کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں میں نہ ڈالو۔

۳۔ تیسرا حق، آزادیٔ عمل کا حق ہے، یعنی انسان اپنے اعمال و افعال میں ایک حد تک آزاد ہے اور اسے اس کی مرضی کے خلاف نہ کسی کام پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ روکا جا سکتا ہے، وہ جس میں اپنے لیے بہتری سمجھے اسے کرے، جس میں ضرر و نقصان دیکھے اسے نہ کرے، بشرطیکہ اس کے اعمال مفادِ عامہ کے لیے مضر اور ملک و ملت کے لیے نقصان دہ نہ ہوں۔

امیر المومنین علیہ السلام فکری آزادی کی طرح عملی آزادی کے بھی حامی اور اس پر سختی سے عامل تھے، انہوں نے کسی فرد کو ایسے عمل پر مجبور نہیں کیا جس پر اس کا دل آمادہ اور ضمیر مطمئن نہ ہو۔

۴۔ چوتھا حق، طبقاتی مساوات کا حق ہے اور طبقاتی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ رنگ و نسل اور جغرافیائی امتیازات کو ختم کر کے انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں قابلِ احترام سمجھا جائے اور سب کے معاشرتی و معیشتی حقوق ایک سطح پر رکھے جائیں خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، امیر ہو یا غریب، کالا ہو یا گورا، کیونکہ تمام انسان ایک ہی خالق کے بندے اور ایک ہی نوع کے افراد ہیں اور رنگ و نسل کا تفاوت، قومیت و وطنیت کی تفریق، خاندانی بلندی و پستی صرف دورِ جاہلیت کے امتیازات ہیں جنہیں ایک طبقہ نے اپنی بالا دستی کے جواز کے لیے عوام کے ذہنوں میں راسخ کیا، البتہ ایک کو دوسرے پر برتری ہوسکتی ہے تو تقویٰ اور فرض شناسی سے جیسا کہ سورہ حجرات/۱۳ میں ارشاد ہوتا ہے: ''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ'' اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں قرار دیا ہے تا کہ آپس میں شناسائی ہو اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

امیر المومنینؑ اسلامی نظریہ مساوات کے علمبردار اور انسانی حقوق کے نگران تھے، انہوں نے قرشی، غیر قرشی، عربی، عجمی، آزاد، غلام سب کے حقوق یکساں قرار دیئے اور قبائلی بلندی و خاندانی پستی کے اعتبار سے انسانی برادری میں افتراق و امتیاز گوارا نہیں کیا۔

معاشی نظام

اسلام کا نظریہ معیشت فطرت سے ہم آہنگ اور تمام معاشی مشکلات کا واحد حل ہے اور یہ سرمایہ داری اور اشترا کی نظریات سے بالکل مختلف ہے، یہ نظام نہ تو تجربوں کا مرہونِ منت ہے اور نہ ہی اقتصادی ماہرین کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے، بلکہ رب العالمین کا تجویز کردہ اور سرورِ کائنات رسولِ اعظم حضرت محمد مصطفی ﷺ کا پیش کردہ ہے، اس نظام کی اساس شخصی یا گروہی مفادات کے بجائے عمومی مفاد پر ہے، کیونکہ اللہ کسی خاص فرد یا کسی خاص گروپ کا رب نہیں بلکہ ''ھُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّکُم'' وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، اس کی ربوبیت کا سایہ سب پر یکساں ہے، اس لیے اس کے قائم کردہ نظام میں اجتماعی مفاد ہی ملحوظ ہوگا اور شخصی یا گروہی مفاد کا شائبہ تک نہیں ہوسکتا۔ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے انہی اصولوں پر معیشت کا نظام قائم کیا، جو اسلام کے نظریاتی تقاضوں کے عین مطابق تھا، اگر چہ وہ دور اسلامی نظام معیشت کے نفاذ کے لیے سازگار نہیں تھا، کیونکہ سابقہ ملکی فتوحات اور خزانہ عامرہ کے عطیات کی بدولت مسلمانوں میں سرمایہ داری کا رجحان پیدا ہو چکا تھا اور سرمایہ داروں کا ایک طبقہ بھی موجود تھا جو اسلام کی سادگی اور سادہ معاشرت کو خیر باد کہہ کر محلاتی زندگی کا خوگر ہو چکا تھا اور انسان جس زندگی کا خوگر ہو جاتا ہے اس میں تبدیلی آسانی سے گوارا نہیں کرتا، مگر حضرت علیؑ نے اس طبقہ کو خاطر میں لائے بغیر معاشی انقلاب پیدا کرنے اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی بساط لپیٹ دینے کا تہیہ کر لیا، تا کہ معاشرے کو ان تمام خرابیوں سے پاک صاف کر دیں جو سرمایہ داری کی بدولت گھر گھر پہنچ چکی تھیں۔ چنانچہ زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی سابقہ حکومت کی عطا کردہ جاگیروں کو واپس لانے کا حکم دیا اور فرمایا: '' خدا کی قسم! ایسا مال بھی کہیں نظر آتا جو

عورتوں کے مہر اور کنیزوں کی خریداری پر خرچ کیا جا چکا ہوتا تو اسے بھی واپس پلٹا لیتا‘‘
چنانچہ حکومت کے دولت خانے سے تلواریں، زرہیں اور صدقہ کے اونٹ لے لیے اور
اعلان عام کیا کہ جس کسی کے پاس حکومت کا دیا ہوا مال ہو وہ بیت المال میں جمع
کرادے، شرح بن ابی الحدید جلد۲ ص۱۷۲ میں ہے کہ اس اعلان سے سابقہ حکومت
کے مراعات یافتہ لوگوں اور سرمایہ داروں میں کھلبلی مچ گئی اور ولید بن عقبہ نے حضرت
کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: ہم آپ کی بیعت کیے لیتے ہیں بشرطیکہ وہ مال جو
خلافت کی داد و دہش کے نتیجے میں ہمیں ملا ہے وہ ہم سے نہ چھینا جائے، تو حضرت نے
فرمایا:

’’میں اس مال کو چھوڑ دوں جو تم لوگوں نے ہتھیا لیا ہے تو یہ
میرے بس کی بات نہیں ہے کہ میں اللہ کے حق سے دستبردار ہو
جاؤں جو تمہارے اور تمہارے دوسروں کے ذمہ ہے‘‘

بیت المال کی تقسیم

حضرت رسول اکرم ﷺ زکوٰۃ وصدقات اور مال غنیمت کو جمع رکھنے کے
بجائے مال غنیمت کو مجاہدین میں اور دوسرے اموال جس شہر اور علاقے میں موصول
ہوتے وہیں کے مسلمانوں کے درمیان فوراً تقسیم کر دیتے، اس لیے نہ بیت المال
تشکیل دیا گیا نہ اس کی ضرورت محسوس کی گئی، حضور اکرم ﷺ کے بعد فتوحات کے
نتیجہ میں روم و ایران کے خزانے مدینہ میں سمٹ آئے تو بیت المال کی بنیاد رکھی گئی اور
اس کے نظم و انصرام کے لیے محکمہ مالیات قائم کیا گیا، اس محکمے کی زیر نگرانی سرمایہ
سمیٹ کر رکھا جاتا جس سے رفاہی امور انجام دیئے جاتے اور سالانہ وظائف کی تقسیم
ہوتی، حضور رسالت مآب کے دور میں تقسیم کی بنیاد عدل و مساوات پر تھی اور سب سے

یکساں برتاؤ ہوتا تھا، مگر آپ کے بعد برابری کی تقسیم کی پابندی ختم کر دی گئی، چنانچہ
دوسری خلافت کے دور میں بیت المال میں سے کسی کو کم کسی کو زیادہ وظیفہ ملتا تھا،
ازواج پیغمبرؐ کو دوسری خواتین پر ترجیح دی جاتی تھی اور ایک خاص بیوی کو دوسری
ازواج سے دو ہزار زائد وظیفہ ملتا تھا، بدریین کے وظائف ان لوگوں سے زیادہ تھے جو
بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے اور مہاجرین کو انصار پر فوقیت حاصل تھی، بعد کے دور
میں یہ پابندی بھی ختم کر دی گئی، کتاب وسنت اور سیرت شیخین پر عمل کرنے کی پابندی
کا عہد کرنے کے باوجود نہ تقسیم کی برابری ضروری سمجھی گئی اور نہ تقسیم بالمدارج بلکہ
مسلمانوں کا سرمایہ عزیزوں دوستوں، ہواخواہوں کے ایک خاص گروہ کی تن پروری
کے لیے مخصوص کر دیا اور جسے چاہا جس قدر چاہا بطور عطیہ بخش دیا۔

ایمان مجسم، امام معظم، امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے جب بیت
المال کا نظم و نسق سنبھالا تو عمل پیغمبرؐ کے مطابق جو مال جس شہر میں جمع ہوتا اُسی شہر میں
تقسیم فرما دیتے، اگر وہاں سے بچ کر آتا تو بیت المال میں سمیٹ کر رکھنے کے بجائے
ہر جمعہ کو مستحقین میں تقسیم کر کے بیت المال خالی کر دیتے۔ جب بیت المال خالی
ہو جاتا تو اپنے ہاتھ سے اس میں جھاڑو دیتے۔ دو رکعت نماز پڑھتے اور فرماتے ’’خدا کا
شکر ہے کہ میں جس طرح خالی ہاتھ اندر آیا اُسی طرح خالی ہاتھ باہر جا رہا ہوں‘‘ علامہ
ابن عبدالبر اپنی کتاب الاستیعاب جلد۲ ص۵۰ میں تحریر کرتے ہیں:

’’وَ كَانَ لَا يَدَعُ فِي بَيْتِ الْمَالِ مَا لَا يَبِيتُ فِيهِ حَتّٰى
يُقَسِّمُهُ اِلَّا اَن يَّغْلِبَهُ شُغْلٌ فَيُصْبِحُ اِلَيْهِ‘‘

حضرت نے یہ نوبت نہیں آنے دی کہ رات گزاریں اور مال
بیت المال میں پڑا رہے، بلکہ رات سے پہلے اسے تقسیم کر دیا
کرتے تھے، البتہ اگر کوئی مانع ہوتا تو صبح ہونے دیتے۔

سابقہ حکومتوں میں بیت المال کی غیر مساویانہ تقسیم نے معاشی نظام کو غیر متوازن بنا دیا تھا، حضرت نے اس میں تبدیلی ضروری سمجھی اور غیر مساویانہ تقسیم کے بجائے اسلامی مساوات کے نظریئے کو پھر سے زندہ کیا اور چھوٹے بڑے کا امتیاز ختم کر کے سب کا حصہ یکساں قرار دیا، اگرچہ یہ طرزِ عمل امتیاز پسند ذہنیتوں پر شاق گزرا اور سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت بھی ہوئی مگر آپ کسی کو خاطر میں نہ لاتے اور اپنے اصول سے جو عین اسلامی اصول تھا ہٹنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی رافع بیان کرتے ہیں کہ جب طلحہ و زبیر نے یہ دیکھا کہ تقسیم مال میں ان کا امتیاز خطرے میں ہے تو وہ حضرت کے پاس آئے اور کہا: یا امیرالمومنینؑ! خلافت ثانیہ کے دور میں ہمیں اتنا اور اتنا دیا جاتا تھا، آپ بھی اس کا لحاظ رکھیں، آپ نے فرمایا: یہ چھوڑو کہ فلاں تمہیں کتنا دیا کرتے تھے کتنا نہیں، یہ بتاؤ کہ حضرت رسول اللہ (ص) تمہیں کتنا دیا کرتے تھے؟ یہ سن کر وہ دونوں چپ ہوگئے حضرت نے انہیں خاموش دیکھا تو فرمایا کیا حضرت رسول اللہ (ص) برابری کے اصول پر کاربند نہ تھے؟ کہا: ہاں! وہ سب میں برابر، ابرابر تقسیم کیا کرتے تھے، امامؑ نے فرمایا: ''سنت رسولؐ زیادہ قابلِ عمل ہے یا کسی اور کی سنت؟'' کہا: قابلِ عمل تو سنت رسول ہے، مگر ہمیں اسلام میں سبقت کا شرف حاصل ہے، ہم نے اسلامی غزوات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور ہمیں رسولؐ اللہ سے قرابت بھی ہے۔ فرمایا: اسلام میں تمہیں سبقت حاصل ہے یا مجھے؟ کہا: آپ کو! تو فرمایا: تم نے جہاد میں زیادہ حصہ لیا ہے یا میں نے؟ کہا: آپؑ نے! فرمایا: تمہیں رسولؐ سے زیادہ قرابت حاصل ہے یا مجھے؟ کہا: آپؑ کو! پھر حضرت نے نزدیک کھڑے ایک مزدور کی طرف اشارہ کیا اور کہا: اس مال میں میرا اور اس مزدور کا برابر حصہ ہے، جب میں اپنے لیے امتیاز گوارا نہیں کرتا تو تمہارے لیے کیونکر گوارا کیا جا سکتا ہے!

حضرت امیرؑ بیت المال میں اعلیٰ، ادنیٰ، قرشی، غیر قرشی، آزاد اور غلام سب کا حق مساوی سمجھتے تھے اور رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کی بنا پر امتیاز کو گوارا نہ کرتے تھے اور اعلان کر دیا تھا کہ میں سب امتیازات ختم کر دوں گا، آپ کے بھائی عقیل نے یہ علان سنا تو حضرتؑ سے کہا: ''آپ مجھے اور مدینہ کے ایک حبشی کو ایک سطح پر رکھیں گے؟'' تو آپؑ نے فرمایا:

''اِجلِس رَحِمَکَ اللّٰہُ وَ مَا فَضُلُکَ عَلَیہِ اِلَّا بِسَابِقَۃٍ اَوْ تَقْوٰی''

بیٹھ جاؤ، خدا تم پر رحم کرے اگر تم کو اس پر فضیلت ہو سکتی ہے تو تقویٰ اور سبقت اسلام کی وجہ سے۔

ایک مرتبہ آپ کی ہمشیرہ ''ام ہانی'' بنت ابی طالبؑ آپؑ کے ہاں آئیں آپ نے انہیں بیت المال سے بیس درہم دیئے، انہوں نے واپس پلٹ کر اپنی ایک عجمیہ کنیز سے دریافت کیا کہ امیرالمومنینؑ نے تمہیں کیا دیا ہے؟ اس نے کہا: بیس درہم! یہ سن کر ام ہانی، آپ کے پاس آئیں اور کہا: آپ نے جو کنیز کو دیا ہے وہ مجھے دیا ہے! حالانکہ میرا حق فائق ہے، حضرتؑ نے فرمایا: ''خدا کی قسم! اس مال میں بنی اسماعیلؑ کو بنی اسحاقؑ پر فوقیت حاصل نہیں ہے!''

اسی طرح کے ہزاروں ایسے واقعات ہیں جن پر نظر کرنے سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضرت نے تقسیم اموال میں وہی طرز عمل اختیار کیا جو پیغمبر اکرمؐ کا طرزِ عمل تھا، نہ بیت المال میں مال جمع کر کے رکھا، نہ تقسیم میں رنگ اور نسل کا امتیاز کیا، بلکہ عدل و مساوات کے جو پیمانے وضع کیے اور حق و انصاف کے جو معیاری نمونے پیش کیے دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، کیا اس کی مثال کہیں نظر آتی ہے کہ حقیقی بھائی اپنے بچوں کی پرورش کے لیے بیت المال سے چند سیر جو کا مطالبہ

کرے، بہن اپنے وظیفہ میں چند درہموں کا اضافہ چاہے، ابن عم اور داماد روزمرہ کی ضروریات کے سلسلے میں مدد چاہے، بیٹی گھی اور شہد کا ایک پیالہ لے لے یا ایک ہار عاریۃً منگوا لے اور بیٹا ایک معمولی ٹوپی کی خواہش کرے، مگر اصول پرستی وحق پسندی کے مقابلے میں محبت وقرابت کے تقاضوں کو نظرانداز کردیا جائے اور بیت المال سے عزیزوں کے ساتھ اتنی سی بھی مراعات کو گوارا نہ کی جائے، حالانکہ حق ولایت سے قطع نظر خود حضرت مسلمانوں سے یہ اجازت لے کر یہ چند چیزیں اپنے عزیزوں کو دے سکتے تھے، مگر آپ کی خودداری یہ گوارا نہیں کرتی کہ مسلمانوں پر یہ ادنیٰ سا بوجھ بھی ڈالیں یا ان کے زیر بار احسان ہوں، جبکہ حضرت اپنے ذاتی مصارف کے لیے غلہ تک مدینہ سے منگاتے تھے اور اپنے حق کے باوجود بیت المال پر اپنا بوجھ ڈالنا پسند نہ کرتے تھے۔

ہارون بن عنترہ کہتے ہیں کہ میں نے خورنق میں حضرتؑ کو ایک پرانا کمبل اوڑھے دیکھا جو سردی سے بچاؤ کے لیے ناکافی تھا، میں نے عرض کیا: یا علیؑ! اس بیت المال میں آپؑ کا حصہ بھی تو ہے، اس میں سے کوئی نیا کمبل لے لیجیے، فرمایا! خدا کی قسم! میں نے تمہارے مال میں سے کوئی چیز لینا گوارا نہیں کی اور یہ چادر جو اوڑھے ہوئے ہوں مدینہ سے لے کر آیا ہوں۔

ایمان مجسم اور عدالت

ترجمہ سید ہادی خسروشاہی جلد ا ص ۶۲، ۶۳ میں ہے کہ: حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کائنات میں علی بن ابی طالب علیہ السلام ہی حق طلب افراد کے پیشوا اور عدالت خواہ لوگوں کے سربراہ اور عدل وانصاف کے اجراء کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں، اسی لئے آپ کو ''شہید عدالت'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے چنانچہ

مسیحی دانشور اور ادیب ''جارج جرداق'' نے اپنی کتاب ''اَلْاِمَامُ عَلِیٌّ صَوْتُ الْعَدَالَۃِ الْاِنْسَانِیَّۃِ'' میں لکھا ہے کہ ''قُتِلَ عَلِیٌّ فِیْ مِحْرَابِ عِبَادَتِہٖ لِشِدَّۃِ عَدْلِہٖ'' مولا علی علیہ السلام کو محراب عبادت میں اس لئے شہید کیا گیا کہ آپ عدالت کے معاملے میں بڑے سخت تھے۔

حضرت علی علیہ السلام کا حکومت کرنے کا اصل مقصد اور ہدف ہی یہی تھا کہ لوگوں کے درمیان حق وعدالت کے ساتھ کام لیا جائے۔ چنانچہ (نہج البلاغہ خطبہ ۳۳ میں ہے) حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں مقام ''ذی قار'' میں مولا علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ اپنے جوتے کو خود ٹانکے لگا رہے ہیں، مجھے دیکھتے ہی بول اٹھے، ''تمہارے نزدیک اس جوتے کی کیا قیمت ہوگی؟'' تو میں نے عرض کیا: ''اس کی کیا قیمت ہوگی، یہ تو پھینک دینے کے قابل ہے'' یہ سن کر فرمایا: ''وَاللّٰہِ لَھِیَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اِمْرَتِکُمْ'' خدا کی قسم میرے نزدیک یہ جوتا تمہاری حکومت سے زیادہ محبوب ہے۔ ''اِلَّا اَنْ اُقِیْمَ حَقًّا اَوْ اَدْفَعَ بَاطِلًا'' میں نے حکومت تو صرف اس لئے لی ہے تاکہ اس کے ذریعہ حق کو قائم کرسکوں اور باطل کو دور پھینک دوں۔

اسی مقام پر آپ ہی ارشاد فرماتے ہیں:

''اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ تَعْلَمُ اَنَّہٗ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْ کَانَ مِنَّا مُنَافَسَۃً فِیْ سُلْطَانٍ وَّلَا الْتِمَاسَ شَیْءٍ مِنْ فُضُوْلِ الْحُطَامِ وَلٰکِنْ لِنَرُدَّ الْمَعَالِمَ مِنْ دِیْنِکَ وَنُظْھِرَ الْاِصْلَاحَ فِیْ بِلَادِکَ، فَیَاْمَنَ الْمَظْلُوْمُوْنَ مِنْ عِبَادِکَ وَتُقَامُ الْمُعَطَّلَۃُ مِنْ حُدُوْدِکَ'' پروردگارا! تو بہتر جانتا ہے جو کچھ ہم انجام دے چکے ہیں، ہمارا اقدام اس لئے نہیں تھا کہ ہم ملک

اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لیں اور نہ ہی اس لئے
تھا کہ دنیا کے پست مال ومتاع سے کچھ اکٹھا کرلیں بلکہ یہ سب
کچھ اس لئے تھا تاکہ تیرے دین کی ختم ہوجانے والی
نشانیوں کو دوبارہ ظاہر کریں، تیرے شہروں میں اصلاح کو آشکار
کریں، تاکہ تیرے مظلوم بندے سکھ کا سانس لے سکیں اور جو
قوانین معطل کئے جا چکے ہیں ان کا دوبارہ اجراہو۔

دیکھا آپ نے کہ امیرالمومنین علیہ السلام بھی حکومت کی تشکیل کا اصل مقصد حق اور عدالت کے قیام میں منحصر سمجھتے ہیں، کیونکہ جب تک قانون عدل قائم نہ ہو مملکت کو چلانا ناممکن ہوتا ہے، اور اسی سے ہی ملک وحکومت قائم رہ سکتے ہیں، اور اسی حقیقت کو معصومین علیہم السلام کے مختلف فرامین کی صورت میں بیان کیا گیا ہے مثلاً (موسوعۃ الامام العلی علیہ السلام، محمدی ری شہری ص ۳۱۵، ۳۲۰) امیرالمومنین علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

الف۔ ''اَلْعَدْلُ نِظَامُ الْاِمْرَۃِ'' عدل ہی سے حکومت منظّم رہتی ہے۔

ب۔ ''اَلْعَدْلُ قِوَامُ الرَّعِیَّۃِ'' عدل ہی لوگوں کو بچائے رکھتی ہے۔

ج۔ ''اَلْعَدْلُ حَیٰوۃٌ'' عدل ہی زندگی ہے۔

د۔ ''اَلْعَدْلُ سَآئِسٌ عَامٌّ'' عدل ہی ایک عمومی قانون ہے۔

ھ۔ ''اَلْعَدْلُ یَضَعُ الْاُمُوْرَمَوَاضَعَھَا'' عدل ہی ہر چیز کو اس کی اپنی جگہ پر برقرار رکھتی ہے۔

و۔ ''مَاحَصَّنَ بِمِثْلِ الْعَدْلِ'' جتنا عدل حکومت کو مستحکم رکھتی ہے اتنا کوئی اور چیز نہیں۔

ز۔ ''اِعْدَلْ تَدُمْ لَکَ الْقُدْرَۃُ'' عدل کیا کرو کہ اس سے تمہارا اقتدار باقی

رہے گا۔

ج۔ ''فِیْ الْعَدْلِ اَلْاِقْتِدَآءُ بِسُنَّۃِ اللّٰہِ وَثَبَاتُ الدُّوَلِ'' عدل ہی سے ایک تو سنت الٰہی کی اقتدا ہوتی ہے اور دوسرے حکومت اور اقتدار ثابت و پائیدار ہوتے ہیں۔

ط۔ ''بِالسِّیْرَۃِ الْعَادِلَۃِ یُقْھَرُالْمُنَاوِی'' عادلانہ سیرت سے دشمن مغلوب ہوتا ہے۔

ی۔ ''مَنْ عَمِلَ بِالْعَدْلِ حَصَّنَ اللّٰہُ مُلْکَہٗ ،اِعْدَلْ تَمْلَکُ اِعْدَلْ تَحْکُمْ ،لَنْ تُحْصَنَ الدُّوَلُ بِمِثْلِ اسْتِعْمَالِ الْعَدْلِ فِیْھَا،دَولَۃُ الْعَادِلِ مِنَ الْوَاجِبَاتِ ،ثِبَاتُ الْمُلکِ فِی الْعَدلِ ،اَلطَّاعَۃُ جُنَّۃُ الرَّعِیَّۃِ وَالْعَدْلُ جُنَّۃُ الدُّوَلِ ،ثِبَاتُ الدَّوَلِ بِاِقَامَۃِ سُنَنِ الْعَدْلِ، مَنْ عَدَلَ فِی سُلْطَانِہٖ اسْتَغْنیٰ عَنْ اَعْوَانِہٖ،اَلْعَدْلُ قِوَامُ الْبَرِیَّۃِ حُسْنُ الْعَدْلِ نِظَامُ الْبَرِیَّۃِ،اَلْعَدْلُ اَقْویٰ اَسَاسٍ ،اَلْعَدْلُ اَفْضَلُ الْسِّیَاسَتَیْنِ، کَفیٰ بِالْعَدْلِ سَآئِساً .مِلاکُ السِّیَاسَۃِ الْعَدْلُ، خَیرُالسِّیَاسَاتِ الْعَدْلُ،لَارِیَاسَۃَ کَالْعَدْلِ فِی السِّیَاسَۃِ ،جَمَالُ السِّیَاسَۃِ الْعَدْلُ فِی الْاِمْرَۃِ وَالْعَفُوْمَعَ الْقُدْرَۃِ،اَلرَّعِیَّۃُ لا یُصْلِحُھَا اِلَّا الْعَدْلُ،اِعْدِلْ اَلْعَدْلُ کَھُفُکَ وَالْعَدْلُ سَیْفُکَ تَنْجُ مِن کُلِّ سُوٓءٍ وَّتَظْفَرُ عَلیٰ کُلِّ عَدُوٍّ،قُلُوبُ الرَّعِیَّۃِ خَزَآئِنُ رَاعِیھَا،فَمَااَوْدَعَھَامِنْ عَدْلٍ وَّجَورٍ وَجَدَہٗ،مَاعُمِّرَتِ الْبُلْدَانُ بِمِثْلِ الْعَدْلِ.عَدلُ السُّلطَانِ خَیْرٌمِّن خَصَبِ الزَّمَانِ.بِالْعَدْلِ تَتَضَاعَفُ الْبَرَکَاتُ.مَن عَدَلَ تَمَکَّن،مَن عَدَلَ فِی الْبِلادِ نَشَرَاللّٰہُ عَلَیْہِ الرَّحْمَۃَ،مَن عَمَلَ بِالْعَدْلِ مَن دُونَہٗ رُزِقَ الْعَدْلَ مِمَّنْ فَوْقَہٗ،شَیْئَانِ لَایُوْزَنُ ثَوَابُھُمَا،اَلْعَفُوُوَالْعَدْلُ ،لَیْسَ ثَوَابٌ مِّن عِنْدِاللّٰہِ سُبْحَانَہ اَعْظَمُ مِنْ ثَوَابِ سُلْطَانِ الْعَادِلِ''

جوعدل کی راہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی حکومت کو محفوظ بنا دے گا، عدل کرو کہ اس سے حکومت کرو گے، عدل کرو کہ اس سے حکمرانی کرو گے، حکومتیں جتنا عدل کے ذریعے محفوظ رکھی جاسکتی ہیں اتنا کسی اور چیز کے ذریعہ نہیں، عادل کی حکومت کا ہونا واجبات میں شامل ہے، مملکت کی پائیداری عدل میں ہے، فرمانبرداری رعیت کی اور عدل حکومتوں کی ڈھال ہے، حکومتوں کی پائیداری قوانین عدل کے اجراء سے ہے۔ جو اپنے اقتدار کی حالت میں عدل سے کام لیتا ہے وہ دوسرے مددگاروں سے بے نیاز ہو جاتا ہے، عدل رعیت اور عوام کو راہ راست پر رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اچھے انداز میں عدل عوام الناس کو منظّم رکھتا ہے، عدل قوی ترین بنیاد ہے، عدل دو سیاستوں میں سے افضل سیاست ہے، قیادت کے لئے عدل ہی کافی ہے، تمام سیاست کا معیار عدل ہے، بہترین سیاست عدل ہے، سیاست میں عدالت سے کام لینے جیسی کوئی ریاست نہیں، سیاست کا حسن اس بات میں ہے کہ حکومت کرنے میں عدل وانصاف سے کام لیا جائے اور اقتدار کے ہوتے ہوئے معاف کر دیا جائے۔ رعیت کو عدل ہی سیدھا رکھ سکتی ہے۔ دین کو اپنی پناہ گاہ اور عدل کو اپنی تلوار بناؤ کہ اس طرح سے ہر مشکل وقت میں کامیاب ہوتے رہو گے، اور ہر دشمن پر کامیابی حاصل کرتے رہو گے۔ رعیت کے دل اپنے حکمرانوں کے خزانے ہوتے ہیں لہٰذا حکمران عدل یا ظلم کی جو امانت ان کے سپرد کریں گے وہی ان سے حاصل کریں گے۔ جتنا عدل کے ذریعے برکتیں بڑھتی رہتی ہیں اتنا کسی اور چیز سے نہیں جو عدل وانصاف سے کام لیتا ہے اس کی حکومت مستحکم ہوتی ہے۔ جو شہروں اور ملکوں میں عدل کا نفاذ کرتا ہے اللہ اس پر اپنی رحمت عام کر دیتا ہے۔ جو اپنے زیردستوں سے عدل کرتا ہے اسے اپنے سے زبردستوں سے عدل ملتا ہے۔ دو چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے ثواب کو ترازو میں نہیں تولا جاسکتا، ایک درگزر اور دوسرے عدل، عادل سلطان کو اللہ تعالیٰ جتنا ثواب

عطا کرتا ہے اتنا عظیم ثواب کسی اور کو عطا نہیں کرتا۔

اوراب عدل کے چند نمونے

۱۔ مناقب آل ابی طالبؑ ج ۲ ص ۱۰۸، تہذیب الاحکام ج ۱۰ ص ۱۵۱ میں ہے:

علی بن رافع کہتے ہیں کہ میں حضرت علی علیہ السلام کے دور خلافت میں بیت المال کا خزانچی اور منشی تھا، ایک دن امام علی علیہ السلام کی ایک دختر نے کسی کو میری طرف بھیجا کہ بیت المال میں موجود ایک گلوبند انہیں عاریۃً دے دوں کہ وہ عید قربان میں اسے پہن کر واپس کر دیں گی۔ میں نے وہ گلوبند ضمانت لے کر عاریۃً دے دیا، جب امیرالمومنین علیہ السلام کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے بلایا اور غصے میں فرمایا: ''آیا تم مسلمانوں کے ساتھ خیانت کر رہے ہو؟ خبردار کہیں دوبارہ ایسا کام کرو، ورنہ سخت سزا پاؤ گے۔ خدا کی قسم! اگر میری بیٹی نے گلوبند کو امانت کے طور پر اور ضمانت کی شرط کے ساتھ حاصل نہ کیا ہوتا میں اسے بھی سزا دیتا، اور وہ سزا پانے والی پہلی ہاشمی خاتون ہوتی''

جب یہ بات آپ کی بیٹی کو معلوم ہوئی تو اپنے بابا کی خدمت میں عرض گزار ہوئیں، ''بابا! میں آپ کی بیٹی اور آپ کے جگر کا ٹکڑا ہوں، مجھ سے بڑھ کر اور کون اس ہار سے استفادہ کا مستحق ہو سکتا ہے؟'' امام نے فرمایا: ''علی بن ابی طالب کی بیٹی! تمہیں نفسانی خواہشات راہ حق سے نہ ہٹا دیں، آیا اس عید پر مہاجروں کی تمام عورتیں اس طرح کی زینت سے آراستہ ہو رہی ہیں؟''

۲۔ (**النظام السیاسی فی الاسلام** میں باقر شریف قرشی ص ۲۱۰ میں اور صوت العدالۃ الانسانیہ میں جارج جرداق مسیحی لکھتے ہیں کہ:) ایک مرتبہ ایک یہودی نے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا اور خلیفہ ثانی نے آپ

کو جواب دعویٰ کے لئے دعوت دی۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران قاضی نے آپ کو آپ کے نام (علیؑ) کے ساتھ پکارنے کی بجائے کنیت (ابوالحسن) کے ذریعہ مخاطب کیا، یہ کیفیت دیکھ کر آپ کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا، اور سماعت مقدمہ کے بعد قاضی نے علیؑ سے کہا: ''معلوم ہوتا ہے کہ ایک یہودی کے دعویٰ کی وجہ سے آپ کو محکمہ قضا میں حاضر ہونا پڑا جس سے آپ کا رنگ تبدیل ہوا''، تو حضرت نے فرمایا:

''کَلّا اِنَّمَا سَائَنِیْ اِنَّکَ کَنَّیْتَنِیْ وَلَمْ تُسَاوِ بَیْنِیْ وَبَیْنَ خَصْمِیِ اَلْمُسْلِمُ وَالْیَهُوْدِیُّ اَمَامَ الْحَقَّ سَوَآءٌ''

وجہ وہ نہیں جو تم نے بیان کی ہے، بلکہ میری پریشانی اس وجہ سے تھی کہ تم نے مجھے میری کنیت کے ساتھ پکارا (اور مجھے اس پر ترجیح دی) میرے اور مدعی کے درمیان مساوات کا خیال نہیں رکھا، جبکہ حق و عدالت اور قانون کے سامنے ایک مسلمان اور یہودی برابر ہیں۔

۳۔ (الاوائل جلد۱ ص۱۲۴، العقد الفرید جلد۱ ص۱۰۳، شرح ابن ابی الحدید جلد۱۷ ص۸۷ میں ہے:) حضرت علی علیہ السلام کی عدالت کا ایک عینی نمونہ جو تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ آپ کی حکومت کے عرصہ میں ظاہر ہوا وہ یہ کہ (بیت القصص) کی بنیاد رکھی گئی جسے آجکل کی تعبیر کے مطابق ''شکایت بکس'' (Complain Box) کہا جاتا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کی مشکلات کا پتا چلایا جائے اور شکایات کو دور کیا جائے، معاشرہ میں بدنظمی، بے اعتدالی اور ظلم و ستم سے آگاہی حاصل کر کے اس کا مداوا کیا جائے اور ظلم و جور کی بجائے عدل و انصاف کو قائم کیا جائے۔ تا کہ اگر کوئی شخص براہ راست اپنی مشکلات کا اظہار نہیں کرنا چاہتا یا نہیں کر

سکتا تو وہ انہیں لکھ کر شکایات بکس میں ڈال دیتا کہ وہ اس طرح سے اپنی مشکلات اور ضروریات حکومت کے ذمہ داران اور کارپردازان تک پہنچا سکے، اور کم سے کم عرصہ میں شکایت کا ازالہ کیا اور ضروریات کو پورا کیا جا سکے، چنانچہ ضرورت مند افراد کسی قسم کی شرمندگی محسوس کئے بغیر اپنی ضروریات کو لکھ کر ''بیت القصص'' میں ڈال دیا کرتے تھے اور ان کی ضروریات کو پورا کیا جاتا تھا۔

۴۔ (طبقات کبریٰ جلد۳ ص۳۵۵، ۳۵۶، تاریخ طبری جلد۴ ص۲۳۹، تاریخ کامل جلد۳ ص۷۵، ۷۶ میں ہے) جب حضرت عمر، ''ابولُوءلُوء'' کے ہاتھوں راہی ملک بقا ہوئے تو ان کے فرزند ''عبیداللہ'' نے اپنے والد کے خون کا بدلہ لینے کے لئے تلوار اٹھالی اور بہت سے حرام کاموں کا ارتکاب کر ڈالا تو ایک ایرانی مسلمان ''ہرمزان'' کو بھی قتل کر دیا، پھر ''ابولُوءلُوء'' کی کمسن بچی کا کام بھی تمام کر دیا اس کے بعد ''جعفہ'' نصرانی کو موت کے گھاٹ اتار دیا، جو سعد بن ابی وقاص کی دعوت پر مدینے آیا ہوا تھا، اور انہی کی پناہ میں تھا، یہ صورتحال دیکھ کر لوگ عبیداللہ پر ٹوٹ پڑے اور تلوار کو اس کے ہاتھوں سے لے لیا، جبکہ سعد بن ابی وقاص نے اسے اپنے گھر میں بند کر دیا تا کہ جب کوئی خلیفہ متعین ہو جائے گا تو وہی اس کا فیصلہ کرے گا، ادھر عبیداللہ مارے غصے کے پاگل ہوا جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ: ''خدا کی قسم! میں تو بڑے بڑے مہاجرین و انصار کو تہ تیغ کر دوں گا جو میرے والد کے خون بہانے میں شریک رہے ہیں''

کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کے والد کے قتل کی سازش میں بہت سے مہاجرین و انصار کا ہاتھ ہے۔ جب حضرت عثمان خلیفہ بنے اور فیصلہ کرنا چاہا تو اس موقعہ پر عمرو بن عاص نے ''اجتہاد'' سے خوب کام لیا اور کہنے لگا ''یہ واقعہ اس وقت رونما ہوا کہ ابھی آپ نے زمام امور نہیں سنبھالی تھی، جس سے آپ کو اس قسم کے فیصلے کرنے کا حق

ہوتا، چونکہ اس دوران میں مسلمانوں کا کوئی خلیفہ نہیں تھا لہٰذا مقتول کا خون ضائع ہوگیا‘‘

حضرت عثمان نے فرمایا: ’’اس وقت مسلمانوں کا زمام دار میں ہی ہوں اور چونکہ ہرمزان کا کوئی وارث اور خون خواہ اور کوئی نہیں لہٰذا میں ہی اس کا وارث اور خون خواہ ہوں، اسی لئے ’’عبیداللہ‘‘ کے ذمہ لازم ہونے والا خون مَیں معاف کرتا ہوں، اور اس کی دیت کو اپنی جیب سے ادا کروں گا‘‘

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ’’اس نے حرمت الٰہی کی دھجیاں بکھیر دی ہیں اس لئے آپ اس سے درگزر نہیں کرسکتے لہٰذا اسے قتل ہی کیا جائے گا‘‘ مگر انہوں نے عبیداللہ کو آزاد کردیا۔

حضرت علی علیہ السلام نے عبیداللہ کو فرمایا: ’’اے فاسق! اگر کسی دن مجھے تجھ پر قابو پانے کا موقعہ ملا تو جو خون تو نے ناحق بہایا ہے اس کے بدلے میں تمہیں ضرور قتل کروں گا‘‘ چنانچہ حضرت عثمان کے قتل ہوجانے کے بعد جب لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کی تو آپؑ نے عبیداللہ پر حد جاری کرنے کا فیصلہ کیا تو وہ جان کے خوف سے شام کی طرف بھاگ گیا۔ اور امیر شام سے جاملا، اور جنگ صفین میں اس کے ساتھ شامل ہوکر حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ لڑنے کے لئے آگیا اور مولا علی علیہ السلام کے سپاہیوں کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچا۔

۵۔ (کافی جلد ۷ ص ۲۱۶ وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۴۷۴، ۴۷۵) منقول ہے کہ ’’نجاشی‘‘ جو ایک عظیم معاشرتی حیثیت کا مالک اور حضرت امیر علیہ السلام کے شعراء میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ ماہ رمضان میں شراب پی لی، معاملہ امام عالیمقامؑ تک جا پہنچا تو آنجناب نے بغیر کسی رو رعایت کے اس کو سزا دی بلکہ کچھ اضافی تازیانے لگائے، جب اس بارے آپ پر اعتراض کیا گیا کہ یہ اضافی تازیانے

کیسے؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: ’’چونکہ اس نے ماہ رمضان المبارک میں خدا کی نافرمانی کی جرأت کی اور اس مہینے کی ہتک حرمت کی یہ اضافہ اسی کے لئے ہے‘‘

(بحار الانوار جلد ۴۱ ص ۹، ۱۰ میں ہے) حق وعدالت کے اجراء کے سلسلے میں اپنوں اور بیگانوں، دوستوں اور دشمنوں کے درمیان فرق کئے بغیر آپ کا یہ طریقہ کار بہت سے لوگوں کو گراں گزرا۔ اور وہ آپ پر بڑے برہم ہوئے، چنانچہ اہل یمن کے بعض قبائل میں سے کچھ لوگ جو آپ کے ساتھ تھے وہ بھی ناراض ہوگئے۔ ان میں سے ایک شخص ’’طارق بن عبداللہ‘‘ جو نجاشی کا خاص الخاص دوست تھا حضرت امیر کے پاس آکر معترضانہ لہجے میں کہنے لگا: ’’یا امیر المومنینؑ! ہم نے آج تک یہ کبھی نہیں دیکھا کہ سرکش اور فرمانبردار اور اہل تفرقہ اور اہل جماعت، عادل اور سرچشمہ فضیلت لوگ حکمرانوں سے ایک جیسی سزا پائیں‘‘ لیکن ہم نے یہ سلوک اپنے بھائی حارث کے ساتھ آپ کی طرف سے دیکھا ہے۔ آپ نے ہمارے سینے غیظ وغضب سے بھر دئے ہیں اور ہمارے اجتماعی امور کو بکھیر کر رکھ دیا ہے، اور ہمیں ایسے راستے کی طرف دھکیل دیا ہے جس کی انتہا جہنم ہے،،

یہ سن کر امام علیہ السلام نے فرمایا: ’’وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ‘‘ (بقرہ/۴۵) ’’يَا اَخَا بَنِیْ نَهْدٍ وَّهَلْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِنْتَهَكَ حُرْمَةً مِنْ حُرَمِ اللّٰهِ فَاَقَمْنَا عَلَيْهِ حَدًّا كَانَ كَفَّارَتَهُ، اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى‘‘ (مائدہ/۸) یعنی یقیناً یہ چیز بڑی گراں ہے، سوائے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے۔ اے نہد کی قوم کے بھائی! آیا ایسا نہیں ہے کہ وہ ایک مسلمان ہے جس نے خدا کی حرمت کی پرواہ نہیں کی، بلکہ اس نے ہتک حرمت کی ہے اور ہم نے بھی اس پر حد کو جاری کیا ہے جو کہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ’’کسی

قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل وانصاف کا دامن ہی ہاتھ سے چھوڑ دو۔عدالت برتو کہ یہی چیز تقویٰ سے زیادہ نزدیک ہے''

۶۔(کافی جلد۷ص۴۱۳،الفقیہ جلد۳ص۱۴میں ہے)حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضرت علی علیہ السلام کے گھر چند دنوں تک مہمان رہا۔پھراس کے بعداس نے آپ کی عدالت میں کسی کے خلاف مقدمہ دائر کیا جبکہ انہی ایام میں اس نے ایسا نہیں کیا تھا،حضرت نے اس سے پوچھا''آیا تم بھی اس مقدمہ کے ایک فریق ہو؟''اس نے کہا:''جی ہاں!''فرمایا:''اب تم یہاں سے چلے جاؤ،چونکہ سرکار رسالتؐ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ مقدمہ کا کوئی بھی فریق حاکم کا مہمان ہو مگر یہ کہ دوسرا فریق بھی اس کے ہمراہ مہمان ہو''

۷۔(نہج البلاغہ،محمد عبدہ جلد۳ص۶۷ میں ہے)حضرت علی علیہ السلام اپنے نمائندوں،کارندوں اوراہل کاروں کے کاموں کی خوب نگرانی کیا کرتے تھے اور ان پر ظاہری اور پوشیدہ افراد کو مقرر فرمایا کرتے تھے تا کہ وہ ان کے کاموں کی نگرانی کریں۔اوراس کے ساتھ ہی خود عوام کو مکمل آزادی تھی کہ وہ ان لوگوں کی کمزوریاں امام کی خدمت میں پہنچائیں۔چنانچہ ان شکایات میں سے ایک شکایت،فارس کے نمائندہ کے بارے میں تھی کہ یہ نمائندہ اپنے رشتہ داروں اوردوسرے لوگوں کے درمیان فرق قائم کئے ہوئے ہے اور وہ اپنے رشتہ داروں کو دوسروں سے زیادہ حصہ دیتا ہے۔جب یہ شکایت مظہر عدالت امام عالیمقام تک پہنچی تو آپ نے فوراً اسے لکھا''تمہارے رشتہ داروں اور دوسرے لوگوں کے درمیان میں کسی قسم کا فرق نہیں ہونا چاہئے''

۸۔(نہج البلاغہ خطبہ۲۶میں ہے)جب لوگوں نے امیر المومنینؑ پر اعتراض کیا کہ آپ بیت المال کولوگوں کے درمیان برابر برابر کیوں تقسیم کرتے ہیں؟تو آپ

نے فرمایا:

''اگر یہ میرا ذاتی مال ہوتا پھر بھی میں اسے لوگوں کے درمیان برابر تقسیم کرتا چہ جائیکہ خدا کا مال ہو اوراس کا تعلق تمام لوگوں سے ہو،لہٰذا اس میں تمام لوگ برابر کے شریک ہیں''اصل الفاظ یہ ہیں''لَوْ کَانَ لِیْ لَسَوَّیْتُ بَیْنَهُمْ فَکَیْفَ وَاِنَّمَاالْمَالُ مَالُ اللّٰهِ''

۹۔(بحارالانوارطبع قدیم جلد۸ کے مطابق)مصلحت اندیشوں کا ایک گروہ امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اورعرض کی کہ:''فَضِّلِ الْاَشْرَافَ مِنَ الْعَرَبِ وَالْقُرَیْشَ عَلَی الْمَوَالِیْ وَالْعَجَمِ وَمَنْ نَّخَافُ عَلَیْهِ مِنَ النَّاسِ فِرَارَهٗ اِلٰی مُعَاوِیَهٖ''آپ عربوں اورقریش کے برجستہ لوگوں کوزیادہ حصہ دیا کریں،اس طرح سے آپ انہیں اپنے اطراف میں جمع کئے رکھیں گے،کیونکہ اگر آپ انہیں غلاموں اور غیر عربوں پر ترجیح نہیں دیں گے تو ممکن ہے کہ وہ تخریب کاری پر اتر آئیں یا آپ کو چھوڑ کر مخالفت کی طرف فرار کر جائیں''توامام نے فرمایا:

''آیا میں بیت المال کولوگوں پراس لئے خرچ کروں کہ وہ میرے ہو جائیں؟یاانہیں کسی قسم کا جگاٹیکس دوں؟یقیناً جو شخص پیسوں کی وجہ سے ہمارا ساتھ دیتا ہے اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہمارے مخالف سے ہم سے زیادہ پیسے لیکر ہمارا مخالف نہیں ہوگا؟ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم عدالت اوراسلامی مکتب کی حفاظت کریں،اور لوگوں کو دھونس اور دھاندلی یا طمع اور لالچ کے ذریعہ اپنا بنانے کی کوشش میں نہ لگے رہیں،میں ہرگز کسی کو دوسرے پر ترجیح نہیں دوں گا،جو ہمارے ساتھ رہنا چاہتا ہے بے شک رہے اور جو جانا چاہتا ہے خوشی سے چلا جائے''

۱۰۔(بحارالانوار جلد۴۱ص۱۳۶میں ہے)کچھ عمومی مال کو آپ کی خدمت میں لایا گیا،جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ باہر سے ہمارے لئے کچھ مال آیا ہے تو وہ اس

کے حصول کے لئے بیت المال پر ٹوٹ پڑے، امام علیہ السلام نے کسی بھی قسم کی ناانصافی سے بچنے کے لئے اس کے اطراف رسی کی باڑ کھینچ دی تا کہ لوگ مال سے دور رہیں پھر آپ نے خود اندر داخل ہو کر قبائل کے نمائندوں کے درمیان تمام مال تقسیم کر دیا، اور تقسیم سے اسی روز فارغ ہو گئے، لیکن ایک مرتبہ اچانک آپ کی نگاہ کونے میں پڑی ہوئی یک روٹی پر پڑ گئی۔ تو امامؑ نے حکم دیا کہ اس روٹی کو بھی بیت المال کی مانند سات حصوں میں تقسیم کر کے ہر قبیلہ کو اس کا حصہ دیا جائے۔

۱۱۔ (مجمع البیان جلد۳ ص۶۴ کے مطابق) دو بچوں نے خوشخطی کے مقابلے کے لئے تختیاں لکھیں اور امام حسن علیہ السلام کے پاس فیصلے کے لئے حاضر ہوئے۔

ایسے موقع پر ہر انسان عام طور پر ایک سطحی نگاہ ڈالتا ہے اور معمولی سمجھ کر معاملہ کو نظر انداز کر دیتا ہے،، کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ خط کا معاملہ ہے، دوسری بات یہ کہ فریقین دو چھوٹے بچے ہیں، لیکن فیصلہ بہر حال فیصلہ ہوتا ہے کم ہو یا زیادہ کوئی بچہ ہو یا بڑا۔ اسی لئے حضرت علی علیہ السلام نے امام حسن علیہ السلام کو خبردار کرتے ہوئے فرمایا: ''آج تم جو فیصلہ کرو گے کل بروز قیامت اس کا جواب عدل الٰہی کے دربار میں پیش کرو گے'' اُنْظُرْ کَیْفَ تَحْکُمُ فَاِنَّ هٰذَا حُکْمٌ وَّاللّٰهُ سَآئِلُکَ عَنْهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ '' دیکھو اور اس بات پر خوب غور کرو کہ تم کیا فیصلہ کر رہے ہو کیونکہ خداوند عالم اسی فیصلہ کی قیامت کے دن تم سے جواب طلبی کرے گا۔

۱۲۔ (نہج البلاغہ صبحی صالح ص۳۴۷ میں ہے) حضرت علی علیہ السلام کے بھائی جناب عقیل نے اپنے بھوک سے پریشان حال بچوں کے ہمراہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ''بیت المال سے ملنے والا وظیفہ پورا نہیں ہوتا لہٰذا مہربانی کر کے اس میں اضافہ کر دیجئے!! فطری سی بات ہے کہ ہر انسان اپنے بھوکے بھتیجوں کی یہ حالت دیکھ کر پریشان تو ہو ہی جاتا ہے، جس کی وجہ سے اس کے

دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، مگر امام علیہ السلام نے انہیں دوٹوک الفاظ میں منفی جواب دیدیا، اور اس منفی جواب کو سمجھانے کے لئے گرم لوہا حضرت عقیل کی طرف بڑھایا جس سے ان کی چیخ نکل گئی۔ حضرت نے فرمایا: ''جس طرح تو اس گرم لوہے سے ڈر رہا ہے اسی طرح میں قیامت کے عذاب سے ڈر رہا ہوں''

۱۳۔ (محسن قرائتی اصول عقائد ص۱۱۹ میں لکھتے ہیں) عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ مشہور و معروف اور بڑے لوگ کسی جنس کی خریداری کے لئے یا تو خود بازار جاتے ہیں یا اگر کسی کو بھیجتے ہیں تو وہ مال بیچنے والے سے کہتا ہے کہ میں یہ چیز فلاں بڑے آدمی کے لئے خرید رہا ہوں، تا کہ اس طرح سے وہ ایک تو چیز اچھی دیں گے دوسرے عام لوگوں کی نسبت سستی بھی دیں گے۔

اسی طرح سے ممکن ہے کہ رشوت کا دروازہ کھل جائے یا ناجائز فائدہ اٹھانے والے اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں، جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مسلمانوں کے بازار میں ایک قسم کا امتیاز قائم ہو جائے گا اور ایک گروہ بہترین جنس کو مناسب قیمت کے ساتھ خریدے گا جبکہ دوسرا گروہ اس جنس کو گراں نرخ کے ساتھ خریدے گا، مگر مولائے متقیان علی علیہ السلام کی کوشش ہوتی تھی کہ کس چیز کو بذات خود اور عام طور پر ایسے لوگوں سے خریدتے تھے جو آپ کو نہیں جانتے تھے، اور اگر کسی دوسرے شخص کو بھیجتے تھے تو اس کی کوشش ہوتی تھی مال بیچنے والے کو معلوم نہ ہو کہ سودا کس کے لئے خرید رہا ہے۔

۱۴۔ (حیٰوۃ الامام الحسنؑ میں باقر شریف قرشی جلد۱ ص۳۸۸ میں لکھتے ہیں) ایک مرتبہ حضرت علی علیہ السلام بیت المال کو تقسیم فرما رہے تھے کہ آپ کے کسی ننھے سے بچے نے وہاں سے کوئی چیز اٹھائی اور چل دیا۔

یہ ایک ایسا موقع ہے کہ جہاں پر ممکن ہے کہ ہر باپ چشم پوشی سے کام

لے،مگر امامؑ کی حالت متغیر ہو جاتی ہے اور گھبرا کر اس معصوم بچے کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں اور وہ چیز بچے سے لیکر بیت المال میں لوٹا دیتے ہیں،لوگوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا ''مولا! اس بچے کا بھی تو بیت المال میں حق ہے'' فرمایا ''قطعاً نہیں! اس کے باپ کا بیت المال میں حصہ ہے اور وہ بھی دوسرے عام مسلمانوں کی طرح،جب وہ اپنا حصہ لے جائے گا تو اس سے وہ جتنا چاہے اس بچے کو دیدے گا''

یاد رکھئے کہ حضرت علی علیہ السلام کی اس طرح کی سخت گیری صرف بیت المال کے معاملے میں تھی جو تمام مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے،جبکہ ذاتی مال کی بخشش میں اس قدر دریا دل تھے کہ امیر شام جیسے بخیل اور ازلی دشمن کو بھی کہنا پڑا ''اگر علیؑ کے پاس دو خزانے ہوں ایک بھوسے سے بھرا ہوا اور دوسرا سونے سے،ان کے لئے دونوں کی بخشش ایک جیسی ہے''

۱۵۔(نہج البلاغہ مکتوب ۲۷ کے مطابق) مصر کے گورنر حضرت محمد بن ابی بکر کے نام اپنے ایک مکتوب میں حضرت علی علیہ السلام نے تحریر فرمایا:

''وَ آسِ بَیْنَهُمْ فِی اللَّحْظَةِ وَالنَّظْرَةِ '' اپنے ہر قسم کے سلوک اور نگاہ کرنے میں رعیت کے درمیان برابری سے کام لینا۔

۱۶۔(بحار الانوار جلد ۴۱ ص ۱۰۵ میں ہے) حضرت علی علیہ السلام نے اپنے تمام عاملین (کارندوں) کے نام یہ سرکلر (سرکاری فرمان نامہ) جاری کیا: ''اَدِقُّوْا اَقْلَامَکُمْ '' اپنے قلم کی نوک کو باریک رکھو'' وَقَارِبُوْا بَیْنَ سُطُوْرِکُمْ '' سطروں کے درمیان کم فاصلہ رکھو'' وَاحْذِفُوْا مِنْ فُضُوْلِکُمْ '' بے مقصد باتوں کو نہ لکھو'' وَاقْصُدُوْا الْمَعَانِیَ '' مقصد بیان کرنے پر اکتفا کرو'' وَاِیَّاکُمْ وَالْاِکْثَارَ '' زیادہ لکھنے اور کاغذ بھرنے سے پرہیز کرو'' فَاِنَّ اَمْوَالَ الْمُسْلِمِیْنَ لَاتَحْتَمِلُ الْاَضْرَارَ '' کیونکہ مسلمانوں کا بیت المال اس قدر نقصان کو برداشت

نہیں کرسکتا۔

۱۷۔حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۲۲۴ میں عدالت کی اہمیت اور ظلم سے دور رہنے کے بارے میں دلچسپ انداز میں بیان فرماتے ہیں:

''خدا کی قسم اگر سات اقلیم مجھے اس شرط پر دی جائیں کہ میں صرف اس بات میں خدا کی نافرمانی کروں کہ جو کا چھلکا چیونٹی کے منہ سے ناحق چھین لوں،تو قطعاً ایسا نہیں کروں گا،خدا کی قسم اگر ساری رات صبح تک مجھے خاردار جھاڑی پر گھسیٹا جائے،میرے نزدیک اس بات سے بہتر ہے کہ میں خدا اور اس کے گرامی قدر پیغمبرؐ کے نزدیک ظالموں میں شمار ہوں''

نوٹ: جس طرح آج زمین کو سات براعظموں میں تقسیم کیا ہوا ہے سابقہ دور میں بھی اسے سات حصوں (اقلیموں) میں تقسیم کیا ہوا تھا۔

۱۸۔(بحار الانوار جلد ۴۱ ص ۱۳۷ میں ہے) حضرت علی علیہ السلام نے اپنی حکومت کے مرکز ''کوفہ'' میں لوگوں کو مخاطب کرکے فرمایا:

''یَا اَهْلَ الْکُوْفَةِ اِذَا اَنَا خَرَجْتُ مِنْ عِنْدِکُمْ بِغَیْرِ رَاحِلَتِیْ وَرَحْلِیْ وَغُلَامِیْ فُلَانَ فَاَنَا خَآئِنٌ...... '' اے اہل کوفہ! اگر تم مجھے کبھی دیکھو کہ میں کوفہ سے باہر چلا گیا ہوں اور اپنی اس وضع کو تبدیل کرلیا ہے جو پہلے سے تھی مثلاً لباس یا خوراک یا سواری اور غلام وہ نہیں ہیں جو پہلے دن سے تھے اور اپنی حکومت کے دوران اپنی زندگی کو پر تعیش اور مرفہ حال بنا دیا ہے تو سمجھ لو کہ میں نے تمہارے ساتھ خیانت کی ہے۔

۱۹۔حضرت علی علیہ السلام نے ابن ملجم ملعون کی ضرب کھانے کے بعد اپنے فرزندان عزیز حسنین شریفین علیہم السلام کو مخاطب کرکے وصیت فرمائی: ''لَاتَقْتُلَنَّ بِیْ اِلَّا قَاتِلِیْ'' میری شہادت کی وجہ سے قتل عام برپا نہ کرنا بلکہ صرف میرے قاتل ابن ملجم

ہی کو قتل کرنا۔ پھر فرمایا: ''فَاضْرِبُوْهُ ضَرْبَةً بِضَرْبَةٍ'' چونکہ اس نے مجھے صرف ایک ضرب ماری ہے لہٰذا تم بھی اسے صرف ایک ضرب مارنا۔ (نہج البلاغہ صبحی صالح ص۴۲۲)

دیکھا آپ نے! امیرالمومنین علیہ السلام اپنے خون میں غلطاں ہیں مگر دائرہ عدالت سے باہر نہیں نکلے۔

۲۰۔ (اصول عقائد میں محسن قرائتی ص۱۱۰، ۱۳۷ میں لکھتے ہیں) حضرت علی علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ: ''اِنَّ لِلْاَقْصیٰ مِثْلُ الَّذِیْ لِلْاَدْنیٰ'' ملک میں دور ترین علاقہ میں رہنے والوں کا بھی اتنا ہی حصہ ہوتا ہے جو نزدیک ترین علاقہ کے رہنے والوں کے لئے ہوتا ہے۔

اس سے آپؑ گویا یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ملک کا بجٹ تمام لوگوں کے لئے یکساں ہونا چاہئے ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ جو لوگ دارالخلافہ کے نزدیک ہوں وہ تو فنڈز سے خوب خوب مزے اڑائیں اور دور دراز اور پسماندہ علاقوں کے لوگ اپنے اصل حق سے بھی محروم ہو جائیں۔

۲۱۔ (نہج السعادۃ جلد۴ص۱۴۴ میں ہے) عمارہ ہمدانی کی دختر سودہ نے حضرت علی علیہ السلام کے پاس آکر آپ کے کارندے کی کارستانیوں کی شکایت پیش کرنا چاہی۔ اس وقت آپ نماز ادا کر رہے تھے، آپ نے نماز مختصر کر کے ختم کی اور اس سے خیریت کا حال احوال دریافت کیا، سودہ نے اپنے شہر میں مولا کے کارندے کی مالیات اور خراج کے بارے میں شکایت پیش کی امام علیہ السلام نے جونہی اس کی شکایت سنی تو سخت پریشان ہو گئے، آنکھوں سے آنسو بہنے لگے روتی آنکھوں کے ساتھ آسمان کی طرف منہ کر کے کہا: ''اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الشَّاهِدُ عَلَیَّ وَعَلَیْهِمْ وَاِنِّیْ لَمْ اٰمُرْهُمْ بِظُلْمِ خَلْقِکَ'' خداوندا! تو مجھ پر اور ان پر گواہ ہے، میں نے اسے

تیری مخلوق پر ظلم کرنے کا حکم نہیں دیا۔

اس کے بعد امام نے چمڑے کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اس پر یہ آیت تحریر کی ''قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ'' تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس موعظہ پہنچ چکا ہے (یونس/ ۵۷) بعد میں لکھا جونہی تمہارے پاس میرا یہ خط پہنچے، تمہارے ہاتھوں میں اس وقت جو کچھ بھی مال زکوٰۃ اور مالیات میں سے ہے اسے محفوظ رکھو اور اس میں کوئی تصرف نہ کرو یہاں تک کہ ہماری طرف سے کوئی نمائندہ تمہارے پاس پہنچے اور اسے تم سے اپنی تحویل میں لے لے۔

۲۲۔ (نہج السعادۃ جلد۵ص۳۶ کے طابق:) حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کا اہواز میں کارندہ بنام ''ابن ہرمہ'' خیانت کا مرتکب ہوا اس بات کا علم حضرت امیرؑ کو ہوا تو آپ نے اہواز کے قاضی ''رفاعہ بن شداد'' کے نام یہ خط تحریر فرمایا: ''جب تم میرا یہ خط پڑھو تو ''ابن ہرمہ'' کو اہواز کے کاموں سے برطرف کر دو۔

۲۳۔ (الکامل فی التاریخ جلد۳ منقول از موسوعہ الامام العلی بن ابی طالبؑ جلد۴ص۲۲۰ میں ہے کہ) جب حضرت عثمان قتل کر دئے گئے اور حضرت امیرالمومنین علیہ السلام اور امیر شام کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو ''عبیداللہ بن حر جعفی'' معاویہ کے ساتھ جا ملا اور جنگ صفین میں ''مالک بن مسمع'' کے ہمراہ اس کے لشکر میں آموجود ہوا، جنگ کے خاتمہ کے بعد شام واپس چلا گیا اور امیر شام کے پاس قیام پذیر ہو گیا۔ جبکہ اس کی بیوی کوفہ میں رہ رہی تھی۔

چونکہ عبیداللہ بن حر جعفی کی غیر حاضری کو کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ لہٰذا اس کے بھائی نے اس کی بیوی کا عقد ''عکرمہ بن خُبیص'' نامی شخص سے کر دیا، اور جب اس عقد کی اطلاع عبیداللہ جعفی کو پہنچی تو وہ شام سے کوفہ آیا اور عکرمہ کی حضرت علی علیہ السلام سے اس امر کی شکایت کی حضرتؑ نے عبیداللہ سے فرمایا: ''تم نے ہمارے دشمن

کے ساتھ مل کر کے ہمارے اوپر غالب کرنے کی کوشش کی اور ہم سے خیانت کی'' یہ سن کر عبید اللہ نے کہا: '' آیا میرا آپ کے دشمن کے پاس چلا جانا آپ کو عدل پر مبنی فیصلے سے روک دے گا؟'' حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ''نہیں!'' پھر اس نے عکرمہ کی ساری داستان آپ کے سامنے دہرائی۔ حضرت نے اس کی بیوی کو اس کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ لیکن چونکہ وہ اس وقت حاملہ تھی لہٰذا آپ نے اسے ایک معتمد اور امین شخص کے حوالے کر دیا تاکہ وہ وضع حمل کرے اور بچے کو جنم دینے کے بعد بچہ عکرمہ کو اور عورت عبید اللہ کو لوٹا دی، چنانچہ وہ اپنی بیوی کو لیکر شام چلا گیا اور مولا علیؑ کی شہادت تک شام میں رہا۔

۲۴۔ علی بن ربیعہ کہتے ہیں کہ، جعدہ بن ھبیرہ_ ام ہانی کے فرزند، حضرت علیؑ کے بھانجے_ نے آ کر مولا کی خدمت میں عرض کیا:

''یا امیر المومنینؑ! جو لوگ آپ کے پاس آتے ہیں اور ان میں سے ایک تو آپ سے دل و جان سے محبت کرتا ہے اور اپنے خاندان سے بھی زیادہ آپ کو دوست رکھتا ہے جبکہ دوسرا آپ کا جانی دشمن ہے، اس قدر دشمن کہ اگر اس کا بس چلے وہ آپ کو شہید کر دے۔ آیا اگر حق اس دوسرے شخص کے ساتھ ہو، تو کیا آپ پہلے شخص کے حق میں فیصلہ دیں گے یا دوسرے شخص کے؟'' راوی کا بیان ہے، جونہی آپ نے اس سے یہ بات سنی تو فوراً اس کے سینے پر ہاتھ مار کر کہا: ''یہ تو ایسی بات ہے کہ اگر مجھے در پیش آ جائے تو میں خدا کی رضا کو پیش نظر رکھتے ہوئے حق کا فیصلہ کروں گا'' (تاریخ دمشق جلد۴۲ ص۴۸۸ منقول از موسوعہ مذکورہ)

۲۵۔ (تاریخ یعقوبی جلد۲ ص۳۰۶ میں ہے) زہرہ کہتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص ان کے کارندوں میں سے ایک کارندے کا خط ان کے نام لیکر آیا، اس خط میں تحریر تھا ''شہر کو آباد کرنے

اور اس کے اصلاح کرنے کی ضرورت ہے'' زہری کہتے ہیں کہ میں نے اس موقع پر عمر بن عبد العزیز سے کہا: ''حضرت علی علیہ السلام کے ایک کارندے نے بھی ان کی خدمت میں اسی مضمون کا خط لکھا تھا جس کے جواب میں حضرتؑ نے یہ عبارت تحریر فرمائی تھی'' اَمَّا بَعْدُ، فَحَصِّنْهَا بِالْعَدْلِ وَنَقِّ طُرُقَهَا مِنَ الْجَوْرِ '' تمہارے خط کا جواب یہ ہے کہ شہر کو عدل و انصاف کے رائج کرنے اور ظلم و جور سے باز رکھنے کے ساتھ آباد کرو۔''

یہ سن کر عمر بن عبد العزیز نے بھی وہی جواب اپنے کارندے کو لکھ بھیجا۔

۲۶۔ (بحار الانوار جلد۴۱ ص۱۰۵ کے مطابق) مولا علی علیہ السلام کے دور میں تاریخ نے شہر کوفہ کی یہ نقشہ کشی کی ہے'' مَا اَصْبَحَ بِالْكُوفَةِ اِلَّا نَاعِماً، اِنَّ اَدْنَاهُمْ مَنْزِلَةً لَيَاْكُلُ الْبُرَّ وَيَجْلِسُ فِي الظِّلِّ وَيَشْرَبُ مِن مَّآءِ الْفُرَاتِ '' اس دور میں ایسا کوئی شخص نہیں تھا جس کی آسائش کی زندگی نہ ہو، معاشرہ کا کم ترین طبقہ گندم کی روٹی کھاتا تھا، مکان کا مالک تھا اور بہترین پانی سے استفادہ کرتا تھا۔

یہ تھی عدالت علویؑ کی ایک جھلک جسے چند لفظوں میں بیان کرنے کی سعادت حاصل کی ہے اور یہی وہ معیار عدالت تھا جس کی بنا پر آپ کو محراب عبادت میں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔

آپ جہاں پر بھی ''عدالت'' کی تلاش میں نکلیں گے وہیں پر علیؑ کو موجود پائیں گے، جہاں پر بھی آپ ''انسانیت'' کو تلاش کریں گے وہیں پر علیؑ کو بے نظیر پائیں گے کیونکہ علیؑ ہر اچھائی کا بہترین نمونہ اور ہر خوبی کی اعلیٰ ترین مثال ہیں کوئی بھی شخص انسانیت، عدالت، سخاوت، آزادی فکر، جود و سخا اور شجاعت و بہادری میں آپ کی برابری نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی آپ کے علم، ادب، فصاحت، بلاغت، وسعت قلبی،

نرم دلی اور مہربانی کی گرد پا کو پہنچ سکتا ہے، اللہ اللہ! کہاں وہ اور کہاں ابوالحسنؑ؟ کہاں زمین کا ''چاند'' اور کہاں ''آسمانی چاند'' دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

امام علی علیہ السلام تمام انسانی فضائل کا مجسم نمونہ ہیں، ہر فضیلت ومنقبت آپ ہی کے نام کے مساوی ہے۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ علیؑ کو انہی بلند مرتبہ معانی کے ساتھ یاد کیا جائے جو ان میں تجلی کر چکے ہیں۔

ابتدائے آفرینش سے آج تک بلکہ قیامت تک عالم انسانیت میں آپ کا کوئی ثانی نہیں اگر ''شبّر'' کے پاس ''چشم بینا'' ہوتی تو اسے معلوم ہوتا کہ علیؑ کے اس دنیا سے چلے جانے کی وجہ سے عالم انسانیت کو کس قدر نقصان ہوا ہے۔ اور کس قدر عظیم سانحہ سے دوچار ہو کر خسارہ اٹھا چکا ہے؟

چونکہ امام علی علیہ السلام انسانی اقدار کا جلوہ اور تمدن انسانی کی شمع ہیں لہذا تمام بزرگوار شخصیتیں ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کئے ہوئے ہیں اور جو کام وہ انجام دے سکتی ہیں تو بس یہی کہ اپنا سر گھٹنوں میں جھکائیں اور اس کی بزرگی اور عظمت کے آگے کمر خم کردیں۔

ان بزرگوار ہستیوں کا تعلق کسی بھی ملک، کسی بھی تمدن، کسی بھی کلچر اور کسی بھی نظریہ سے ہو جب فرزند ابوطالبؑ کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوتی ہیں تو خود کو حقیر سمجھتی اور ان کی بارگاہ میں کورنش بجا لانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں پاتیں۔ اور اس عظیم الشان ہستی کا عشق ان کے تمام وجود کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے اور کون ایسا شخص ہے جو اس کی ذات کا عاشق نہ ہو اور اس بات کا اعتراف نہ کرے کہ وہ ایک بے بدل شخصیت کے مالک ہیں۔

یہی وجہ سے کہ ہر دین و مذہب اور مختلف اور گوناگوں فلسفی اور فکری مکاتب سے تعلق رکھنے والے دانشمندوں، ادیبوں، سیاستدانوں، روشن خیالوں، اعلیٰ تعلیم یافتہ

لوگوں اور حق وحقیقت کے طلب گاروں اور نیکی اور فضیلت کے ساتھ محبت کرنے والوں نے جب بھی اس بے مثال شخصیت کی طرف دیکھا اسے عزت واحترام اور تعجب اور حیرت کی نگاہوں سے ہی دیکھا۔

عدالت اصول دین میں سے ہے

(سورہ نحل آیت ۹۰ میں) خداوند عالم فرماتا ہے:

''اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ''

بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل اور نیکی کا اور عزیزوں رشتہ داروں کے ساتھ بخشش اور صلہ رحمی کا اور برائیوں، بدکاریوں اور برے کاموں سے باز رہنے کی ہدایت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اصول دین کی ایک اصل، اسلام کے بنیادی ستونوں میں سے ایک ستون اور روح کی حیثیت سے تعارف کراتے ہوئے فرماتا ہے: ''خداوند عالم عدل اور نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائیوں، برے کاموں اور ظلم سے منع فرماتا ہے''

عدل واحسان، خصوصاً عدل کا موضوع قطع نظر اس کے کہ خود قرآن مجید میں کئی بار ذکر ہوا ہے تاریخ اسلام اور مسلمانوں کے درمیان ایک طولانی فصل کا حامل ہے، خواہ علوم اسلامی کی تاریخ میں علمی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے یا اسلام کی سیاسی اور سماجی تاریخ میں عملی نظر سے۔ چونکہ ارکان اسلام میں ایک اصل عدل ہے، لہٰذا بہتر

معلوم ہوتا ہے کہ اسی اصل ہی کے بارے میں قدرے تفصیل سے گفتگو کی جائے، خاص کر جبکہ اہل تشیّع کے نزدیک دین کے پانچ اصولوں میں سے ایک اصل یہ بھی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ اصول دین پانچ ہیں: توحید، عدل، نبوت، امامت اور معاد یعنی قیامت ___ عدل اور امامت کو شیعہ اصول دین میں شمار کرتے ہیں جبکہ بعض اوقات کچھ لوگ انہیں اصول مذہب مانتے ہیں

بہرحال بذات خود عدل ___ یعنی عدالت ___ بہت اہمیت کی حامل ہے اور اس کا شمار اخلاقی مسائل میں نہیں ہوتا، لہٰذا اس مختصر سے حصے میں تا حد مقدور اسی اصل کے بارے میں گفتگو کی جائے گی، اس کی مختصر تاریخ پر روشنی ڈالی جائے گی اور جن امور کا ہماری سرنوشت اور حالات حاضرہ کا تقاضا ہے انہیں اپنے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔

چونکہ اس اصل کا تعلق ایک امام، عادل علی الاطلاق سے ہے جو مجسمہ عدالت ومساوات ہے، شیفتہ حق وانصاف ہے، انسان دوستی، رحمت، محبت اور احسان کا کامل نمونہ ہے امام المتقین اور امیر المومنین ہے وہی امام عادل ومنصف جن کے بارے میں اپنوں نے نہیں بلکہ غیروں نے کہا: ''قُتِلَ عَلِیٌّ فِی مِحْرَابِ عِبَادَتِهِ لِشِدَّةِ عَدْلِهِ'' جسے محراب عبادت میں اس کی سخت عدالت کی وجہ سے شہید کیا گیا۔

بقول شاعر:

دشمن طاووس آمد پرِّ او — اے شه بکشته فراو
گفت من آن ہوم کز ناف من — ریخت آن صیادخون صاف من

طاووس (مور) کے دشمن اس کے پر ہوتے ہیں، بعض اوقات بادشاہ کو اس کی کروفر موت کے گھاٹ تک لے جاتی ہے، ہرن

کہتا ہے میں وہی تو ہوں جس کی مشک نافہ کیلئے شکاری میرا صاف ستھرا خون ناحق بہاتا ہے

علیؑ شہید عدالت ہیں

یقیناً علیؑ مرتضی مجسم عدل، نمونہ رحمت ومحبت اور جود واحسان تھے، چونکہ ہمارا موضوع ''شہید عدالت'' ہی ہے لہٰذا ہم چاہتے ہیں قدرے تفصیل سے اس پر روشنی ڈالیں جس نے حقوق انسانی کے دفاع اور حق وعدالت کی سخت پابندی کی وجہ سے ۱۹/ رمضان المبارک ۴۰ھ کی رات زہر سے بجھی تلوار کا وار اپنے سر پر قبول کیا، حالانکہ اگر دیکھا جائے تو اس ضربت سے آپ کو رنج وغم، دکھوں اور تلخیوں، مصائب وآلام، مشقتوں اور پریشانیوں سے نجات مل گئی، ایسی ضربت جس نے آپ کو اپنے فرائض کی ادائیگی سے روک دیا، ایسی ضربت جس نے علیؑ کو آسودہ خاطر کر دیا مگر عالم اسلام کو ابد تک سوگوار بنا دیا، کیونکہ ایسے عادل امام کی حکومت اگر مزید ایک عرصے کیلئے برقرار رہتی تو ایک ایسے معاشرے کا وجود عمل میں آجاتا جو ایک حقیقی معنوں میں روشن اسلامی معاشرہ ہوتا اور دنیا جس پر رشک کرتی۔

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اس ضربت سے حضرت علی علیہ السلام آسودہ خاطر ہو گئے اور انہیں تمام مشقتوں اور پریشانیوں سے نجات مل گئی، ہم نے اپنی طرف سے نہیں کہا بلکہ یہ حضرت کا خود اپنا کلام ہے جو کہ (نہج البلاغہ مکتوب ۲۳ میں ہے) جس سے ہم نے اقتباس کیا ہے، جب آپ ابن ملجم کی ضربت کے بعد بستر بیماری پر کروٹیں لے رہے تھے، تو فرمایا: ''وَمَا كُنْتُ اِلَّا كَقَارِبٍ وَّرَدَ وَطَالِبٍ وَّجَدَ'' میری مثال ایک پیاسے کی سی ہے جو ایک تاریک رات میں لق ودق صحرا میں پانی کی تلاش میں سرگرداں ہو اور اچانک اسے پانی مل جائے اور میں نے

ہمیشہ خدا سے یہی درخواست کی ہے کہ میری موت کا جو وقت بھی مقرر ہے اسی پر مجھے موت آئے مگر بستر بیماری پر نہیں بلکہ راہ خدا میں شہادت کی موت آئے سو میری یہ درخواست بھی پوری ہوگئی۔

کونسی عدالت باعث شہادت بنی؟

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ کس قسم کی عدالت آپ کی شہادت کا باعث بنی؟ اور اس راہ میں آپ کی کونسی ایسی سخت گیری تھی جس کی وجہ سے دشمن کے مفادات پر براہ راست ضرب پڑتی تھی اور اسے وہ برداشت نہ کرسکا اسی لئے آپ کو رستے سے ہٹانے پر تُل گیا؟

عدالت ایک اخلاقی عادت ہوتی ہے اور اسی حد تک محدود ہوتی ہے مثلاً ہم کہتے ہیں امام جماعت عادل ہو، جج اور قاضی عادل ہو، طلاق کے گواہ عادل ہوں یا کسی شرعی گواہی کیلئے گواہ عادل ہوں وغیرہ اور کیا یہاں پر بھی اسی قسم کی عدالت مراد ہے؟ اس قسم کی عدالت تو کسی کے قتل کا موجب نہیں ہوتی، بلکہ برعکس کسی کی شہرت اور محبوبیت کا سبب ہوتی ہے اور لوگ اس کا بیشتر احترام کرتے ہیں۔

مولا علیؑ کی جو عدالت ان کے قتل کا موجب بنی، درحقیقت انکی عدالت اجتماعی تھی، ان کی وہ مخصوص طرز فکر تھی جو عدالت اجتماعی کے فلسفے کے تحت کارفرما تھی وہ فلسفہ اسلامی عدالت اجتماعی کا خواہاں تھا، اسی پر آپ کا اصرار تھا کہ اسلام عدالت اجتماعی کا اور اسلامی اجتماعی فلسفہ صرف اور صرف اسی کا متقاضی تھا۔

مولا علیؑ صرف ''عادل'' ہی نہیں تھے بلکہ ''عدالت خواہ'' بھی تھے اور ان دونوں میں بہت فرق ہے، یعنی عادل اور عدالت خواہ میں وہی فرق ہے جو آزاد اور آزادی خواہ میں ہوتا ہے، ایک آدمی آزاد ہے یعنی وہ بذات خود اور بنفس نفیس آزاد

ہے، جبکہ دوسرا آزاد بھی ہے اور آزادی خواہ بھی ہے یعنی وہ اجتماع اور معاشرے کی آزادی کا خواہاں ہے اور آزادی اُس کا ہدف اور اجتماعی آئیڈیا ہے یا جس طرح علم ہے، ایک شخص بذات خود عالم ہے اور ایک علم کا حامی اور طرفدار ہے وہ علم کے عام کرنے کا دلدادہ اور عمومی تعلیم اس کا مطمح نظر ہے، وہ چاہتا ہے کہ جہالت دور ہو اور علم عام ہو، تو عدالت بھی اسی طرح ہے۔

ایک اور مثال لیجئے کہ ایک شخص صالح ہے اور دوسرا اصلاح طلب ہے، صالح شخص بذات خود نیک اور صالحیت پر کاربند ہے جبکہ دوسرا معاشرے میں اصلاح کا خواہاں ہے قرآن کریم کی ایک آیت ہے: ''کُونُوا قَوَّامِینَ بِالْقِسْطِ'' (نساء/ ۱۴۵) قیام بالقسط کرو، یعنی عدل برپا کرو اور یہ عادل ہونے کا حکم نہیں ہے بلکہ عدالت کے قیام کا حکم ہے، کیونکہ عادل ہونا ایک انفرادی فعل ہے جبکہ عدالت کا برپا کرنا ایک معاشرتی اور اجتماعی کام ہے۔

سخاوت بہتر ہے یا عدالت؟

امیر کائنات مولائے متقیان علی بن ابی طالب علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ:

''اَیُّهُمَا اَفْضَلُ اَلْعَدْلُ اَمِ الْجُودُ؟''

یعنی کونسی چیز بہتر ہے جود وسخاوت یا عدل؟

''فَقَالَ الْعَدْلُ یَضَعُ الْاُمُورَ مَوَاضِعَهَا وَالْجُودُ یُخْرِجُهَا مِنْ جِهَتِهَا''

فرمایا:

''عدالت بہتر ہے سخاوت سے، کیونکہ عدالت ہر چیز کو اپنی جگہ پر برقرار رکھتی ہے اور حق کو اپنی مقدار تک پہنچاتی ہے لیکن جودو

سخاوت تمام امور کو ان کے مدار و محور سے نکال دیتی ہے، وہ یوں
کہ مثلاً انسان اپنے مسلّم حق سے دستبردار ہو جاتا ہے اور
دوسرے کو وہ حق دے دیتا ہے جو مستحق نہیں ہے اسی لئے جود وسخا
چیزوں کو اپنے اصل مقام سے ہٹا دیتی ہے، فرماتے ہیں کہ:
''اَلْعَدْلُ سَآئِسٌ عَامٌ وَالْجُودُ عَارِضٌ خَاصٌ '' دوسری
بات یہ ہے کہ عدالت ایک عمومی مُدیر ہے یعنی عمومی زندگی کا
بنیادی ستون اور قوانین کی اساس ہے، جبکہ سخاوت خاص طور پر
کوئی کسی پر کرتا ہے اور جود وایثار کا مظاہرہ کرتا ہے۔

جود وایثار کو عمومی زندگی کا بنیادی ستون قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اس کی بنیاد پر آئین وقوانین کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے، چنانچہ اگر جود وسخا اور ایثار واحسان کا نام باقی نہ رہے تو بھر یوں سمجھ لیجئے کہ اس کے وجود سے اس کا عدم لازم آجائے گا، لہٰذا سخاوت اور ایثار اُس وقت سخاوت اور ایثار ہوتے ہیں جب ان کیلئے کوئی حتمی اور واجب العمل قانون موجود نہ ہو، بلکہ انسان فقط اپنی شرافت، بزرگواری، عفوو درگذر، نوع دوستی کی وجہ سے سخاوت اور ایثار کرے، لہٰذا عدل، جود وسخا سے افضل ہے۔

یہ تھا علی مرتضیٰؑ کا عدل کی افضلیت کے بارے میں جواب اور جو شخص اجتماعی ومعاشرتی فکر کا مالک نہیں ہے، انفرادی اور شخصی پیمانوں سے ہر چیز کو ناپتا ہے وہ قطعاً اس چیز کا جواب نہیں دے سکتا، وہ کبھی یہ نہیں کہے گا کہ عدالت سخاوت سے بالاتر ہے، لیکن مولا علیؑ اپنے کلام گوہر بار میں عدل کو اجتماعی پیمانوں میں رکھ کر اور انہی سے اندازہ لگا کر اسے سخاوت اور جود وایثار سے افضل قرار دے رہے ہیں اور یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو فلسفہ اجتماعی پر مکمل عبور رکھتا ہو۔

جود اور عدل اخلاقی، انفرادی نقطہ نظر سے

علمائے اخلاق، جود وسخا کو عدل وانصاف سے بالاتر سمجھتے ہیں، لیکن علیؑ مرتضیٰ کمال صراحت کے ساتھ کہہ رہے ہیں: ''عدل، جود وسخا سے افضل ہے اور اس کے دلائل یہ ہیں۔''

البتہ ان دونوں نظریات کا زاویۂ نگاہ جداگانہ ہے، اگر تو انفرادی اور شخصی اخلاق کے لحاظ سے اس چیز کا مطالعہ کیا جائے تو یقیناً ''جود، عدل سے افضل ہے'' کیونکہ اخلاقی نقطہ نظر سے یہ عدل پر فوقیت رکھتا ہے۔ کیونکہ عدل پرور انسان اس وجہ سے ذاتی طور پر شخصی اور انفرادی لحاظ سے عادل ہے اور اس میں یہ انسانی کمال ہے کہ وہ کسی کے حقوق پر ڈاکہ نہیں ڈالتا، کسی کا مال نہیں لوٹتا، کسی کے مال پر ناجائز قبضہ نہیں کرتا، کسی کے ناموس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا، کسی کی عزت پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔
لیکن جود وسخا سے کام لینے والا نہ صرف دوسروں کے مال پر قبضہ نہیں کرتا بلکہ اپنا ذاتی مال اور ہاتھوں کی کمائی بھی دوسروں کو بطور ایثار دے دیتا ہے، قطار میں لگے ہونے کے وقت دوسروں کی باری پر قابض نہیں ہوتا بلکہ اپنی باری بھی دوسروں کو دے دیتا ہے، کسی کو زخمی نہیں کرتا بلکہ ہسپتالوں، جنگ کے میدانوں، غریبوں کی جھونپڑیوں اور بے نواؤں کے چھپروں میں جا کر مریضوں اور زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کرتا ہے، انکے دوا دارو میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا، مفت میں بیماروں کی دیکھ بھال بھی کرتا ہے۔
نہ صرف کسی کا ناجائز خون ہی نہیں بہاتا بلکہ اس بات پر آمادہ رہتا ہے کہ خون کے طلبگار مریضوں کو اپنا خون بھی ہدیہ کرے۔ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ذاتی اور انفرادی نقطہ نظر سے سخاوت، عدالت سے بہتر ہے، بالاتر ہے، فوقیت رکھتا ہے بلکہ ناقابل قیاس ہے۔

اجتماعی نقطہ نظر سے

لیکن اگر اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے نقطہ نظر سے دیکھ جائے تو کونسی چیز افضل ہے؟ عدل یا سخاوت؟

اجتماعی و معاشرتی زندگی کے لحاظ سے اور عمومی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو افراد، اجتماع کو ایک اکائی کی صورت میں تبدیل کر دیتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ''عدل'' کا مقام ''جود وسخا'' سے بلند تر ہے۔

اجتماعی انسانی زندگی میں عدل کا مقام کسی بلند عمارت کی بنیاد کا سا ہے جب تک بنیادیں مضبوط و مستحکم نہیں ہوں گی اس وقت تک عمارت پائیدار اور استوار نہیں ہوسکتی، عمارت کا رنگ وروغن عمارت کی مضبوطی کا سبب نہیں ہوتا البتہ اس میں بھی رہائش اختیار کی جاسکتی ہے اور ممکن ہے کہ کوئی عمارت بڑی ہی خوبصورت سجی دھجی اور مرصع اور مزین، ظاہر بڑا خوبصورت اور زیبا ہو مگر چونکہ بنیادیں، خراب ہیں، کمزور ہیں اس کیلئے تو صرف ایک ہی بارش کافی ہے جس سے وہ دھڑام کے ساتھ بڑے آرام سے زمین بوس ہوسکتی ہے اور اپنے ساکنین کو ایک پل میں موت کی وادی میں دھکیل سکتی ہے، اس لئے وہ عمارت صرف دیکھنے اور دکھانے کے لائق ہوسکتی ہے رہنے کے نہیں۔

علاوہ ازیں یہ جود وسخاوتیں، اور ایثار و احسانات بعض اوقات مفید اور ثمر آور ہوتے ہیں اور سخاوت کرنے والے کی طرف سے ایک عظیم فضیلت شمار ہوتے ہیں مگر سخاوت کرنے والے کے لحاظ سے کوئی فضیلت نہیں ہوتے، لہٰذا اس کا حساب و کتاب بھی پیش نظر رہنا چاہئے، سماج اور معاشرے کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے، اگر اجتماعی توازن کی رعایت نہ کی جائے اور کسی حساب و کتاب کے بغیر جود و

سخا کے دریا بہائے جائیں تو یہی اخلاقی فضیلت عمومی بدبختی ناہنجاری اور سماجی خرابی کا روپ دھار لیتی ہے، حد سے زیادہ صدقے، اوقاف، نذورات جہاں پر بھی معمول بن جائیں گے وہیں پر ایک خطرناک سیلاب کی طرح تمام معاشرے کی خوبیوں کو ساتھ بہالے جائیں گے، انسانوں کو بے کار، سست، قلاش، بھکاری اور فاسد الاخلاق بنادیں گے، معاشرے کو اس قدر نقصان پہنچائیں گے کہ ایک جرار لشکر بھی ایسا نہ کر سکے، خداوند عالم (آل عمران آیت ۱۱۷ میں) بعض قسم کی خیرات کے بارے میں فرماتا ہے:

''مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِي هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ''

جو لوگ اس دنیا میں راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور صدقہ و خیرات کے عنوان سے لوگوں کو دیتے ہیں ان کی مثال ایسے ہے جیسے تیز ہوا چلے جس میں سردی بھی ہو اور وہ ایسے لوگوں کی زراعت تک جا پہنچے جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے اور وہ اس کھیتی کو برباد کر دے، اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں۔

احسان اور جود وسخا کے ساتھ معاشرہ کو ہرگز نہیں چلایا جاسکتا سماجی امور کی بنیاد ''عدل'' ہے، احسان وجود نہیں اور پھر جود اور احسان بھی وہ جس کا حساب و کتاب نہ ہو، ایسے جود و احسان اور ایثار وسخا، کاموں کو ان کے مدار سے خارج کر دیتے ہیں۔

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

''كَمْ مِنْ مَّفْتُوْنٍ بِحُسْنِ الْقَوْلِ فِيْهِ، وَكَمْ مِنْ

مَّغۡرُورٍ بِحُسۡنِ السَّتۡرِ عَلَيۡهِ وَكَمۡ مِن مَّسۡتَدۡرَجٍ بِالۡاِحۡسَانِ اِلَيۡهِ''

بہت سے عیب دار لوگ ایسے ہیں جنہیں تعریف وتوصیف نے بگاڑ دیا، بہت سے لوگوں کی عیب پوشی نے انہیں فریب میں مبتلا کردیا اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے ساتھ احسان کیا گیا اوراس احسان کے ذریعہ ان کے امورزندگی روبراہ ہوگئے لیکن وہ بتدریج غفلت کا شکار ہوکر ہلاک ہوگئے اور یہی ہے مولا علیؑ کے اس قول کا معنی جو آپ نے ارشاد فرمایا:

''اَلۡعَدۡلُ يَضَعُ الۡاُمُورَ مَوَاضِعَهَا وَالۡجُودُ يُخۡرِجُهَا مِنۡ جِهَتِهَا''

عدل تمام امور کو اپنے مدار پر چلاتی رہتی ہے، جبکہ جود وسخا انہیں اپنے اصل مدار سے خارج کردیتی ہے۔

بہت سے لوگ جب پہلے یہ سنتے ہیں کہ ''علیؑ'' جود وسخا کے مظہر کامل تھے، تو اس جملہ سے وہ عدل کو جود وسخا پر برتر سمجھ کر تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ عدالت، سخاوت سے بالاتر ہو؟ جو اہل جودوکرم اور ایثاروسخا کے سرخیل ہیں وہ جود و سخا کے بارے میں کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ''جودوکرم، امورزندگی کو ان کے مدار سے خارج کردیتا ہے؟''

لیکن جو کچھ ہم بیان کرچکے ہیں اور دو پہلوؤں کی وضاحت کرچکے ہیں اس سے معلوم ہوگیا ہے کہ ہم عدل اور جود کو ایک پہلو سے دیکھتے ہیں اور وہ ہے اس قضیہ کا اخلاقی پہلو، ذاتی اور شخصی فضیلت کا پہلو اور واقعاً اس پہلو سے دیکھا جائے تو حقیقت وہی ہے جو یہ سمجھتے ہیں۔

لیکن جو پہلو اہمیت کا حامل ہے اور جس پر پورے دین کا دارومدار ہے وہ ہے اس مسئلے کا اجتماعی اور سماجی پہلو اور ہماری اب تک اس کی طرف کم توجہ کرنے اور بہت کم حد تک سوچنے کی وجہ یہ ہے کہ کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ انسان نے سماجیات کے مطالعہ (social Study) کی طرف توجہ دی ہے اور سماجی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ان قوانین کو پہچانا ہے، سابقہ دور میں کم وبیش ہمارے عالیقدر مفکرین نے اس طرف توجہ فرمائی ہے لیکن سماجیات نے پھر بھی مدوّن علوم کی صورت اختیار نہیں کی تھی، لہٰذا وہ ہر قضیہ کے اخلاقی اور انفرادی پہلو پر ہی نظر رکھتی تھی۔

ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اب تک کسی نے اپنی کتاب میں اس جملے کے بارے میں بحث کی ہو جسے ہم بیان کرچکے ہیں، حالانکہ یہ جملہ ''نہج البلاغہ'' میں موجود ہے اور ہر ایک کی دسترس میں ہے، ہمارے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جملہ اخلاقی معیار کے تقاضوں کے مطابق لوگوں کی نگاہوں میں کوئی مناسب اور قابل توجہ معنی پیش نہیں کرسکا، لیکن اب جبکہ معاشرتی علوم ترقی کرچکے ہیں اور سماجیات پر زیادہ زور دیا جارہا ہے تو اخلاقی پیمانوں کے علاوہ اور بھی معیار ہمیں حاصل ہوئے ہیں جس سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ جملہ بڑا ہی قابل قدر اور بیش قیمت ہے اور یہ فرمان اپنے زمانے سے بلکہ سید رضی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے سے بہت ہی اعلیٰ اور بالا ہے، حتیٰ کہ بوعلی سینا بھی جو اس نہج البلاغہ کی جمع آوری کے دور کے عظیم ترین فیلسوف ہیں اس طرح کی بلند سماجی حقیقت کو بیان نہیں کرسکے۔

جود اور احسان میں فرق

جود اور احسان معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک ہیں اور قرآن مقدس میں عدل کو احسان کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ''اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ

وَالْاِحْسَانِ ''اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے یہ کہ کسی پوچھنے والے نے علی مولا علیہ السلام سے عدل اور جود کے بارے میں سوال کیا تھا اور حقیقتاً گویا اس نے یہ پوچھا تھا کہ یہ جو قرآن فرماتا ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ '' آیا عدل بہتر ہے یا احسان؟ البتہ جود اور احسان ایک دوسرے کے ساتھ نزدیک تر ہیں ___ نا کہ ایک ___ کیونکہ ''احسان'' عام ہے 'جود' خاص ہے، احسان مالی نیکی کو بھی شامل ہے اور غیر مالی نیکی کو بھی، مثلاً آپ نے کسی محتاج اور نابینا کا ہاتھ پکڑ کر اسے سڑک کے دوسرے کنارے پہنچا دیا تو آپ نے اس کیلئے ''جود'' نہیں بلکہ ''احسان'' کیا ہے، یا کسی جاہل کو تعلیم دی یا گمراہ کو راستے پر لے آئے، تو یہ جود نہیں بلکہ احسان ہوگا۔

عدالت کا سماجی فلسفہ

اس سوال کے نقل کرنے سے ہماری غرض یہ تھی کہ اس بات کی طرف متوجہ کیا جائے کہ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام عدالت کو کس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں؟ آیا وہ انفرادی اور شخصی نظریہ سے دیکھتے تھے یا ان کے زیادہ تر پیش نظر اجتماعی اور معاشرتی پہلو ہوتا تھا؟ اور آنجنابؑ کے جواب سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے پیش نظر زیادہ تر سماجی و معاشرتی نکتہ ہوتا تھا، اس لئے کہ ایک طرف تو آپ کی عدالت کے بارے میں یہ فرمائشات اور دوسری طرف یہ کہ اپنے دور حکومت اور زعامت میں جو طرز عمل اختیار کیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عدالت ایک اجتماعی اسلامی فلسفہ کی صورت میں مولائے متقیان امیر مومنان علیہ السلام کی توجہ کا مرکز تھی اور آپؑ اسے ایک عظیم ناموس اسلام کی حیثیت سے متعارف کرانا چاہتے تھے اور اسے دوسری تمام چیزوں سے بالاتر سمجھتے تھے، بلکہ آپ کی سیاست کی بنیاد بھی اسی اصل پر رکھی ہوئی تھی، کسی مقصد اور کسی بھی ہدف کیلئے ممکن ہی نہیں تھا کہ آپ اسے ذرہ برابر بھی نظر انداز کر دیں

یہی اور صرف یہی چیز تھی جس نے آپ کیلئے مشکلات پیدا کیں، جی ہاں عدالت ہی تھی جس کی وجہ سے آپ ان گنت مشکلات کا شکار ہوئے، ساتھ ہی یہ بھی بتاتے چلیں کہ اگر کوئی محقق یا مورخ آنجنابؑ کی خلافت کے زمانے کے حوادثات کا تجزیہ اور اس کی تحلیل کرنا چاہتا ہے اس کیلئے بھی یہی چیز ___ عدل علوی ___ ایک کلیدی حیثیت کی حامل ہے، اس لئے مولا علی علیہ السلام اس بارے میں بہت زیادہ سختی سے کام لیتے تھے۔

عدالت کے بارے میں علیؑ کا سخت اور ناقابل تغیر موقف تھا، جسے ایک تعبیر اور نظریئے کے مطابق ''عدالت'' جبکہ ایک دوسری تعبیر کے مطابق ''انسانی حقوق'' کہا جانا چاہئے اور اس کی اہمیت کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ حضرت عثمان کی وفات کے بعد خلافت کی باگ ڈور سنبھالنے کا اصل ہدف بھی یہی تھا، جبکہ اس وقت عدالت اجتماعی کا نقشہ ہی بگڑ چکا تھا، نشان مٹ چکے تھے، لوگ دو طبقوں میں تقسیم ہو چکے تھے، یا بالکل امیر یا بالکل غریب بالفاظ دیگر امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہو چکا تھا، (نہج البلاغہ خطبہ ۳ میں ہے:) توجہ فرمائیے:

''لَوْلَا حُضُوْرُ الْحَاضِرِ وَقِیَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُوْدِ النَّاصِرِ وَمَا اَخَذَ اللّٰہُ عَلَی الْعُلَمَآءِ اَنْ لَّا یُقَآرُّوْا عَلٰی کِظَّةِ ظَالِمٍ وَّلَا سَغَبِ مَظْلُوْمٍ لَاَلْقَیْتُ حَبْلَهَا عَلٰی غَارِبِهَا وَلَسَقَیْتُ اٰخِرَهَا بِکَاْسِ اَوَّلِهَا''

اگر کچھ لوگ یار و مددگار کے طور پر میرے پاس نہ آتے اور مجھ پر اتمام حجت نہ ہو چکی ہوتی اور اگر اللہ نے علماء اور روشن ضمیر افراد سے یہ عہد و پیمان نہ لیا ہوتا کہ وہ ظالم کی شکم سیری اور مظلوم کی گرسنگی پر آرام سے نہ بیٹھیں، یعنی حالات ایسا رخ اختیار کر

جائیں کچھ لوگ مال وثروت اور الٰہی عطا کو اپنے لئے سمیٹ لیں
اور اس قدر شکم سیر ہو کر کھائیں کہ پُرخوری کے مریض ہو جائیں
اور ان کے اطراف میں ایسے لوگ بھی ہوں جن کے حقوق اس
قدر پامال ہو جائیں کہ ایک وقت کی روٹی تک نہ ملے، تو علماء
خاموش ہو کر نہ بیٹھ جائیں، اگر میں ان حالات میں اپنے فریضے
کا احساس نہ کرتا تو ایک طرف ہو جاتا، خلافت کی مہار ہرگز اپنے
ہاتھ میں نہ لیتا اور پہلو تہی کر جاتا۔

خطرے کا احساس اور اتمام حجت

امیرالمومنین علیہ السلام کی حکومت کا پروگرام یہ تھا کہ صرف اپنی حکومت کے دوران ہی کسی پر ظلم نہیں ہونا چاہئے بلکہ گزشتہ ادوار میں پائمال شدہ حقوق کہ جنہیں ظالم وغاصب لوگوں نے چھین کر اپنا مال وملک قرار دیدیا تھا انہیں اصلی حقداروں کی طرف لوٹایا جائے اور غارتگروں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے ،لیکن اس پر عملدرآمد کی صورت میں اس کے انجام سے بھی اچھی طرح باخبر تھے کہ اس کے ردعمل میں کیا کچھ غوغا برپا نہیں کیا جائے گا ،لہٰذا بڑی مشکل کے ساتھ اور ہزار جتنوں کے بعد خلافت کی باگ ڈور سنبھالی اور اپنی بیعت کرنے والوں سے کہا:

''دَعُونِی وَالْتَمِسُوا غَیْرِی فَاِنَّا مُسْتَقْبِلُوْنَ اَمْراً لَّهُ وُجُوْهٌ
وَّاَلْوَانٌ لَّاتَقُوْمُ لَهُ الْقُلُوبُ وَلَاتَثْبُتُ عَلَیهِ الْعُقُول''

مجھے رہنے دو کسی اور کو تلاش کرو، کیونکہ ہمیں مستقبل بڑا متلون اور
ناپائیدار نظر آرہا ہے، جو اسلامی فریضہ مجھے سونپا جارہا ہے اس پر
عملدرآمد کیلئے مجھے حالات مناسب نظر نہیں آرہے ، ایسے

خطرناک حالات کا سامنا کرنا پڑے گا جن میں دلوں کو ٹھہراؤ
نصیب نہیں ہوگا اور عقلیں متزلزل ہو جائیں گی، یہ جو تم آج
میری بیعت کیلئے آئے ہو جب تم دیکھو گے کہ راہ بہت دشوار اور
خطرناک ہے تو ہوسکتا ہے کہ درمیان ہی سے پلٹ جاؤ۔

''وَاِنَّ الْاٰفَاقَ قَدْ اَغَامَتْ وَالْمَحَجَّةَ قَدْ تَنَکَّرَتْ''

سارے آفاق کو کہر اور بادلوں نے گھیرا ہوا ہے سورج بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا ہے، ایسے ایسے کام انجام پا کر ثبت ہو چکے ہیں جن کو تبدیل کرنا مشکل ہے، اسلام کی تاریخ کے اس مختصر عرصہ میں کچھ لوگ ''بتوں'' کی شکل اختیار کر چکے ہیں جن کے طور طریقوں کو بدلنا بہت دشوار کام ہے۔

آپ نے اتمام حجت کے طور پر فرمایا:

''وَاعْلَمُوا اَنِّیْ قَدْ اَجَبْتُکُمْ رَکِبْتُ بِکُمْ مَّا اَعْلَمُ''

(نہج البلاغہ خطبہ ۹۱)

یہ جو تم میری بیعت کیلئے بار بار اصرار کر رہے ہو زمام خلافت سنبھالنے کیلئے مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہو، تمہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہونی چاہئے کہ اگر میں نے تمہارے اصرار پر تمہاری اس پیشکش کو قبول کرلیا ہے تو جو کچھ میں مناسب سمجھوں گا اور بہتر جانوں گا خود بھی اسی پر عمل کروں گا اور تمہیں بھی اسی پر چلاؤں گا، اس بارے میں میں کسی کی بات نہیں مانوں گا لیکن اگر مجھے اس فریضہ کی بجا آوری سے معاف کردیں اور مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیں اور یہ ذمہ داری کسی اور کے سپرد کردیں تو میں معذور ہوں گا اور مثل سابق ایک عمومی زندگی بسر کروں گا۔

اسلامی جاگیریں

گذشتہ کے دورخلافت میں بہت سی جاگیریں جن کا تعلق پوری امت مسلمہ سے تھا، من پسند اور چہیتے افراد میں تقسیم کی گئیں مولا علی مرتضیٰؑ علیہ السلام ایسی ہی جاگیروں کے بارے میں فرماتے ہیں:

''وَاللّٰهِ لَوْوَجَدتُّهُ قَدْتُزُوِّجَ بِهِ النِّسَآءُ وَمُلِکَ بِهِ الْاِمَآءُ لَرَدَدتُّه''

خدا کی قسم! جو اراضی اور جاگیریں عامۃ المسلمین کا مال ہیں اور حضرت عثمان نے انہیں اپنے چہیتوں میں تقسیم کردیا ہے یا ان سے لونڈیاں خریدی گئی ہوں تو میں سب کو واپس کروں گا۔

ایک نگاہ پیچھے کی طرف

حضرت امیر علیہ السلام کو اپنے دورخلافت میں زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جس کی اصل وجہ یہ تھی کہ آپ بار بار ماضی کی طرف نظر ڈالتے تھے اور یہ نہیں کہتے تھے کہ ''گذشتہ راصلوات، آئندہ رااحتیاط'' جو ہوگیا سو ہوگیا، اب مستقبل کو سُدھارا جائے نہ، ایسی بات نہیں تھی، آپ فرماتے تھے میں ماضی سے بھی سروکار رکھتا ہوں، ماضی کی بنیادوں پر ہی تو مستقبل کی عمارت ستوار کی جاسکتی ہے اور حال و مستقبل کو سدھارا جاتا ہے، خراب ٹیڑھی اور فرسودہ بنیادوں پر بلند و مضبوط عمارت کو کھڑا نہیں کیا جاسکتا۔

عدالت میں وسعت ہے ظلم میں تنگی

اس کے بعد مولا فرماتے ہیں:

''اِنَّ فِی الْعَدْلِ سَعَةً وَّمَنْ ضَاقَ عَلَیْهِ الْعَدْلُ فَالْجَوْرُعَلَیهِ اَضْیَقُ''

ہر چیز سے زیادہ عدالت میں اس قدر گنجائش ہوتی ہے کہ سب کو راضی رکھے، صرف ایک ہی چیز ایسی ہے جو ہر ایک کو اپنے اندر جمع کرسکے اور سب کو راضی رکھ سکے اور وہ ہے ''عدالت'' اگر کوئی شخص اپنے طبعی انحراف اور حرص و لالچ کی بناء پر اپنے حق اور اپنی حد پر قانع نہ ہو اور حق پر قناعت اسے سنگین محسوس ہو تو اسے یقین کرلینا چاہئے کہ ظلم اس کیلئے بہت زیادہ بھاری ثابت ہوگا، کیونکہ دو قسم کے سنگین بوجھ انسان کی روح پر دباؤ ڈالتے ہیں ایک ماحول و معاشرے کا بوجھ جو انسان کے اپنے اندر سے اس کی روح پر وارد ہوتا ہے دوسرا حسد کا بوجھ یہ ایسے جلاد ہیں جن کے تازیانے اسکی روح پر پڑتے رہتے ہیں اور یہ ایسا قیدخانہ ہیں جس میں اسے ایک دوسرے انسان نے گرفتار کیا ہوا ہوتا ہے۔

لیکن اگر عدالت اجتماعی کا اجراء ہو تو بیرونی لحاظ سے ایک طرح کا سکون برقرار رہ جائے گا، اس لئے کہ ایسی صورت میں کسی کو کسی دوسرے انسان کے حقوق سلب کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، جس سے کسی وجہ سے کسی شخص کی روح گھٹن اور تنگی کا شکار نہیں ہوگی اور نہ ہی کسی قسم کا اس پر دباؤ ہوگا جو اس پر سنگین ہو اور اگر عدالت کا اجراء نہیں ہوگا تو دھونس دھاندلی ظلم و ستم، غنڈہ گردی اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوجائے گا، جس سے لوگ حرص و طمع میں گرفتار ہوجائیں گے اور لالچ کی آگ زیادہ مشتعل ہوگی اور وہ عوامل کے زبردست دباؤ میں آکر کڑھتے رہتے ہیں، لہٰذا عدالت

کا ماحول جس پر گراں گزرتا ہے، ظلم کا ماحول تو اسے نچوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ حضرت عثمان کے قتل کے بعد لوگ مسجد میں جمع ہوئے تھے کہ دیکھیں خلافت کا معاملہ کہاں تک پہنچا ہے؟ چونکہ حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ اور کوئی ایسا شخص نہیں تھا لوگ جس کی طرف متوجہ ہوں، ادھر ساتھ ہی کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بڑی پرجوش تقریریں کر رہے تھے اور مولا علیؑ کی شان اور ان کی اسلامی خدمات لوگوں کے سامنے بیان کر رہے تھے، اچانک لوگوں کا ایک ہجوم آپ کی طرف بیعت کیلئے آگے بڑھا اور آپ کی بیعت کرنا شروع کر دی، امام نے اس وقت فرمایا: ''مجھے رہنے دو، اور کسی اور کو جا کر ڈھونڈو کیونکہ مجھے مستقبل کے حالات بہت پیچیدہ نظر آ رہے ہیں......ساتھ ہی یہ بات بھی یاد رہے کہ میں جو مناسب سمجھوں گا خود بھی اس پر عمل کروں گا اور دوسروں کو بھی اس پر عملدرآمد کراؤں گا......گویا امام نے پہلے ہی دن اتمام حجت کر دیا تھا''

سخت تنبیہ

ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ، دوسرے دن آپ باقاعدہ رسمی طور پر مسجد نبوی تشریف لے گئے اور گزشتہ دن جس بات کی طرف اشارہ فرمایا تھا آج اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

''خدا بہتر جانتا ہے کہ مجھے اس خلافت سے اس وجہ سے دلچسپی نہیں کہ ایک ریاست اور اقتدار ہے، میں نے حضور رسالتمآبؐ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میرے بعد جو شخص بھی زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے گا، بروز قیامت اسے پل صراط پر روک لیا جائے گا، خدا کے فرشتے اس کے نامہ اعمال کی جانچ

پڑتال کریں گے اگر اس نے عدالت کا اجراء کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ اسے اسی عدالت کی وجہ سے نجات عطا فرمائے گا، ورنہ پل صراط میں ایک حرکت پیدا ہوگی جس سے وہ جہنم کی گہرائی میں جا گرے گا''

اس کے بعد آپ نے اپنے دائیں اور بائیں کی طرف نگاہ فرمائی اور مسجد کے گوشہ و کنار میں بیٹھے ہوئے ہر ایک کو دیکھا اور فرمایا:

''جن لوگوں کو دنیا نے اپنے اندر غرق کیا ہوا ہے اور انہوں نے جائیدادیں، جاگیریں بنائی ہوئی ہیں، بہتی نہریں، اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور نازک اندام کنیزیں اپنے لئے تیار کی ہوئی ہیں، کل میں یہ چیزیں لے کر بیت المال میں جمع کروں گا اور ان لوگوں کو اتنا دوں گا جتنا ان کا حق بنتا ہے، ابھی سے انہیں بتائے دیتا ہوں تاکہ کل کلاں یہ نہ کہیں کہ علیؑ نے ہمیں اندھیرے میں رکھ کر ہم سے سب کچھ چھین لیا، کل اس نے کچھ کہا تھا اور آج کچھ کہہ رہا ہے، علیؑ نے برسر اقتدار آ کر آج سب کچھ چھین لیا، لہٰذا میں اسے واضح طور پر اور علی الاعلان کہہ رہا ہوں''

اس کے بعد آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ یہ بات کی، کیونکہ ان لوگوں میں سے کچھ افراد ایسے بھی تھے جو اپنے لئے خصوصی امتیاز کے قائل تھے اور ساتھ ہی ان پر کچھ الزامات بھی تھے، ان کی دلیل یہ تھی کہ ہمیں پیغمبر کی صحبت اور صحابیت کا خصوصی شرف حاصل ہے اور ہم نے اسلام کی راہ میں کس قدر مشقتیں اٹھائیں اور سختیاں جھیلی ہیں، یہ سن کر فرمایا:

''میں افراد کی صحبت و صحابیت کی فضیلت اور ان کی اسلامی

خدمات کا منکر نہیں ہوں، لیکن یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا اجرو
ثواب انہیں خدا کی بارگاہ سے ملے گا، یہ اس بات کا موجب نہیں
بن سکتیں کہ آج ہم ان کے اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان
کسی قسم کی تفریق برتیں اور ان کے درمیان کوئی فرق قائم کریں،
یہ امور کسی امتیاز کا سبب نہیں بن سکتے''

لوگ پیچھے ہٹنا شروع ہوتے ہیں

جن لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ علی علیہ السلام کے اس فیصلے کی زد میں آجائیں گے، وہ اکٹھے ہوئے اور سر جوڑ کر بیٹھ گئے، کافی دیر تک ایک دوسرے سے مشورے کرتے رہے، آخر کار اپنی طرف سے ایک شخص ـــ بنام عتبہ بن عقبہ بن ابی معیط ـــ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تا کہ وہ جا کر آپ سے مذاکرات کرے، وہ آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا:

یا اباالحسنؑ! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم سب جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، اسلامی جنگوں کی وجہ سے آپ سے قلبی طور پر راضی نہیں ہیں کیونکہ ہم سب کو معلوم ہے کہ غالباً ہم میں سے ایک نہ ایک شخص ان جنگوں میں آپ کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے، لیکن ہم نے بھی اسے نظر انداز کر دیا ہے، اب دو شرائط کے ساتھ ہم آپ کی بیعت کیلئے حاضر ہیں

ایک تو یہ کہ سابقہ دور میں جو ہو گیا سو ہو گیا آپ پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں ـــ گذشتہ راصلوات ـــ اب جو چاہے کریں ـــ دوسرے یہ کہ: حضرت عثمان کے قاتلوں کو ہمارے سپرد کر دیں تا کہ ہم ان سے قصاص لے سکیں، اگر آپ کو ہماری کوئی شرط قبول نہیں ہے تو ہم مجبور ہیں کہ شام جا کر حضرت امیر شام سے مل جائیں۔

اس کے جواب میں آپؑ نے فرمایا:

''یہ جو تم نے کہا ہے کہ اسلامی جنگوں میں تمہارے لوگوں کا خون بہایا گیا ہے، تو اسے میں نے اپنے ذاتی عناد کی وجہ سے نہیں بہایا، ان جنگوں میں عقیدہ اور مسلک کا اختلاف تھا، ہم حق کیلئے لڑ رہے تھے جبکہ تم باطل کیلئے نبرد آزما تھے، حق کو باطل پر فتح حاصل ہوئی، اگر تم اپنے مقتولوں کا خون بہا چاہتے ہو تو پھر جاؤ اور حق سے جا کر وصول کرو، کیونکہ اس نے ہی باطل کو شکست فاش دی اور اس کا قلع قمع کیا''

دوسری بات جو تم نے کہی ہے کہ میں تمہارے ماضی سے کوئی سروکار نہ رکھوں اور گذشتہ کو نظر انداز کر دوں، تو یہ میرے بس سے باہر ہے، کیونکہ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو خدا نے میرے ذمہ لگایا ہے، لہٰذا میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔

رہا قاتلین عثمان کا موضوع، اگر میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ ان سے قصاص لیا جائے، تو یقین جانو کہ میں نے کل ہی ان سے لے لیا ہے۔

ولید مولاؑ کے صریح اور قاطع بیانات سن کر لوٹ آیا اور اپنے ہم مسلک افراد کے سامنے امام کی ساری گفتگو بیان کر دی، یہ سن کر وہ سب اٹھ کر چلے گئے اور پختہ ارادہ کے ساتھ علیؑ سے دشمنی، مخالفت اور مخاصمت کا یکطرفہ اور کھلم کھلا اعلان کر دیا۔

دوستوں کی رائے

ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ: اصحاب علیؑ نے جب یہ سنا کہ مولا علی علیہ السلام کی زعامت وحکومت کے خلاف ایک گروپ تشکیل پا چکا ہے جس کا مقصد تخریب کاری اور آپ کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا اور حکومت کو گرانا ہے، تو ان میں سے کچھ لوگ آنجنابؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے:

''ان لوگوں کی ناراضگی کا اہم سبب اور گروہ بندی کا اہم موجب'' عدل و

مساوات پر آپکا اصرار ہے'' رہی قاتلین عثمان کی سپردگی تو اس پر ایک سرپوش اور بہانہ
ہے، اسطرح وہ لوگوں کو اشتعال دلانا چاہتے ہیں۔''

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مالک اشتر یہ پیشکش کرنے والوں میں شامل
تھے، یا بلکہ بذات خود آپ ہی تھے، صوت حال خواہ جو بھی ہو، اس پیشکش سے ان کا
مقصد یہ تھا کہ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی فرمائیں''

حضرت علی علیہ السلام جان گئے کہ یہی فکر عام لوگوں کے دماغ میں جاگزیں
ہوسکتی ہے، لہٰذا آپ اٹھ کر مسجد کی طرف چل دیئے اور ایک عمومی خطبہ دیا، اس وقت
آپ نے ایک کپڑا اپنے شانوں پر ڈالا ہوا تھا اور ایک چادر لنگ کی مانند کمر پر باندھی
ہوئی تھی (احرام کے لباس کی طرح) اور شمشیر حمائل کی ہوئی تھی ___ خداوند عالم کی حمد و
ستائش کے بعد اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کیا اور آخر میں فرمایا:

''خدا کے نزدیک افضل انسان وہ ہے جو بہتر انداز میں اس کی اطاعت
کرتا ہے، اس کے رسول کی بہتر طریقے سے اور بیشتر حد تک پیروی کرتا ہے، کتاب
اللہ ___ قرآن مجید ___ کا بہتر صورت میں احیاء کرتا ہے، ہم کسی کے لئے کسی کی
فضیلت نہیں مانتے مگر اس کے خدا سے تقویٰ اور اس کی اطاعت کے انداز کے مطابق
یہ قرآن ہے جو ہمارے سامنے ہے اور یہ پیغمبر اکرمؐ کی سیرت ہے جسے ہم سب
جانتے ہیں کہ عدل و مساوات کی بنیاد پر قائم تھی، یہ چیز کسی سے بھی پوشیدہ نہیں مگر اس
سے جس کی نیت خراب ہو اور دشمنی سے کام لے تو اس کی بات ہی کچھ اور ہے''

اس کے بعد آپ نے (سورہ حجرات کی آیت ۱۳) تلاوت فرمائی:

''یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُم مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ
شُعُوبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ''

لوگو! تمہیں ہم نے ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں

ٹولے اور قبیلے بنایا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، یقیناً اللہ
کے نزدیک تم میں سے زیادہ باعزت وہ ہے جو تم میں سے زیادہ
متقی ہو۔

حضور (علیہ السلام) نے یہ آیت اس لئے پڑھی تا کہ انہیں اچھی طرح سمجھا
دیں کہ میں تمہارے یہ جھوٹے امتیازات ختم کررہا ہوں۔

مقبوضہ جائیدادوں کی واپسی

(شرح ابن ابی الحدید جلد ا صفحہ ۹۰ میں ہے) علی علیہ السلام نے جس طرح
فرمایا تھا اسی طرح، تمام اموال کو ضبط کر لیا سوائے ان لوگوں کے مال کے جو موجود نہیں
تھے اور آپ کے دائرۂ اختیار سے نکل چکے تھے''

یہ جوان لوگوں نے اس بات کی پیشکش کی تھی کہ ''گذشتہ را صلوات آئندہ را
احتیاط'' اسے آپ نے: ''اِنَّ الْحَقَّ الْقَدِیْمَ لَا یُبْطِلُهُ شَیْءٌ'' (قدیمی حق کو کوئی چیز
باطل نہیں کرسکتی) کہہ کر یکسر مسترد کر دیا''

عمرو ابن عاص کا معاویہ کے نام خط

اس دوران عمرو بن عاص نے معاویہ کو یہ خط لکھا:

''مَا كُنْتَ صَانِعًا فَاصْنَعْ قَبْلَ اَنْ قَشَرَكَ ابْنُ اَبِی
طَالِبٍ مِنْ كُلِّ مَالٍ تَمْلِكُهُ كَمَا تُقْشَرُ عَنِ الْعَصَا لَحَاهَا

''جو جتن کر سکتے ہو کر لو، کیونکہ اب تک تم نے جو کچھ جمع کیا ہوا
ہے اور تمہارے پاس ہے وہ فرزند ابو طالب نے تم سے سب کچھ
لے لینا ہے اور تم سے اسے اس طرح جدا کر لینا ہے، جس طرح

چھڑی کے اوپر سے چھال جدا کرلی جاتی ہے۔

کس قسم کی عدالت شہادت کا موجب بنی؟

مولا علی علیہ السلام کے بارے میں جو یہ کہتے ہیں: ''قُتِلَ عَلِیٌّ فِیْ مِحْرَابِہٖ لِشِدَّۃِ عَدْلِہٖ''۔علیؑ کو محراب عبادت میں شدت عدالت کی وجہ سے شہید کیا گیا، تو اس کے وہی معنی ہیں جو ابھی عرض کئے جاچکے ہیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باقی دوسری باتیں صرف بہانہ تھیں۔ مثلاً قاتلین عثمان کو پیش کرنے کا مطالبہ یا اسلام اور جاہلیت کی جنگوں میں مشرکین کا علیؑ کے ہاتھوں مارا جانا یا اس قسم کے کئی اور حیلے بہانے !! یہ سب عدالت اجتماعی سے فرار کے بہانے تھے، خاص کر جب مولا نے واضح طور پر بتا دیا کہ میں ماضی کی ناہمواریوں، ستم کاریوں اور مظالم سے چشم پوشی کر کے گزشتہ پر صلوات اور آئندہ کے لئے احتیاط کے فلسفے کو نہیں اپناؤں گا۔ علیؑ بار بار ماضی کی طرف دیکھ رہے تھے اور فرمارہے تھے: ''اِنَّ الْحَقَّ الْقَدِیْمَ لَایُبْطِلُہٗ شَیءٌ'' قدیم حق کو کوئی بھی چیز باطل نہیں کرسکتی۔

مولا علیؑ ــــــ اور ــــــ خلافت

آخر میں ہم حضرت امیر کائنات علیہ السلام کے ذاتی کاموں کے ایک مختصر سے حصے پر روشنی ڈالیں گے کہ اس موضوع میں آپ نے اپنے اوپر کس قدر پابندیاں عائد کررکھی تھیں، تو معلوم ہونا چاہئے کہ نہ صرف حضرت علی علیہ السلام بلکہ آپ کے اعزاء واقارب اور احباء واقرباء اس بات کے ذرہ برابر بھی روادار نہیں تھے کہ خلافت کے عنوان سے کسی قسم کا ناجائز فائدہ حاصل کریں، حتیٰ کہ بعض اوقات ایسی صورتحال بھی پیش آجاتی تھی کہ کوئی کام ناجائز مفاد کے زمرے میں بھی نہیں آتا تھا بلکہ صرف

اس اولویت کا پہلو نمایاں ہوتا تھا پھر بھی اس سے اجتناب فرماتے تھے، حالانکہ فریق مقابل اس اولویت کو اعزاز سمجھتا تھا۔

سماجی یا اجتماعی، معاشرتی عہدہ اور منصب اس شخص کے نکتہ نظر سے جو واقعاً اپنے فریضے کو انجام دینا چاہتا ہے اور یہ نہیں چاہتا کہ اپنے عنوان اور عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھائے، اسے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ یہ اس کا ''حق'' ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ یہ اس کا ''شرعی فریضہ'' ہے۔ اور ''حق'' اور ''شرعی فریضہ'' کے درمیان بڑا فرق ہے۔ ''حق'' کا معنی ہے استفادہ کرنا اور بہرہ مند ہونا، جبکہ ''فریضہ'' کا معنی ہے ذمہ لگائے ہوئے کام کی بجا آوری، اگر ہم ناجائز مفاد کے حصول کو ان معاشرتی اور سماجی عہدوں سے علیحدہ کرلیں پھر دیکھیں کہ ان کے لئے یہ ''حق'' قرار دیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ حق کی بجا آوری سے ''فرض کی ادائیگی'' کا عنوان ان کے لئے صحیح ہوگا۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ فرض کی ادائیگی کے شرائط اور ہیں جبکہ حصول حق کے شرائط اور ہیں، لہٰذا آقا و مولا علی بن ابی طالب علیہ السلام کے نزدیک خلافت ایک فریضہ کی ادائیگی تھی نہ کہ حصول حق کا ایک ذریعہ، مولائے متقیان کے نزدیک خلافت و حکومت، نماز کی مانند ایک فریضہ تھی اور اگر بناء اس بات پر ہو کہ فریضہ کی بجا آوری سے غیر شرعی استفادہ کیا جائے تو پھر ہر فریضہ کو ''حق'' کا غلط نام دیا جائے گا۔ چنانچہ اگر نماز کی ادائیگی سے جو سو فی صد ایک فریضہ کی بجا آوری ہے، اس سے غلط مفادات اٹھانے شروع کردیئے جائیں اور کوئی شخص اسے آمدنی کا ایک مؤثر ذریعہ بنادے تو ایسے مفاد پرست اور مطلب کے بندے کے نزدیک نماز پڑھنا یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا بھی ایک حق بن جائے گا نا کہ ادائے فریضہ، ممکن ہے کہ اس کے نزدیک یہ ایک بہت بڑا حق ہو مگر حقیقت کچھ اور ہے۔ کیونکہ جب ہم امیر المؤمنین علی علیہ السلام کو دیکھتے ہیں کہ وہ ایک عام سی چیز کی خریداری کے لئے ایسے شخص کے پاس جاتے ہیں جو آپ کو

نہیں پہچانتا کہ مبادا عہدہ خلافت کی وجہ سے وہ سودا انہیں کم قیمت کے ساتھ بارعایت دے تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ خلافت بھی ایک فریضہ کی ادائیگی کا نام ہے حق کے حصول کا نہیں اور فریضہ بھی ایسا کہ جس سے بالاتر کوئی فریضہ نہیں، یہ ایک فریضہ ہی نہیں ریاضت بھی ہے جھلسا دینے والی گرمیوں کے دنوں میں دارالامارہ سے نکل کر سایہ میں آ بیٹھتے تھے، مبادا کوئی سائل آ جائے اور اس قیامت کی گرمی میں ان تک نہ پہنچ سکے اور اسے خالی واپس جانا پڑے اور یہی مشکل ترین فریضہ کی بجا آوری اور ریاضت ہے۔

حجاز میں اپنے گورنر ___ قثم بن عباس ___ کے نام ایک حکم نامہ میں تحریر فرماتے ہیں کو کہ نہج البلاغہ مکتوب ۲۷ میں موجود ہے:

''وَ اجْلِسْ لَهُمُ الْعَصْرَيْنِ وَ اَفْتِ الْمُسْتَفْتِيَ وَ عَلِّمِ الْجَاهِلَ وَ ذَاكِرِ الْعَالِمَ وَ لَا يَكُنْ اِلَى النَّاسِ سَفِيْرًا اِلَّا لِسَانُكَ وَ لَا حَاجِبًا اِلَّا وَجْهُكَ''۔ روزانہ صبح وشام کے اوقات میں رعیت کی خبر گیری کیلئے ایک وقت مقرر کرو اور ان کے سوالوں کے جواب براہ راست خود تم ہی دیا کرو، جاہل اور بے سمجھ لوگوں کو تم خود ہی سمجھایا کرو، علماء کے ساتھ علمی مذاکرہ جاری رکھو، اپنے اور لوگوں کے درمیان اپنا کوئی واسطہ قرار نہ دو سوائے اپنی زبان کے اور اپنے چہرے کے کسی اور کو دربان مقرر نہ کرو (براہ راست) تم خود ہی لوگوں سے ملاقات کیا کرو۔

اسی طرح ___ (نہج البلاغہ مکتوب ۱۳) ___ کے مطابق مصر میں اپنے گورنر ___ مالک اشتر ___ کو تحریر فرماتے ہیں:

''وَ اجْعَلْ لِذَوِی الْحَاجَاتِ مِنْكَ قِسْمًا تُفَرِّغُ لَهُمْ فِيْهِ شَخْصَكَ وَ

تَجْلِسُ لَهُمْ مَجْلِسًا عَامًّا فَتَتَوَاضَعُ فِيْهِ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَكَ وَ تُقْعِدُ عَنْهُمْ جُنْدَكَ وَ اَعْوَانَكَ مِنْ اَحْرَاسِكَ وَ شُرَطِكَ حَتّٰى يُكَلِّمَكَ مُتَكَلِّمُهُمْ غَيْرَ مُتَتَعْتِعٍ، فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ (ص) يَقُوْلُ فِیْ غَيْرِ مَوْطِنٍ لَنْ تُقَدَّسَ اُمَّةٌ حَتّٰى يُؤْخَذَ لِلضَّعِيْفِ فِيْهَا حَقُّهُ مِنَ الْقَوِیِّ غَيْرَ مُتَتَعْتِعٍ ....فَلَا تُطَوِّلَنَّ اِحْتِجَابَكَ عَنْ رَّعِيَّتِكَ فَاِنَّ احْتِجَابَ الْوُلَاةِ عَنِ الرَّعِيَّةِ شُعْبَةٌ مِّنَ الضِّيْقِ''

ضرورت مندوں کیلئے ایک خاص وقت مقرر کرو تم خود ہی ان کی پریشانیوں کو معلوم کرو اور اس مقصد کیلئے کھلی کچہری لگاؤ اور اس میں اپنے اس معبود کے لئے تواضع اور فروتنی کا اظہار کرو جس نے تمہیں خلق فرمایا ہے۔ اور اس موقع پر اپنی فوج اور پولیس کے سپاہیوں کو سامنے سے ہٹا دو تا کہ عوام الناس بغیر کسی خوف سے بے پرواہ ہو کر تمہارے سامنے کھل کر بات کر سکیں، کیونکہ میں نے بار بار رسولؐ گرامی کو فرماتے سنا ہے کہ کوئی قوم اور ملت اس وقت تک صاف ستھری اور پاکیزہ نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے درمیان سے کمزور لوگوں کا حق طاقتور اور زور آور لوگوں سے بغیر زبان کی لکنت کے اور کسی کی پرواہ کئے، حاصل نہ کر لیا جائے .... پھر کسی قسم کے حجاب اور پردوں سے منع کرتے ہوئے فرمایا: ''اپنی رعیت سے خود کو زیادہ نہ چھپا کر رکھا کرو، کیونکہ حکمرانوں کا اپنی رعیت سے زیادہ مخفی رہنا بھی بذات خود ایک طرح کی تنگی اور دباؤ ہے''۔

(از افادات استاد عالیقدر آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہریؒ)

ایمانِ مجسم کی عبادت

......نخلستانوں میں صدائے مناجات......

ناظرین! اس موضوع کے پیشِ نظر ہم ایمان مجسم کی دعا و مناجات اور عبادت کے بارے میں قدرے تفصیل سے عرض کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ خداوندِ عالم سورہ ذاریات آیت ۵۶ میں فرماتا ہے:

''وَمَا خَلَقْتُ الجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ''

اور میں نے جن وانس کو خلق ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

عبادت، معرفت کے بغیر ناممکن ہے پہلے معرفت پھر عبادت۔

جیسا کہ اسی آیت کے سلسلے میں حضرات معصومین علیہم السلام سے مروی ہے کہ

''اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ'' سے مراد ''اِلَّا لِیَعْرِفُوْنِ'' ہے، یعنی میری معرفت حاصل کریں۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ نے معرفت کے لئے پیدا کیا ہے اور وہ اس ذاتِ کامل کی معرفت کے بعد اس کی بندگی کرتے ہیں اور ایسی ہی صورت میں ''عبد'' کے لئے کمال اور ارتقاء ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں ہے، لہٰذا انسان کی خلقت کی غرض اسی صاحبِ کمال کی بندگی کرنے سے پوری ہوتی ہے، نہ کہ کسی اور کی بندگی کرنے سے۔

اللہ نے انسان کو بندگی کے لئے خلق کیا ہے، یعنی اس نے انسان کی خلقت کے اندر بندگی کا شعور ودیعت فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

''فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَاتَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذَالِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّم'' (روم/۳۰)

وہ دین قیّم جس میں انحراف نہیں عین فطرت ہے، اگر اللہ کی بندگی فطری نہ ہوتی تو اس بندگی سے انسان کو سکون حاصل نہ ہوتا، جیسے مچھلی اگر پانی میں زندہ رہنے کے لئے پیدا نہ ہوتی تو اسے پانی میں سکون نہ ملتا۔

ناظرین! آیئے دیکھتے ہیں کہ ''عبادت'' کے معنی کیا ہیں؟ تو کتبِ لغت کی طرف رجوع کرنے سے جو معنی ملتے ہیں وہ ہیں ''اللہ کو ایک جاننا، خدمت کرنا، خضوع وخشوع کرنا اور ذلیل ہونا'' جبکہ ''عبودیت اور عبدیت'' کے معنی ہیں ''آباء واجداد سے اطاعت اور غلامی میں چلے آنا''

قرآن مجید میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''عبادت'' کی کس قدر اہمیت ہے؟ چنانچہ قرآن کے مختلف مقامات پر مختلف عناوین کے ساتھ اس کا ۲۷۸ مرتبہ ذکر کیا گیا ہے اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے معرفت کے بغیر عبادت کا کوئی فائدہ نہیں اور معرفت جتنا زیادہ ہوگی عبادت اتنا کامل ہوگی، اور عبادت جس قدر کامل ہوگی اسی قدر درجہ قبول کو پہنچے گی اور جس قدر خلوص سے کی جائے گی اسی قدر اس کی قدر و منزلت زیادہ ہوگی۔

ابھی بتایا جا چکا ہے کہ عبدیت اور عبودیت کے معنی ہیں اطاعت اور غلامی میں چلے آنا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبد ہمیشہ اور ہر وقت اپنے مالک کی خدمت اور غلامی میں رہے اور اس کی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہ آنے پائے جو مالک کی نافرمانی میں گزرے اور یہی ہے عبادت کی اصل روح، اور یہ جو ہمارے ہاں مشہور ہے کہ عبادت نام ہے نماز اور روزے کا، تو یہ عبادت کی اعلیٰ اور معروف ترین اقسام میں سے ہیں ورنہ اطاعتِ مولا میں گزرنے والا ہر ہر لمحہ عبادت ہے چاہے ''عبد'' سویا ہوا ہو یا جاگ رہا ہو، چل پھر رہا ہو یا بیٹھا ہوا ہو، محراب مسجد میں ہو یا میدانِ جنگ میں

،روزے سے ہو یا کھا پی رہا ہو، کھیت میں ہل چلا رہا ہو یا دکان میں بیٹھا سودا سلف بیچ رہا ہو، قلم بدست ہو یا ہاتھوں میں بیلچہ ہو، اپنے بچوں کا پیٹ پال رہا ہو یا یتیموں کی کفالت کر رہا ہو، اپنے گھر والوں کی یاد میں ہو یا غریب الوطن اور ابنائے سبیل کی امداد کی فکر میں، یہ سب کچھ عبادت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات معصومین علیہم السلام نے عبادت کے اصل مفہوم کو سمجھا اور اس پر عمل پیرا ہوئے اور اس قدر عمل کیا کہ خدا کو خود کہنا پڑا (سورہ طٰہٰ آیت نمبر۱) ''طٰہٰ، مَا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْآنَ لِتَشْقٰی'' اے طیب وطاہر رسولؐ! آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ اس قدر مشقت اٹھائیں۔

(سورہ مزمل آیت ۱ تا ۴)

''یٰا اَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلاً، نِصْفَهٗ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلاً اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیْلاً''

اے کپڑوں میں لپٹنے والے! رات کو اٹھا کیجئے مگر کم، آدھی رات یا اس سے بھی کم کر لیجئے، یا اس سے کچھ بڑھا دیجئے اور قرآن کو ترتیل کے ساتھ پڑھا کیجئے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ خلوص نیت اور آقا سے قلبی لگاؤ کی وجہ سے انجام پانے والا ہر عمل ایسی عبادت میں شمار ہو رہا ہے کہ آقا کو اس سے کم کرنے کی تاکید کرنا پڑ رہی ہے، یہی کیفیت ہمارے دوسرے ائمہ اطہار علیہم السلام کی ہے، حتیٰ کہ کثرتِ عبادت کی وجہ تو ان میں سے ایک کا نام سید الساجدین اور زین العابدین مشہور ہو گیا ہے یعنی سجدہ کرنے والوں کے سردار اور عبادت کرنے والوں کی زینت اور یہ ہمارے چوتھے امام اور چھٹے معصوم حضرت علی بن الحسین علیہما السلام ہیں اور بروز قیامت بھی آپ کو اسی نام سے پکارا جائے گا۔

چنانچہ آپ کی عبادت کائنات میں شہرہ آفاق تھی، آپ کی ایک کیفیت یہ تھی کہ وضو شروع کرتے تھے تو چہرہ کا رنگ بدل جاتا تھا، کہ رب العالمین کی بارگاہ میں حاضری دینا ہے۔

نماز میں بسا اوقات جسم بید کی مانند لرز جاتا تھا کہ مالکِ یوم الدین کی بارگاہ میں کھڑے ہیں مدینہ منورہ میں آپ کا ایک باغ تھا جس میں خرما کے پانچ سو درخت تھے، جب باغ میں داخل ہوتے تھے تو ہر درخت کے نیچے دو رکعت نماز ادا کرتے تھے۔

بعض اوقات نماز میں سورۃ الحمد کی تلاوت کرتے ہوئے ''مٰالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' کی تکرار فرمایا کرتے تھے اور لرزتے رہتے تھے کہ میں اس کی بارگاہ میں کھڑا ہوں جو روزِ قیامت کا مالک ہے جس کا سارا ملک اس کے قبضہ قدرت میں ہے اور کسی کا کوئی اختیار نہیں اور مال واولاد میں سے کوئی کام آنے والا نہیں ہے۔

یہ تھا حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی عبادت کا ایک مختصر سا جائزہ جسے تفصیل سے بیان کیا جائے تو اس کے لئے ایک عرصہ درکار ہے، لیکن یہی امام زین العابدین اور سید الساجدین ہیں کہ جب انہیں ان کے فرزند ارجمند حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے عبادت قدرے کم کرنے کا مشورہ دیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

''ذرا وہ صحیفہ تو لے آؤ جس میں جد امجد حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی عبادتوں کا تذکرہ ہے!''

جب وہ صحیفہ لایا گیا تو آپ نے اسے کھولا اور رو دیئے فرمایا:

''مَن یَّبْلُغُ ذَالِکَ؟'' اس منزل عبادت کو کون پا سکتا ہے؟

یہ کیوں نہ ہو؟ اگر امام علی ابن الحسینؑ کو آپ کی عبادت نے ''زین العابدین'' بنایا ہے تو امیر المومنین علی علیہ السلام کی فقط ایک ضربت ثقلین کی عبادت سے

بھاری ہے جس کے متعلق سرکارِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

''ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْن''

خندق کے دن علیؑ کی ایک ضربت ثقلین کی عبادت سے افضل ہے۔

جبکہ بعض روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ حضور سرورِ کائنات نے فرمایا:

''......اَفْضَلُ مِنْ اَعْمَالِ اُمَّتِیْ اِلٰی يَوْمِ الْقِيَامَةِ ''میری امت کے قیامت کے دن تک کے اعمال سے افضل ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ آقا ومولا کی رضا وخوشنودی میں خلوصِ دل سے انجام پانے والا ہر عمل عبادت ہے اور خلوص جتنا زیادہ ہوگا عمل کی اہمیت اتنی بڑھ جائے گی اور وہ ثقلین کی عبادت پر بھی فضیلت حاصل کرلے گی۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا زہد وتقویٰ، دنیا سے بے رغبتی اور اسے طلاق دینے کی روایات تو اظہر من الشّمس اور متواتراتِ قطعیہ کا درجہ رکھتی ہیں، اور اس بارے میں خود آپ علی الاعلان ارشاد فرماتے نظر آتے ہیں کہ:

''وَاللّٰهِ لَدُنْيَاكُمْ هٰذِهِ اَهْوَنُ فِیْ عَيْنِیْ مِنْ عِرَاقِ خِنْزِيْرٍ فِیْ يَدِ مَجْذُوْمٍ''

خدا کی قسم تمہاری یہ دنیا میری آنکھوں میں خنزیر کی اس چچوڑی ہوئی ہڈی سے بھی زیادہ حقیر ہے جو کسی جذامی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

جبکہ نہج البلاغہ کے خطبہ ۲۲۲ میں فرماتے ہیں:

''وَاِنَّ دُنْيَاكُمْ عِنْدِیْ لَاَهْوَنُ مِنْ وَّرَقَةٍ فِیْ جَرَادَةٍ تَقْضِمُهَا، مَا لِعَلِيٍّ وَلِنَعِيْمٍ يَّفْنٰى وَلَذَّةٍ لَّا يَبْقٰى''

تمہاری یہ دنیا تو میرے نزدیک اس پتی سے بھی زیادہ بے قدر اور حقیر ہے جو کسی ٹڈی کے منہ میں ہو اور وہ اسے چبا رہی ہو، علیؑ کو فنا ہونے والی نعمتوں اور مٹ جانے والی لذتوں سے کیا غرض؟

جن کے بارے میں حضرت عمر بن عبد العزیز کہتے ہیں کہ: ''ہمیں اس امت میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو علی بن ابی طالب علیہ السلام سے بڑھ کر عابد وزاہد ہو''

اس سے ہمارے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ علی بن ابی طالب علیہ السلام کو دنیا اور اس کی رونقوں اور لذتوں سے کوئی غرض نہیں تھی، لہٰذا دنیا میں جو کام بھی ہوتا تھا محض رضائے الٰہی کی خاطر ہوتا تھا اور آپ جو کام بھی کرتے محض ثواب ومرضات خداوندی کے لئے ہوتا، یہی وجہ ہے کہ آپ کی عبادت خلوص پر مبنی ہوتی اور اگر آپ کو میدانِ جنگ میں تیر لگ جاتا تو وہ تیر اس وقت نکالا جاتا جب آپ نماز کی حالت میں ہوتے اور اس وقت آپ کو پتہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ تیر نکالا جارہا ہے، اس لئے کہ نماز میں فنا فی اللہ ہو کر جمالِ حق کے منشاء ہونے میں مستغرق اور ما سوی اللہ سے بالکل بے خبر ہوتے تھے۔

بقول مفسرین سورہ فتح کی آیت ۲۹، آپ ہی کی شان میں نازل ہوئی ہے:

''......تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ......''

تو ان کو دیکھے گا کہ (اللہ کے سامنے) جھکے سربسجود ہیں، خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے خواستگار ہیں، کثرتِ سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشانات پڑے ہوئے ہیں۔

کتاب مناقب ابن شہرآشوب میں، کتاب روضۃ الواعظین سے نیشاپوری

کی روایت کے مطابق کہ عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں اتری:

’’......اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَآءَ اللَّيْلِ سَاجِداً وَّقَائِماً يَّحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّه ......‘‘(زمر/۹)

کیا جو شخص رات کے اوقات میں سجدہ کر کے اور کھڑے ہو کر خدا کی عبادت کرتا ہو اور آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہو......(ناشکرے کافر کے برابر ہو سکتا ہے؟)

ایک شخص کہتا ہے کہ میں حضرت علیؑ کی خدمت میں مغرب کے وقت حاضر ہوا تو آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، اسی طرح آپ نماز اور تلاوتِ قرآن میں طلوعِ فجر تک مشغول رہے، پھر از سرِ نو وضو کیا اور مسجد میں تشریف لے آئے اور نمازِ صبح کی امامت فرمائی پھر نماز کی تعقیبات میں مشغول ہو گئے، اور یہ سلسلہ طلوعِ آفتاب تک جاری رہا، اس کے بعد آپ کے پاس لوگ اپنے مقدمات کا فیصلہ جات لے کر آئے، اور یہ سلسلہ قریب ظہر تک جاری رہا، پھر آپ نے نمازِ ظہر کیلئے تجدیدِ وضو کیا، اور نماز ظہر کی امامت فرمائی، پھر نمازِ عصر تک تعقیباتِ ظہر میں مشغول رہے، پھر عصر کی نماز پڑھائی اور مسندِ قضا پر بیٹھ گئے اور نمازِ مغرب تک لوگوں کے مقدمات کا تصفیہ فرماتے رہے یہ گویا آپ کے روزانہ کا معمول تھا۔

اسی کتاب میں حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ: قرآن مجید میں جہاں پر بھی ’’...... الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ ......‘‘ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے......آیا ہے وہیں پر اس سے مراد حضرت علیؑ اور اس کے شیعہ ہیں (اور انہی کے لئے بے پایان اجر ہے)

اسی کتاب ہی میں ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید

کی سورۃ فاطر کی آیت ۳۲ میں ہے کہ ’’وَ مِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ‘‘ یعنی ان میں سے کچھ لوگ خدا کے اختیار سے نیکیوں میں اوروں سے گوئے سبقت لے گئے ہیں‘‘

کا مصداق بخدا علی بن ابی طالبؑ ہیں۔

چنانچہ اسی بارے میں شاعر کہتا ہے: جس کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے کہ:

میدانِ جنگ میں دشمن کے گروہوں کو منتشر کرنے والا اور گردنوں کے مارنے والا بت شکن اور مشکل کشا__ علیؑ__ ہے، وہ محرابِ عبادت میں عابد و زاہد، رکوع اور سجود کو رات کی تاریکیوں میں بجالاتا ہے، دوپہر کی شخصیت گرمیوں میں روزے سے ہوتا ہے اور اگر روزے کی افطاری کے وقت دروازے پر سائل آجاتا ہے تو کھانا اسے دے کر خود بھوکا سو جاتا ہے۔

اسی کتاب ہی میں عروہ بن زبیر سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ہمارے درمیان میں نیک اعمال کی گفتگو چل نکلی تو ابو درداء کہنے لگے:

’’سب سے بڑے عبادت گزار علی بن ابی طالبؑ ہیں‘‘

پھر وہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ: ’’میں نے انہیں ایک خلوت کے مکان میں دردناک آواز دل سوز انداز میں ان الفاظ کے ساتھ اپنے خالق و مالک سے مناجات کرتے سنا:

میرے معبود! کتنے عذاب ایسے ہیں جو تو نے مجھ سے برطرف کئے ہیں، بلکہ ان کے بدلے میں تو نے اپنے کرم سے مجھ سے دور کئے ہیں‘‘

بارالٰہا! اگر میری عمر تیری نافرمانی میں گزری ہے اور میرے نامہ اعمال میں گناہوں کا اضافہ ہوا ہے پھر بھی میں تیری مغفرت کا امیدوار ہوں اور تیری رضامندی کے سوا کسی اور چیز سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے نہیں ہوں۔

اس کے بعد آپ نے نماز کی کئی رکعتیں ادا کیں، پھر دعا اور گریہ و بکاء میں لگ گئے اور اپنے رب سے مناجات کرنے لگے۔

''اِلٰهِیْ اُفَكِّرُ فِیْ عَفْوِكَ فَتَهُوْنَ عَلٰی خَطِیْئَتِیْ ثُمَّ اَذْكُرُ الْعَظِیْمَ مِنْ اَخْذِكَ فَتَعْظَمَ عَلٰی بَلِیَّتِیْ''

''بارالٰہا! جب میں تیری بخشش کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے میرے گناہ حقیر نظر آتے ہیں، اور پھر جب میں تیری گرفت کو نظر میں لاتا ہوں تو میری مصیبت مجھے عظیم نظر آتی ہے''

آہ! آہ!! میں نے اپنے نامہ اعمال میں برائیوں کو پڑھا ہی نہیں اور اگر پڑھا بھی تو اسے بھلا دیا، لیکن تو نے انہیں قلمبند کر دیا اور انہیں نہیں بھلایا، جس کے نتیجے میں تو کہے گا کہ ''اسے پکڑو!'' ہائے اس وقت مجھ گرفتارِ بلا کا کیا حال ہوگا؟ جسے نہ تو اپنا قبیلہ چھڑا پائے گا اور نہ ہی قوم کے افراد کسی کام آسکیں گے۔

آہ! وہ آگ جو دل گردے جلا ڈالے گی!! آہ وہ آگ جس کے جلا دینے والے شعلے بھڑ کتے ہوں گے!

آہ! وہ آگ کی سختیاں جس کے اونچے اور بھڑ کنے والے شعلے اپنی لپیٹ میں لے لیں گے!!

اس کے بعد آپؑ نے زور زور سے رونا شروع کر دیا کہ آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، پھر یکدم خاموش ہو گئے، میں سمجھا کہ نیند غالب آ گئی ہے، لہٰذا نمازِ صبح کے لئے آپ کو بیدار کروں، جب نزدیک سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ گویا ایک خشک لکڑی زمین پر پڑی ہوئی ہے، جب میں نے ہلایا تو آپ کو بے حس و حرکت پایا، میں نے کہا: ''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' خدا کی قسم علیؑ اس دنیا سے کوچ فرما گئے ہیں، پھر میں جلدی سے آپ کے گھر کے دروازے پر آیا اور گھر میں پیغام دیا کہ علیؑ اس دنیا سے

کوچ فرما گئے ہیں، جناب فاطمہ زہراؑ نے پوچھا ''تم نے انہیں کس حالت میں دیکھا ہے؟'' میں نے تمام ماجرا بیان کیا تو انہوں نے فرمایا: ''خدا کی قسم! یہ علیؑ کے معمول کی حالت ہے جو ہر روز ان پر طاری ہوتی ہے اور غش کئے ہوئے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے''

پھر پانی لایا گیا جس سے علیؑ کے رخِ انور پر چھینٹے مارے گئے، جس سے آپ کو غشی سے افاقہ ہوا، انہوں نے مجھے روتے ہوئے دیکھ کر مجھ سے فرمایا: کیوں ہو؟''

میں نے وجہ بتائی، جس پر آپ نے فرمایا:

''ابو درداء! اُس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی جب دیکھو گے کہ مجھے حساب و کتاب کیلئے بلایا جا رہا ہے اور تمام مجرمین کو عذاب ملنے کا یقین ہو چکا ہو اور مجھے تندخو اور درشت فرشتے اپنے گھیرے میں لئے ہوں اور میں جبار بادشاہ کے حضور کھڑا ہوں اور میرے قریبی دوست مجھے چھوڑ چکے ہوں، اور اہلِ دنیا میری حالت دیکھ کر میرے حال پر رحم کھا رہے ہوں اور میں اس ذات کے سامنے کھڑا ہوں کہ جس سے کوئی بات بھی مخفی نہیں ہوتی''

یہی بات ابن فہد حلی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب ''عدۃ الداعی'' ص ۱۴۹ میں اور علامہ ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ کی جلد ۱۸ حکمت ۷۵ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ہم یہاں پر اپنے ناظرین کیلئے اس امر کی وضاحت کرتے چلیں کہ حضرت علیؑ ہوں یا جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یا ہمارے دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام، کبھی کسی نے گناہ کا ارتکاب تو بجائے خود اس کا سوچا تک نہیں، مگر سورہ مومنون کی ۵۶ ویں آیتِ مجیدہ نے اس بارے میں ان سے گناہ اور لغزش و خطا کی ان الفاظ میں نفی کی ہے:

''وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَاآتَوا وَّ قُلُوْبُھُمْ وَجِلَةٌ اَنَّھُمْ اِلٰی رَبِّھِمْ رَاجِعُوْنَ''

وہ لوگ اطاعت کی بجا آوری میں تاحدِ امکان کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ آخر کار انہیں رب کی طرف لوٹ جانا ہے، وہ وہاں پر کیا جواب دیں گے؟، لہٰذا ان کے طیب و طاہر اور پاکیزہ ہونے کے باوجود ان کے دل عظمتِ پروردِگار کی وجہ سے دھڑکتے رہتے ہیں، اسی طرح اسی سورت کی آیت ۵۷، ۵۸ میں ہے:

''اَلَّذِیْنَ ھُم مِّنْ خَشْیَةِ رَبِّھِمْ مُّشْفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ ھُم بِآیَاتِ رَبِّھِمْ یُؤْمِنُوْنَ''

ایسے لوگ اپنے رب کے خوف کی وجہ سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں اور یہی لوگ ہی اپنے رب کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں۔

سورہ انفال کی آیت نمبر۲ میں ارشاد ہوتا ہے

''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہِ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُم''

مومن تو صرف وہی ہوتے ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ جاتے ہیں............

اسی لئے جناب سیدہ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا نے ابو درداء کے جواب میں فرمایا: ''اَبُو دَرْدَاء ! اَلْغَشْیَةُ الَّتِی تَأْخُذُہُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰہِ ''ان پر خوفِ خدا کی وجہ سے غشی طاری ہے

(الکنیٰ والالقاب ج ا ص ۶۵) اور جیسا کہ ہم اپنی سابقہ گفتگو میں عبادت کے معنی کے ذیل میں بتا چکے ہیں کہ ''عبادت'' خداوند عالم کی عظمت کے پیشِ نظر اس کے لئے اپنی طرف سے فروتنی، ذلت اور عاجزی کا اظہار کرنا اور عبادت اپنے صحیح معنوں میں خضوع اور خشوع کے ساتھ ہی بجالائی جاسکتی ہے اور سرکار رسالت مآب

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''بہترین انسان وہ ہے جو عبادت کا دلدادہ اور اس پر فریفتہ ہو اسے دل وجان سے دوست رکھتا ہو اور خود کو اس کے اختیار میں دیدے اور اسے اس بات کی پرواہ نہ ہو کہ اس کی زندگی خوشی کے ساتھ گزر رہی ہے یا غموں میں گھری ہوئی ہے''

جبکہ خود امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: خالص عبادت یہ ہے کہ انسان خداوند کے علاوہ کسی سے امیدیں وابستہ نہ کرے اور سوائے ذاتِ خدا کے کسی سے نہ ڈرے، اسی طرح عبادت کے سلسلے میں مولا علی علیہ السلام ہی فرماتے ہیں کہ:

'' کچھ لوگ خدا کی اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ آخرت کے فوائد اور جنت کی لذتوں سے بہرہ مند ہوں تو یہ تاجروں والی عبادت ہوتی ہے، کچھ لوگ جہنم کی آگ سے بچنے کے لئے اس کی عبادت کرتے ہیں، تو یہ غلاموں والی عبادت ہے جبکہ کچھ لوگ خدا کی نعمتوں کے شکر اور اسے لائق عبادت جان کر اس کی عبادت کرتے ہیں، تو یہ آزادمنش لوگوں کی عبادت ہے اور یہی عبادت قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہے خداوندِ عالم بھی ایسی ہی عبادت کی قدر دانی کرتا ہے اور فرماتا ہے: ''اِنَّ ھٰذَا کَانَ لَکُمْ جَزَآءً وَکَانَ سَعْیُکُمْ مَّشْکُوْرًا ''یقیناً یہ تمہارے لئے جزا ہے اور تمہاری محنت قابلِ قدر ہے'' (دہر/۲۲) اور یہ قدر دانی اس بنا پر ہے کہ ''یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّہُ مُسْتَطِیْرًا ''اور وہ اپنی نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوگی (دہر/۷) اور وہ ''یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا '' اور وہ اپنی خواہش کے باوجود، خدا کی محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں: ''اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ لَانُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ''ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا کے لئے کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ تو معاوضہ چاہتے ہیں اور نہ ہی شکر گزاری (دہر ۸،۹)

مذکورہ آیات سورہ دہر سے تعلق رکھتی ہیں جو اہلِ بیتؑ کی شان میں اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے ایثار و قربانی کی لازوال مثال قائم کرتے ہوئے مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلایا اور خود پانی سے روزہ افطار کیا، یقیناً اس عبادت میں علی علیہ السلام سرِ فہرست ہیں۔

ناظرین محترم جانتے ہیں کہ جس طرح نماز عبادت ہے، اسی طرح روزہ بھی عبادت ہے اور زکواۃ بھی عبادت ہے، نماز اور روزہ تو بیک وقت جمع ہو سکتے ہیں لیکن نماز اور زکوۃ بیک وقت صرف علی علیہ السلام ہی کی عبادت میں جمع ہیں، جیسا کہ خداوندِ عالم سورہ مائدہ کی آیت ۵۵ میں ارشاد فرماتا ہے:

''اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَالَّذِيْنَ آمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ''

تمہارا ولی صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ اہلِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مولا علی علیہ السلام نے مسجدِ نبوی میں سائل کو حالتِ رکوع میں انگشتری عطا فرمائی تھی اور مفسر تفسیر الکوثر نے اس کے راوی یہ ائمہ اور اصحاب بتائے ہیں: حضرت علی علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام، امام محمد باقر علیہ السلام، امام جعفر صادق علیہ السلام، ابن عباس، عمار یاسر، عبداللہ بن سلام، سلمہ بن کہیل، انس بن مالک، ابوذر غفاری اور جابر بن عبداللہ انصاری وغیرہم۔

قاضی یحییٰ نے المواقف ص ۴۰۵ میں شریف جرجانی نے شرح مواقف جلد ۵ ص ۱۷ میں علاءالدین قوشجی نے شرح تجرید میں کہا ہے کہ: اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں اتری ہے اور عصرِ نزول قرآن کے شاعر دربار رسالت حضرت حسان بن ثابت نے اپنے اشعار میں امیر المومنین علیہ

السلام کی ذات کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

فَأَنْتَ الَّذِیْ اَعْطَیْتَ اِذْ کُنْتَ رَاکِعًا
زَکٰوۃً فَدَتْکَ النَّفْسُ یَا خَیْرَ رَاکِعٖ
فَأَنْزَلَ فِیْکَ اللّٰهُ خَیْرَ وِلَایَةٍ
وَبَیَّنَهَا فِیْ مُحْکَمَاتِ الشَّرَائِعِ

یا علیؑ! آپؑ ہی نے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کی ہے، اے بہترین رکوع کرنے والے! ہماری جانیں آپ پر قربان جائیں۔

اسی بنا پر اللہ نے آپ کے بارے بہترین ولایت کو نازل فرمایا ہے اور اسے اپنی محکم آیات میں واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔

چنانچہ علی بن ابی طالب علیہ السلام نے زندگی کے ہر مرحلہ پر ایسی عبادت کی کہ خداوند عالم نے اس کی قدر دانی کی حتیٰ کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بقول ''آپؑ کے چہرے کی طرف دیکھنا عبادت ہے'' ''اَلنَّظْرُ اِلٰی وَجْهِ عَلِيٍّ عِبَادَة'' اگر کسی کو آپ کے چہرے کی زیارت کا شرف حاصل نہ ہو سکے اس کے لئے آپ کا ذکر عبادت قرار دیا گیا کہ: ''ذِکْرُ عَلِيٍّ عِبَادَة'' اگر کوئی ایسا سخت موقع آجائے جہاں آپ کے ذکر پر پابندی ہو تو وہاں آپ کی محبت عبادت ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''حُبُّ عَلِيٍّ عِبَادَة''

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ آپ نے عبادت کا حق ادا کرنے کے باوجود اپنے مالک ومعبود کی بارگاہ میں اظہارِ عجز کرتے ہوئے عرض کیا: ''مَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ'' یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی ہم تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر پائے اس مقام پر ہم دربارِ شام میں پیش آنے والے ایک اہم واقعہ کا ذکر کرتے ہیں:

ضرار بن ضمرہ ضبابی جو امیر المومنینؑ کے خواص میں سے تھے ایک مرتبہ مولا علیؑ کی شہادت کے بعد شام گئے اور امیر شام نے انہیں اپنے دربار میں بلایا اور ان سے کہا:

''علیؑ کے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ!'' ضرار نے کہا:

''اس بارے میں مجھے معاف کر دیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا'' اس نے کہا:

معافی قطعاً نہیں مل سکتی، ضرور بتاؤ!! تو ضرار نے کہا:

اگر تم مُصِر ہو تو سنو!!

''کَانَ وَاللّٰہِ بَعِیْدَ الْمُدیٰ، شَدِیْدَ الْقُویٰ ، یَقُوْلُ فَصْلاً وَّیَحْکُمُ عَدْلاً یَّتَفَجَّرُ الْعِلْمُ مِنْ جَوَانِبِہٖ وَیَنْطِقُ الْحِکْمَۃَ مِن نَّوَاحِیْہِ، یَسْتَوْحِشُ مِنَ الدُّنْیَا وَزَھْرَتِھَا، وَیَسْتَأْنِسُ بِاللَّیْلِ وَوَحْشَتِہٖ، وَکَانَ وَاللّٰہِ غَرِیْزَ الْعَبْرَۃِ، طَوِیْلَ الْفِکْرَۃِ، یُقَلِّبُ کَفَّیْہِ وَیُخَاطِبُ نَفْسَہٗ وَیُنَاجِیْ رَبَّہٗ''

خدا کی قسم! علیؑ یقین کامل کے مالک تھے، ہر لحاظ سے قوی، حق بات کہتے تھے، عدل پر مبنی فیصلے کیا کرتے تھے، آپ کے وجود سے علم کے سوتے پھوٹتے تھے تمام وجود سے حکمت کے موتی جھڑتے تھے، دنیا اور اس کی زرق برق سے وحشت کرتے تھے اور رات کی تاریکی اور اس کی وحشت سے مانوس تھے، خوفِ خدا میں ان کی آنکھوں سے مسلسل اشک رواں تھے، طویل فکر کے مالک تھے، ہاتھوں کو مل کر اپنے آپ کو ملامت کرتے تھے اور اپنے رب سے مناجات کرتے تھے، موٹا کپڑا پہنتے تھے اور روکھی

سوکھی روٹی پر گزارہ کیا کرتے تھے، خدا کی قسم وہ ہمارے درمیان خود ہم جیسے تھے، جب ہم ان کے پاس جاتے تو وہ ہمیں اپنے نزدیک بٹھاتے، جب ان سے سوال کرتے تو اس کا جواب عنایت فرماتے، باوجودیکہ محفل میں ہمیں ان کا قرب حاصل ہوتا اور ہم ان کے ہم نشین ہوتے مگر ان کا رعب اور ہیبت اس قدر تھی کہ ہمیں بات کرنے کی جرأت نہیں ہو پاتی تھی، ان کی عظمت اس قدر تھی کہ ہم ان کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے تھے، جب وہ مسکراتے تو معلوم ہوتا کہ ان کے لبوں کے ساتھ موتی جڑے ہوئے ہیں، متدین افراد کی عزت کرتے تھے اور فقراء و مساکین کے ساتھ محبت کیا کرتے تھے، نہ تو کوئی طاقتور انسان اپنے باطل دعویٰ میں ان سے اپنے حق میں فیصلے کی توقع رکھ سکتا تھا اور نہ ہی کوئی کمزور شخص ان کے عدل سے ناامید ہوتا تھا۔

''اُشْھِدُ بِاللّٰہِ لَقَدْ رَأَیْتُہٗ فِیْ بَعْضِ مَوَاقِفِہٖ وَقَدْ اَرْخیٰ اللَّیْلُ سُدُوْلَہٗ وَغَارَتْ نُجُوْمُہٗ وَھُوَ قَآئِمٌ فِیْ مِحْرَابِہٖ قَابِضٌ عَلیٰ لِحْیَتِہٖ یتَمَلْمَلُ تَمَلْمُلُ السَّلِیْمِ وَیَبْکِیْ بُکَآءَ الْحَزِیْنِ فکانی اَسْمَعُہٗ وَھُوَ یَقُوْلُ''

میں اس امر کی شہادت دیتا ہوں کہ میں نے بعض موقعوں پر آپ کو دیکھا جبکہ رات اپنے دامن ظلمت کو پھیلا چکی تھی تو آپ محراب عبادت میں ایستادہ ریش مبارک کو ہاتھوں میں پکڑے ہوئے مار گزیدہ کی طرح رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے: ''یَا دُنْیَا، یَا دُنْیَا اِلَیْکِ عَنِّیْ!! اَبِیْ تَعَرَّضْتِ اَمْ اِلَیَّ

تَشَوَّقْتِ؟ لَاحَانَ حِیْنُکِ، غُرِّیْ غَیْرِیْ لَاحَاجَةَ لِیْ
فِیْکِ قَدْ طَلَّقْتُکِ ثَلَاثًا لَّا رَجْعَةَ فِیْهَا، فَعَیْشُکِ
قَصِیْر، وَخَطَرُکِ یَسِیْر، وَمُلْکُکِ حَقِیْر، آہِ مِّنْ قِلَّةِ
الزَّادِ وَطُوْلِ الطَّرِیْقِ وَبُعْدِ السَّفَرِ وَعَظِیْمِ الْمَورِد!! ''

اے دنیا! اے دنیا!! دور ہو مجھ سے کیا میرے سامنے اپنے کو لاتی ہے؟ یا میری دلدادہ فریفتہ بن کر آئی ہے؟ تیرا وہ وقت نہ آئے (کہ تو مجھے فریب دے سکے) بھلا یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ جا کسی اور کو دھوکہ دے، مجھے تیری خواہش نہیں ہے، میں تو تجھے تین بار طلاق دے چکا ہوں کہ جس کے بعد رجوع کی گنجائش نہیں، تیری زندگی تھوڑی، تیری اہمیت بہت کم اور تیری آرزو ذلیل وپست ہے۔

افسوس زادِراہ تھوڑا، راستہ طویل، سفر دور دراز اور منزل سخت ہے۔

چنانچہ جب امیر شام نے ضرار کی زبانی یہ واقعہ سنا تو اس کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں اور کہنے لگا: ''رَحِمَ اللّٰهُ اَبَاالْحَسَن کَانَ وَاللّٰهِ کَذَالِکَ ''یعنی خدا ابوالحسن پر رحم کرے وہ واقعاً ایسے ہی تھے'' پھر ضرار سے مخاطب ہوکر کہا:

''تمہاری علیؑ کے ساتھ کس حد تک محبت تھی؟'' کہا:

''جس طرح مادرِ موسیٰؑ کی موسیٰؑ کے ساتھ'' اس نے پوچھا:

''تمہیں علیؑ کی موت کا کتنا غم ہے؟'' ضرار نے کہا:

بس یہ سمجھ لو کہ میرا غم اتنا ہی ہے جتنا اس ماں کا ہوتا ہے کہ جس کی گود میں اس کا اکلوتا بچہ ذبح کر دیا جائے!!!

یہ کہا اور دربار سے آنسو بہاتا اٹھ کر باہر آ گیا۔

علیؑ مولا مقام عبادت میں اس حد تک بلند و بالا ہیں کہ اپنے معبود سے مخاطب ہوکر عرض کرتے ہیں:

''مَاعَبَدتُّکَ طَمَعًا لِّلْجَنَّةِ وَلَا خَوفًا لِّلنَّارِ، بَلْ
وَجَدتُّکَ اَهْلاً لِّذَالِکَ فَعَبَدتُّکَ''

میں تیری عبادت اس لئے نہیں کرتا کہ تیری جنت کی لالچ ہے اور نہ اس لئے کہ تیری جہنم کا خوف ہے بلکہ تجھے لائقِ عبادت سمجھ کر تیری عبادت کرتا ہوں۔

بہر حال علی بن ابی طالب علیہ السلام نے عبادت کا وہ حق ادا کیا کہ حالتِ نماز میں شرفِ شہادت حاصل ہوا اور بوقتِ آخر ارشاد فرمایا:

''فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَة'' رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔

صعصہ بن صوحان کا مولاؑ کی بارگاہ میں خراج عقیدت

صعصہ بن صوحان عبدی حضرت امیر علیہ السلام کے خواص میں سے تھے، ان کے دوسرے بھائی ''زید بن صوحان عبدی' جنگ جمل میں مولا علیؑ کے لشکر میں تھے اور وہیں پر جام شہادت نوش فرمایا، ان کے ایک اور بھائی مولاؑ کے حبدار اور دوستوں میں سے تھے، صعصہ نے تین جملے آپ کی شان میں ایسے کہے ہیں جو تاریخ کے اوراق میں آج تک ثبت ہیں'

پہلا جملہ:

جس دن حضرت امیر علیہ السلام تخت خلافت پر تشریف لے گئے تو انہوں نے عرض کیا:

''یـااَمِیرَ الْمُؤْمِنِیْنَ زَیَّنْتَ الْخِلَافَةَ وَمَازَانَتْکَ، رَفَعْتَهَا
وَمَا رَفَعَتْکَ وَهِیَ اِلَیْکَ اَحْوَجُ مِنْکَ اِلَیْهَا''

علی آقاؑ! آپ نے خلافت کو زینت عطا فرمائی ہے، خلافت نے
آپ کو نہیں، آپ نے خلافت کا مقام بلند فرمایا ہے خلافت نے
آپکو نہیں، خلافت کو آپ کی ضرورت ہے آپکو خلافت کی نہیں۔

یقیناً ہے بھی ایسا کیونکہ علیؑ کا مقام اس سے کہیں زیادہ بلند ہے کہ تخت خلافت آپ کو رفعت و سربلندی عطا فرمائے، آپ کی عظمت کیلئے تو آپ کا یہ قول کافی ہے کہ جیسا کہ کتاب ریاض السالکین جلد ا ص ۱۰۹ میں ہے:

''عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَلْفَ بَاب مِّنَ الْعِلْمِ فَانْفَتَحَ لِی
مِن کُلِّ بَابٍ اَلْفُ بَابٍ''

رسول گرامی نے مجھے علم کے ایک ہزار باب تعلیم کئے اور میرے
لئے ہر باب سے ہزار باب کھلتے ہیں۔

دوسرا جملہ:

کتاب اعیان الشیعہ جلد ۷ ص ۳۸۸ میں ہے کہ: ۲۰/ ماہ رمضان کی عصر کو صعصعہ بن صوحان حضرت امیر علیہ السلام کی زیارت کیلئے آئے لیکن چونکہ آپ کے اطراف کو آپ کے گھر والوں نے گھیرا ہوا تھا لہٰذا شرف باریابی سے محروم ہو گئے لیکن انہوں نے کسی آدمی ___ تاریخ میں اس شخص کا نام نہیں بتایا گیا ___ کے ذریعہ جو اندرون خانہ آجا رہا تھا، پیغام بھجوایا: عرض کیا:

''رَحِمَکَ اللّٰهُ یَا اَبَا الْحَسَنِ! لَقَدْ کَانَ فِی صَدْرِکَ
عَظِیْمًا وَّلَقَدْ کُنْتَ بِکَلِمَاتِ اللّٰهِ عَلِیْماً '' یا ابوالحسن! خدا

کی رحمت آپ پر ہو، یقیناً آپ کے دل میں خدا کی بڑی عظمت
تھی اور غیر اللہ کو کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے، کلام خدا کے بہت
بڑے عالم تھے۔

اس شخص نے یہ پیغام آنجناب کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا صعصعہ دروازے پر کھڑے ہیں، چونکہ اسے ملاقات کی اجازت نہیں ملی، لہٰذا اس نے پیغام بھجوایا ہے، تو آقا نے فرمایا:

''رَحِمَکَ اللّٰهُ لَقَدْ کُنْتَ خَفِیْفَ الْمَؤُنَةِ
وَکَثِیْرَ الْمَعُوْنَةِ''

اے صعصعہ! خدا کی رحمت تم پر بھی ہو، تم میرے لئے ایسے تھے
جس کی زحمات بہت کم اور تگ و دو بہت زیادہ تھی۔

قابل توجہ

یہ بات نہایت ہی قابل توجہ ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام صعصعہ کو پیغام بھیج رہے ہیں کہ تم میرے کم خرچ اور مفید ترین دوست تھے اور ہمیں معلوم نہیں کہ امیرالمومنین کے اس طرح کے کتنے دوست تھے؟ البتہ خود آنجنابؑ نے جنگ صفین میں ''عمرو بن حمق خزاعی'' سے فرمایا: ''اے کاش میرے پاس ایسے سو آدمی ہوتے''

تیسرا جملہ:

(سفینۃ البحار مادہ ''صعصعہ'' میں ہے کہ:) ۲۱/ ماہ رمضان کی رات کو مولا علیؑ کا پاکیزہ جسد تاریکی شب میں نہایت مظلومانہ حالت میں سپرد خاک کیا گیا اور صعصعہ بن صوحان ان لوگوں میں شامل تھے جو حضرت کے جنازہ کی تشییع کررہے تھے،

انہوں نے مولا کی قبر پر کھڑے ہو کر ایک ہاتھ دل پر اور ایک ہاتھ مولا کی قبر پر رکھا اور کہا:

''هَنِيئاً لَّکَ يَا اَبَالْحَسَنِ! فَلَقَدْ طَابَ مَوْلِدُکَ وَقَوِیَ صَبْرُکَ وَعَظُمَ جِهَادُکَ ......ثُمَّ بَكٰى بُكَآءً شَدِيْدًا وَاَبْكٰى كُلَّ مَن كَانَ مَعَهٗ ......''

مولا! آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ اس دنیا سے چلے گئے ہیں، لیکن بدقسمت ہیں وہ لوگ جنہوں نے آپ کو نہیں پہچانا! اگر لوگ آپ کو پہچان لیتے تو زمین وآسمان سے خدا کی برکتیں ان پر نازل ہوتیں......

ان جملات کے ساتھ وہ خود بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور دوسروں کو بھی رلا دیا۔

(کشف الغمہ جلد ۱ ص ۵۳۲ کے مطابق:) ۲۱/ ماہ رمضان صبح کے وقت حضرت امام حسن علیہ السلام نے مسجد کوفہ میں ایک خطبہ دیا اور اپنے والد امیر المومنین علیہ السلام کی بارگاہ میں بہترین الفاظ کے ساتھ خراج عقیدت پیش کیا، آپ کے خطاب کا ایک جملہ یہ ہے:

''لَمْ يَسْبِقْهُ الْاَوَّلُوْنَ وَلَمْ يُدْرِكْهُ الْاٰخِرُوْنَ''

نہ تو گذشتہ دور کے لوگوں نے آپ جیسی شخصیت دیکھی اور نہ ہی آنیوالی دنیا آپ جیسا کسی کو دیکھ سکے گی۔

افراد کی معاشرتی پہچان

معاشرہ کی افراد کے متعلق پہچان مختلف ہوتی ہے، بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جس کے اخلاق، عادات اور خصائل لوگوں کیلئے اس قدر واضح ہوتے ہیں کہ ان

کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی__ ان کے بارے میں__ معاشرے کے افراد کی معلومات میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوتا، جبکہ کچھ افراد ایسے بھی ہیں کہ معاشرہ کیلئے جن کی اہمیت ان کے اس دنیا سے رحلت کر جانے کے بعد آہستہ آہستہ روشن ہوتی جاتی ہے اور دنیا کو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہ کیسی شخصیت کھو چکے ہیں؟ اور ایسی ہی صورتحال میں اس شخصیت کے بارے میں مختلف افراد کی مختلف تعبیریں ہوتی ہیں، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ جب تک وہ زندہ تھا ہم نے اسے نہیں پہچانا، اسکے علم ودانش اور گفتار وگفتگو سے ہم نے کوئی استفادہ نہیں کیا، لیکن یہ مقدار معلومات پھر مختلف ہوتی ہے کہ جانے والے شخص کی شخصیت اور خصوصیات کیا ہیں؟

دنیا نے علیؑ کو نہیں پہچانا

امیر المومنین علی علیہ السلام ایسی شخصیت ہیں جو تادم زیست غیر شناختہ رہے، یعنی آخری وقت تک دنیا آپ کو نہیں پہچان سکی، صرف یہ کہ عام لوگوں نے نہیں پہچانا بلکہ دوستوں کی ایک نہایت قلیل تعداد جو انگشت پر شمار ہو سکتی ہے کے سوا کسی کو آپ کی صحیح معنوں میں معرفت حاصل نہیں ہوئی۔

جب انسان امیر المومنین علیہ السلام کی تاریخ اور سیرت کا مطالعہ کرتا ہے اور دیکھتا ہے تو بعض مستشرقین جیسے لوگوں کو کہنا پڑتا ہے کہ: ''علیؑ اپنے زمانہ کیلئے بہت زیادہ تھے''، یعنی علیؑ کا زمانہ ان کا متحمل نہیں ہو سکا، یقیناً جس شخصیت کا علم اس شان کا ہو کہ ''يَنْحَدِرُ عَنْهُ السَّيْلُ'' سیلاب کی مانند رواں ہو، لوگ اسکا کیونکر ادراک کر سکتے ہیں؟

سلونی کا دعویٰ

(شرح بن ابی الحدید جلد۱۰ص۱۴ میں ہے) امیرالمومنین علی علیہ السلام نے مسجد کوفہ کے منبر پر بیٹھ کر فرمایا: ''جو کچھ تم نہیں جانتے وہ مجھ سے پوچھو، قبل اس کے تم مجھے نہ پاؤ'' تو اس موقع پر ''سعد بن ابی وقاص'' یا بقول ابن ابی الحدید ''تمیم بن اسامہ'' کھڑا ہو گیا اور پوچھا: ''یا علیؑ! مجھے بتایئے کہ میرے سر کے بال کتنے ہیں؟''

یہاں پر کوئی اس سے پوچھے کہ تجھے سر کے بالوں کی تعداد معلوم کر کے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟____

امام علیہ السلام نے فرمایا: ''میں تو ان کی تعداد کو جانتا ہوں، مگر تم انہیں شمار نہیں کر سکو گے'' ____ یعنی دلیل کا قائم کرنا مشکل ہو جائے گا____

البتہ تمہیں یہ باور کرانے کیلئے کہ ہم جانتے ہیں، ایک بات تم سے کہتا ہوں: ''اِنَّ فِیْ بَیْتِکَ سخلاًیَّقْتُلُ ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰہِ (ص) وَیَحُضُّ عَلٰی قَتْلِہٖ'' یقین جانو کہ تمہارے گھر میں ایک چھوٹا بچہ ہے جو فرزند رسولؐ ____ حسین بن علی علیہما السلام ____ کا قاتل ہوگا۔

یاد رہے کہ یہ ''سعد بن ابی وقاص'' اسی مشہور عمر بن سعد کا والد ہے جس نے کربلا میں نواسہ رسول کو شہید کیا تھا، وہی ''تمیم بن اسامہ'' جو کہ ''حصین بن تمیم'' کا باپ تھا جو کہ کربلا میں ''عبید اللہ بن زیاد'' کے لشکر کا سردار تھا، جس وقت حضرت علی علیہ السلام نے یہ پیش گوئی فرمائی تھی اس وقت وہ حصین اپنی ماں کا دودھ پیتا تھا____

(کتاب حدیقۃ الشیعہ جلد۱ص۲۵۱ میں ہے کہ) ایک دانشمند کا کہنا ہے کہ: ''اے کاش اس وقت میں موجود ہوتا اور میرا شعور اس بات کا تقاضا کرتا کہ میں آپ جناب سے ایسے سوالات کرتا جو آج کل کے دور میں عالم انسانیت کو درپیش ہیں اور وہ

ان کا حل بتاتے، کیونکہ امام بزرگوار کا فرمان ہے کہ: ''سَلُوْنِیْ عَنْ طُرُقِ السَّمَآءِ فَاِنِّیْ اَعْرَفُ بِھَامِنْ طُرُقِ الْاَرْضِ'' مجھ سے آسمانی راستوں کا پوچھو کیونکہ میں انہیں زمین کے راستوں سے زیادہ جانتا ہوں''

(شرح نہج البلاغہ فیض الاسلام خطبہ۱۷۳ص۵۶۵،۵۶۴ کے مطابق:)

حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:

''وَاللّٰہِ لَوْشِئْتُ اَنْ اُخْبِرَ کُلَّ رَجُلٍ مِّنْکُمْ بِمَخْرَجِہٖ وَمَوْلِجِہٖ وَ جَمِیْعِ شَأْنِہٖ لَفَعَلْتُ وَلٰکِن اَخَافُ اَنْ تَکْفُرُوابِیْ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ (صلی الہ علیہ والہ وسلم) وَاِنِّی مُفِیضُھَالِیَ الْخَاصَّۃُ مِمَّنْ یُّؤْمِنُ ذَالِکَ مِنْہُ''

خدا کی قسم! اگر میں چاہوں تو تم میں سے ہر شخص کے بارے میں خبر دوں کہ وہ کہاں سے آیا اور کہاں جائے گا اور اس کے سارے حالات تم سے بیان کر دوں، تو ایسا کر سکتا ہوں، لیکن مجھے اس بات کا خوف ہے کہ تم میرے بارے میں رسول اللہ (ص) کا انکار کرنے لگ جاؤ گے ____ یعنی مجھے ان سے بالاتر سمجھنے لگ جاؤ گے، حالانکہ یہ ساری باتیں میں نے آنحضرتؐ ہی سے حاصل کی ہیں____

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض مورخین نے لکھا ہے جیسا کہ کتاب الغدیر جلد۶ص۱۹۶ میں ہے کہ:

''بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ آپ کا دعوائے سلونی کوئی اہم بات نہیں ہے، کیونکہ علیؑ کے علاوہ بھی کئی لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے اور امیر المومنین کے ساتھ یہ خاص نہیں ہے، چنانچہ ایک شخص

نے کوفہ میں دعویٰ کیا کہ ''سَلُوْنِی عَمَّا شِئْتُم'' مجھ سے جو چاہو پوچھو، تو اس شخص سے کسی نے پوچھ لیا: ''جس چیونٹی نے حضرت سلیمانؑ سے گفتگو کی تھی وہ نر تھی یا مادہ؟'' لیکن وہ لاجواب ہو گیا''

ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ حضرت امیر علیہ السلام کو صرف ان چند اور بہت ہی کم افراد نے پہچانا تھا، مثلاً حُجر بن عدی، عمرو بن حمق خزاعی، میثم تمار اور رُشید ہجری وغیرہ تھے، امیر علیہ السلام نے علم المنایا اور علم البلایا رُشید ہجری کو تعلیم فرمایا تھا، چنانچہ جب ملعون زیاد بن ابیہ نے انہیں گرفتار کرنے کے بعد پوچھا کہ تم کون ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا ''علی بن ابی طالبؑ کے دوستوں میں سے ہوں'' زیاد نے حکم دیا کہ ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے جائیں اور ایسا ہی کیا گیا، ساتھ ہی الٹا پھانسی پر لٹکا دیا، ان کی بیٹی ''قنوہ'' نے جب دیکھا کہ ان کے والد کو ہاتھ پاؤں کاٹنے کے بعد پھانسی پر الٹا لٹکایا ہوا ہے وہ لوگوں سے کہہ رہے ہیں:

''لوگو! اکٹھے ہو جاؤ تاکہ میں تم سے علی بن ابی طالبؑ کے فضائل بیان کروں''

تو اس نے پوچھا: ''بابا جان! اس وقت آپ درد بھی محسوس کر رہے ہیں؟''
جواب دیا: ''جی ہاں! صرف اس قدر جتنا کوئی شخص انبوہ کثیر میں پھنس جاتا ہے تو تھوڑا سا دباؤ محسوس کرتا ہے'' ایسے لوگوں نے ہی حضرت علیؑ کو پہچانا تھا اور ان کی تعداد بہت ہی مختصر تھی، ہماری ان معروضات کا شاہد خود جناب امیرؑ کا اپنا کلام ہے۔ میری جان ان کی ایک ایک سانس پر قربان۔

شہید عدالت کی مظلومیت

شہید عدالت حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں ایک بات جو نہایت ہی اہمیت کی حامل اور دعوت فکر دیتی ہے اور بار بار تاریخ کی کتابوں میں تسلسل کے ساتھ نقل ہوتی آ رہی ہے وہ ہے ان کی ''مظلومیت''، چنانچہ اس بارے میں ہم قدرے تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

۱۔ جعفر بن عمرو بن حریث سے منقول ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ:

''اِنّ عَلِیًّا عَلَیْهِ السَّلَامِ لَمْ یَقُمْ مَرَّةً عَلَی الْمِنبرِ اِلَّا وَقَالَ فِیْ کَلَامِهٖ قَبْلَ اَنْ یَنْزِلَ مَازِلْتُ مَظْلُوْمًا مُنْذُقَبَضَ اللّٰهُ نَبِیَّه'' امیر المومنین علی علیہ السلام جب بھی منبر پر تشریف لے جاتے اپنے خطاب کے آخر میں فرماتے: ''جب سے حضرت رسالتمآبؐ نے رحلت فرمائی ہے میں ہمیشہ ہی مظلوم چلا آ رہا ہوں'' (بحار الانوار جلد ۲۸ ص ۳۷۳ جلد ۴۱ ص ۵)

۲۔ (شرح ابن ابی الحدید جلد ۴ ص ۱۰۶، بحار الانوار جلد ۲۸ ص ۳۷۳ میں ہے) راوی کا بیان ہے کہ:

''بَیْنَا عَلِیٌّ یَخْطُبُ اِذْقَامَ اَعْرَابِیٌّ فَصَاحَ وَامَظْلِمَتَاهُ فَاسْتَدْنَاهُ عَلِیٌّ عَلَیْهِ السَّلَامُ فَلَمَّا دَنیٰ قَالَ لَهٗ اِنَّمَا لَکَ مَظْلِمَةٌ وَّاحِدَةٌ وانا قَدْظُلِمْتُ عَدَدَالْمَدَرِ وَالْوَبَرِ اَنَا وَ اللّٰهِ مَظْلُوْمٌ هَاتِ فَلْنَدْعُ عَلیٰ مَنْ ظَلَمَنَا''

ایک مرتبہ حضرت امیر علیہ السلام خطبہ دے رہے تھے کہ اچانک ایک شخص

کھڑا ہوگیا اور چیخ کر اپنے اوپر ظلم کی شکایت کرنے لگا اور آنجنابؑ سے انصاف کی اپیل کی، امامؑ نے اسے اپنے پاس بلایا اور فرمایا: ''تم پر تو صرف ایک ظلم ہوا ہے ذرا مجھے دیکھو کہ مجھ پر سنگریزوں کی تعداد کے برابر ظلم ہوا ہے، خدا کی قسم میں خود بھی مظلوم ہوں، آؤ مل کر اپنے اپنے ظالموں کو بددعا کریں''۔

۳۔حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نہج البلاغہ خطبہ ۹۷ میں فرماتے ہیں: ''وَلَقَدْ اَصْبَحَتِ الْاُمَمُ تَخَافُ ظُلْمَ رُعَاتِهَا وَاَصْبَحْتُ اَخَافُ ظُلْمَ رَعِيَّتِیْ''

دنیا جہان کے لوگ تو اپنے حکمرانوں کے ظلم کی شکایت کرتے چلے آرہے ہیں (اور وہ وحشت ناک زندگی گزارتے آرہے ہیں) لیکن میں اپنی رعیت کے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی شکایت کررہا ہوں۔

۴۔(احتجاج طبرسی جلد ۱ ص ۲۸۰، بحارالانوار جلد ۲۸ ص ۱۹۱ کے مطابق)

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

''خَطَبَ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ خُطْبَةً بِالْكُوْفَةِ فَلَمَّا كَانَ فِیْ اٰخِرِ كَلَامِهٖ قَالَ اِنِّیْ لَاَوْلَى النَّاسِ وَمَازِلْتُ مَظْلُوْمًا مُنْذُ قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (ص)''

حضرت امیر علیہ السلام نے کوفہ میں خطبہ ارشاد فرمایا اور اپنی گفتگو کے آخر میں فرمایا: ''حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت اور جانشینی میرا حق ہے، مگر جس دن سے رسول خدا (ص) نے رحلت فرمائی ہے میں اسی دن سے مظلوم چلا آرہا ہوں''۔

''فَقَامَ اِلَيْهِ اَشْعَثُ بْنُ قَيْسٍ فَقَالَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَنْ تَخْطُبَنَا خُطْبَةً مُنْذُ قَدِمْتَ الْعِرَاقَ اِلَّا وَقَدْ قُلْتَ وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَوْلَى النَّاسِ بِالنَّاسِ فَمَازِلْتُ مَظْلُوْمًا مُنْذُ قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (ص) وَلَمَّا وَلِیَ تَيْمٌ وَعَدِیٌّ اَلَّا ضَرَبْتَ بِسَيْفِكَ دُوْنَ ظَلَامَتِكَ''

اسی اثنا میں اشعث بن قیس کھڑا ہو کر کہنے لگا: یا امیرالمومنینؑ! جب سے آپ کوفہ میں آئے ہیں اسی دن سے اب تک آپ نے جو بھی خطبہ ارشاد فرمایا ہے اسی میں آپ نے یہی جملہ ضرور بیان کیا ہے، جس دن تیم اور عدی والوں نے آپ کے حقوق کو غصب کیا تھا اسی دن آپ نے تلوار کے ذریعہ اپنے حقوق کو کیوں نہیں واپس لیا ''یعنی اسی دن آپ نے تلوار کیوں نہیں اٹھائی؟''

''فَقَالَ لَهٗ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَؑ يَا ابْنَ الْخَمَّارَةِ قَدْ قُلْتَ قَوْلًا فَاسْمَعْ مِنِّیْ وَمَا مَنَعَنِیْ الْجُبْنُ وَلَا كَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ وَمَا مَنَعَنِیْ اِلَّا عَهْدُ اَخِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ (ص) خَبَّرَنِیْ وَقَالَ لِیْ ''يَا اَبَا الْحَسَنِ! اِنَّ الْاُمَّةَ سَتَغْدِرُ بِكَ وَ تَنْقُضُ فِيْكَ عَهْدِیْ وَاِنَّكَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى وَاِنَّ الْاُمَّةَ مِنْ بَعْدِیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ وَمَنِ اتَّبَعَهٗ وَالسَّامِرِیُّ وَمَنِ اتَّبَعَهٗ''

امیرالمومنین نے اشعث کے جواب میں فرمایا: ''میں نے جو خاموشی اختیار کر لی تھی نہ تو کسی قسم کی بزدلی کی وجہ سے تھی اور نہ ہی موت کا کوئی ڈر تھا، بلکہ میرے پیش نظر میرے بھائی حضور سرور کائنات (ص) کا وہ عہد تھا جس میں حضورؐ نے مجھے خبر دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اے ابوالحسنؑ! میری امت تمہارے ساتھ بے وفائی کرے گی اور مکر وفریب سے کام لے گی اور تمہارے ساتھ ہونے والے میرے عہد کو توڑ ڈالے گی، تمہیں میرے ساتھ وہی نسبت حاصل ہے جو حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ سے تھی اور میرے بعد یہ امت دو گروہوں میں بٹ جائے گی ایک گروہ ہارون اور اس

کے تابع اور دوسرا سامری اوراس کے تابع امر لوگوں کی مانند ہو جائے گی‘‘

’’فَقُلْتُ یَارَسُوْلُ اللّٰہِ فَمَاتَعْھُدَاِلَیَّ اِذَاکَانَ کَذَالِکَ؟ فَقَالَ (ص)اِنْ وَجَدْتَّ اَعْوَانًافَبَادِرْاِلَیْھِمْ وَجَاھِدْھُمْ وَاِنْ لَّمْ تَجِدْاَعْوَانًا کُفَّ یَدَکَ وَاحْقِنْ دَمَکَ حَتّٰی تَلْحَقَ بِی مَظْلُوْمًا‘‘

میں نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کی کہ ایسے حالات میں آپ مجھے کیا حکم دینا پسند فرمائیں گے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا:’’اگر تمہیں یارومددگار مل جائیں تو ان سے جہاد کریں لیکن اگر یارومددگار نہ ملیں تو پھر اپنے ہاتھ کو کھینچ لینا اور اپنی جان کی حفاظت کرنا، یہاں تک کہ اپنی مظلومیت کی حالت میں میرے ساتھ آملیں‘‘

۵۔نہج البلاغہ خطبہ ۶ میں حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:

’’فَوَاللّٰہ مَازِلْتُ مَدْفُوْعًاحِقِّیْ ،مُسْتَاُثَرًاعَلَیَّ مُنْذُقَبَضَ اللّٰہُ نَبِیَّہٗ (ص)حَتّٰی یَوْمِ النَّاسِ ھٰذا‘‘

خدا کی قسم!حضورؐ کی وفات کے دن سے آج تک اپنے حق سے
محروم چلا آرہا ہوں اور لوگوں نے مجھ پر دوسرے افراد کو ترجیح دی
اور انہیں آگے بڑھادیا۔

اس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت امیر علیہ السلام نے ہر مناسب موقع پر اپنی مظلومیت کو بیان فرمایا،حضور امیر علیہ السلام کی مظلومیت کا یہ عالم دیکھ کر حضرت ابوذر غفاریؓ آنجناب کو’’ شیخ مظلوم ‘‘مظلوم بزرگوار کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ملاحظہ فرمایئے:

’’جَآءَ رَجُلٌ اِلیٰ اَبِیْ ذَرٍّ(رض)وَھُوَجَالِسٌ فِی الْمَسْجِدِوَعَلِیٌّ یُصَلِّیْ اَمَامَہٗ،فَقَالَ یَااَبَاذَرٍّ!اَلَاتُحَدِّثُنِیْ بَاَحَبِّ النَّاسِ اِلَیْکَ؟فَوَاللّٰہِ لَقَدْعَلِمْتُ اَنَّ اَحَبَّھُمْ اِلَیْکَ اَحَبَّھُمْ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

وَاٰلِہٖ‘‘

حضرت ابوذر غفاریؓ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت امیر علیہ السلام اس وقت سامنے نماز پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں جناب ابوذرؓ کے پاس ایک شخص آیا اوراس نے پوچھا کہ آپ کو سب لوگوں سے زیادہ محبوب کون شخص ہے؟ کیونکہ خدا کی قسم جو شخص آپ کو زیادہ محبوب ہوگا وہی رسول خدا(ص) کو زیادہ محبوب ہوگا:’’قَالَ اَجَلْ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنَّ اَحَبَّھُمْ اِلَیَّ اَحَبَّھُمْ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ وَھٰذَاھُوَ’’الشَّیْخُ الْمَظْلُوْمُ الْمُضْطَھَدُحَقَّہٗ‘‘

ابوذر نے جواب میں کہا:’’خدا کی قسم!میرے نزدیک بھی وہی شخص محبوب ترین ہے جو حضرت رسول خدا(ص) کے نزدیک محبوب ترین ہے اور وہ یہ’’مظلوم بزرگوار‘‘ہے جس کا حق غصب کیا گیا‘‘(بحارالانوار جلد۲۸ص۳۷۴)

ملاحظہ فرمایا آپ نے!جناب ابوذرؓ جیسے علیؑ کے وفادار دوست بھی آپ کا تعارف مظلوم بزرگوار کے عنوان سے کراتے تھے،اسی طرح حضرت امام علی نقی علیہ السلام مولا امیر علیہ السلام کی زیارت میں فرماتے ہیں:

’’اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَاوَلِیَّ اللّٰہِ اَنْتَ اَوَّلُ مَظْلُوْمٍ وَّاَوَّلُ مَنْ غُصِبَ حَقُّہٗ‘‘

اے اللہ کے ولی!آپ پر سلام ہو،آپ ہی سب سے پہلے مظلوم ہیں اور آپ ہی کا حق سب سے پہلے غصب کیا گیا۔

(کافی جلد۴ص۵۶۹،التہذیب جلد۶ص۲۸،الفقیہ جلد۲ص۵۸۶)

مظلومیت کے مختلف پہلو

1 ......علی علیہ السلام کی تنہائی

مولاعلی علیہ السلام کی مظلومیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ امت محمدیہؐ نے پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد آپکو تنہا چھوڑ دیا، چنانچہ ہم روایات میں پڑھتے ہیں (جیسا کہ روضۃ المتقین جلد۴ص ۲۱۸ ، بحار الانوار جلد۴۳ص۴ ۲۷ میں ہے کہ): ''اِرْتَدَّالنَّاسُ بَعْدَرَسُوْلِ اللّٰہِ اِلَّاثَلٰثَۃٌ'' رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد تمام لوگوں میں سے صرف تین افراد ایسے تھے جنہوں نے علیؑ کی امامت کی حمایت کی۔

بعثت کے تیسرے سال جب آیت انذار ___ ''وَاَنْذِرْعَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ'' ___ (سورۃ الشعراء آیت ۲۱۴) نازل ہوئی اس وقت سے لیکر اپنی مبارک عمر کے آخری لمحات تک یعنی مسلسل تئیس (۲۳) سال تک آپؐ مختلف مواقع اور مختلف مناسبتوں کے لحاظ سے علی بن ابی طالب علیہ السلام کا مختلف انداز میں تعارف کراتے رہے، لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ السلام کی رحلت کے فوراً بعد علیؑ کو دنیا نے اس حد تک اکیلا چھوڑ دیا کہ تین ___ یا باختلاف روایت بارہ ___ لوگوں کے سوا کسی نے بھی ان کا ساتھ نہ دیا اور یہی چیز زیادہ قابل غور ہے کہ اس دوران میں آپ کے ساتھ کیا گزری ہوگی؟ تاریخ بتاتی ہے کہ

''خَرَجَ عَلِیٌّ یَّحْمِلُ فَاطِمَۃَ بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰہِ (ص) عَلٰی دَآبَّۃٍ لَّیْلاً یَّدُوْرُفِیْ مَجَالِسِ الْاَنْصَارِ تَسْاَلُھُمُ النُّصْرَۃَ'' امیرالمومنینؑ رات کے وقت حضرت فاطمہ زہراؑ کو سواری پر بٹھا کر انصار کے گھروں میں لے جاتے تھے اور

ان لوگوں سے نصرت طلبی کرتے تھے۔

کوئی صاحب انصاف ان مصائب وحوادث کا انکار نہیں کرے گا کہ حضرت رسالتمآب (ص) کی فات کے بعد سوائے حضرت فاطمۃ الزہراؑ کے کوئی بھی علیؑ کی حمایت کرنے والا نہیں تھا، حضرت زہرا کو علی علیہ السلام انصار مدینہ کے گھر گھر لے گئے تھے اور انہوں نے آپ کیلئے ان لوگوں سے مدد طلب کی تھی۔

یعنی علی علیہ السلام کی اسلام کیلئے خدمات اور رسول گرامیؐ کی حضرت علی علیہ السلام کیلئے اس قدر تعریف وتمجید اور تعارف، غرض سب کچھ، لوگوں کو ایک مختصر ترین عرصے میں بھول گیا اور وہ یہ بات بھی بھول گئے کہ اسلام کا عظیم الشان رسول چھ مہینے تک علیؑ وزہراؑ کے دروازے پر آ کر آیہ تطہیر ___ ''انما یرید اللہ......'' سورہ احزاب/۳۳ ___ کی تلاوت کیا کرتے تھے اور آج یہ کیفیت ہے کہ علیؑ کا حامی و مددگار صرف اور صرف ایک خاتون ___ یعنی فاطمۃ الزہراؑ ___ ہے، حضرت زہراؑ جناب امیرؑ کے ہمراہ ہر ایک کے گھر گئیں تا کہ وہ علیؑ کا ساتھ دیں، مگر جواب یہ ملتا تھا:

''فَکَانُوْا یَقُوْلُوْنَ یَابِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰہِ قَدْمَضَتْ بَیْعَتُنَالِھٰذَاالرَّجُلِ''

اے دختر رسولخداؐ! اب تو ہم اس شخص کی بیعت کر چکے ہیں۔

تاریخ نے اس بات کو بھی اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہوا ہے جو کہ بحار الانوار جلد۲۸ص ۲۵۵ شرح بن ابی الحدید جلد۱۱ص ۱۴میں موجود ہے) کہ:

''اَخْرَجُوْا عَلِیًّا (ع) فَمَضَوْابِہٖ اِلٰی اَبِیْ بَکْرٍفَقَالُوْالَہٗ بَایِعْ !فَقَالَ اِنْ اَنَالَمْ اَفْعَلْ فَمَہْ؟قَالُوْااِذاًوَّاللّٰہِ الَّذِیْ لَآاِلٰہَ اِلَّاھُوَنَضْرِبُ عُنُقَکَ'' علی امیرالمومنینؑ ! کو گھر سے نکال کر حضرت ابوبکر کے دربار میں لے گئے اور آپ سے کہا کہ:

''بیعت کرو!'' حضرت نے پوچھا: ''اگر میں بیعت نہ کروں تو
پھر کیا ہوگا؟'' انہوں نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ ہم آپ کو
قتل کردیں گے، حضرت نے فرمایا: ''اِذًا تَقْتُلُوْنَ عَبْدَاللّٰهِ
وَاَخَا رَسُوْلِهٖ فَقَالُوْا اَمَّا عَبْدُاللّٰهِ فَنَعَمْ وَاَمَّا اَخَا رَسُوْلِهٖ
فَلَا'' تو اس وقت تم اللہ کے بندے اور رسولؐ کے بھائی کو قتل
کرو گے، انہوں نے جواب دیا: جہاں تک ''اللہ کے بندے''
کی بات ہے، تو یہ ٹھیک ہے اور جہاں تک ''رسول خدا کے بھائی
' کی بات ہے تو اسے ہم نہیں مانتے۔

گویا وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہم خدا کے بندے کو تو قتل کریں گے لیکن برادر رسول خدا کو قتل نہیں کریں گے، حالانکہ علی علیہ السلام آیۂ مباہلہ ___ فقل تعالوا ندع ابناء نا...... ___ (آل عمران ۶۱) کی رو سے نفس رسول ہیں اور تمام کمالات میں آنحضرتؐ کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں، لیکن آج مظلومیت کا یہ عالم ہے کہ حضور سرور کائنات کی رحلت کو کم وبیش ستّر دن ہی گزرے ہیں حامی و مددگار صرف ایک خاتون جنت!! ہی ہے، بحارالانوار جلد ۲۸ ص ۲۷۰ میں روایت ہے کہ:

''حَالَتْ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَهُ فَاطِمَةُ (علیها السلام) عِنْدَ بَابِ
الْبَيْتِ فَضَرَبَهَا قُنْفُذُ الْمَلْعُوْنُ بِالسَّوْطِ فَمَاتَتْ حِيْنَ
مَاتَتْ وَاِنَّ فِيْ عَضُدِهَا مِثْلَ الدُّمْلُجِ''

جب لوگ علی علیہ السلام کو گرفتار کرنے کیلئے آئے تو فاطمہ
زہرا(ع) ان لوگوں کے درمیان حائل ہوگئیں، تو سیدہ کے بازو
پر ملعون قنفذ ___ حضرت عمر کے غلام ___ نے کوڑے برسانا
شروع کردئے جس کے آثار مرتے دم تک آپؑ کے بازو پر

باقی تھے اور زخم پھوڑے کی صورت اختیار کرگیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ

''اَغْرَمَ عُمَرُ فِيْ بَعْضِ السِّنِيْنَ جَمِيْعَ عُمَّالِهٖ اِنْصَافَ
اَمْوَالِهِمْ وَلَمْ يُغْرِمْ قُنْفُذًا وَقَدْ كَانَ مِنْ عُمَّالِهٖ ، وَقَالَ
الْعَبَّاسُ لِعَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَا تَرٰى مَنَعَهٗ مِنْ اَنْ يُّغْرِمَ
قُنْفُذًا كَمَا اَغْرَمَ جَمِيْعَ عُمَّالِهٖ؟''

حضرت عمر نے اپنی حکومت کے دوران ایک سال کسی کی شکایت
کی بنا پر اپنے تمام گورنروں کو حکم دیا کہ اپنے ذاتی اثاثوں کا
نصف حصہ بیت المال میں جمع کرائیں ___ گویا ان کے ذاتی
اثاثوں کو بحق سرکار ضبط کرنے کا حکم دیا ___ لیکن اس حکم سے
قنفذ کو مستثنیٰ قرار دیا، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عباسؓ نے علی علیہ
السلام سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟

اب ذرا زمانے کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ

(کتاب سلیم بن قیس ہلالی ص ۶۷۳ کے مطابق) ''فَنَظَرَ عَلِيٌّؑ مَّنْ حَوْلَهٗ'' مولا علی علیہ السلام نے اپنے چاروں طرف دیکھا ___ کہیں کوئی سن تو نہیں رہا مبادا وہ اس بات کی چغلی دربار میں جا کر کھائے اور علیؑ کو پھر ظلم کا نشانہ بننا پڑے ___

''ثُمَّ اغْرَوْرَقَتْ عَيْنَاهُ بِالدُّمُوْعِ قَالَ شُكْرًا لَّهٗ ضَرْبَةً
ضَرَبَهَا فَاطِمَةَ بِالسَّوْطِ فَمَاتَتْ وَفِيْ عَضُدِهَا اَثَرُهٗ كَاَنَّهَا الدُّمْلُجُ''

پھر آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا: قنفذ کو مستثنیٰ قرار دینے کی وجہ اسے اس بات کا انعام دینا تھا جو اس نے فاطمہ زہرا(ع) کو کوڑے مارے تھے۔

پس بنا بریں علیؑ کو جن تلخ اور نا گوار واقعات کا سامنا کرنا پڑا اور خون دل پینے کے سوا جس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا اور ان تمام مشکلات و مصائب کے مراحل طے کرنے کے بعد اگر وہ یہ کہے کہ: ’’سب سے زیادہ مجھ پر ظلم ہوئے ہیں‘‘ بے جا نہیں ہوگا، اندازہ لگایئے کہ امیرالمومنین علیہ السلام کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا کہ اپنے اوپر ہونے والے مصائب کا ذکر بھی آزادی کے ساتھ نہیں کر سکتے اس سے بڑھ کر اور کیا مظلومیت ہوگی؟؟؟؟؟

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ: ’’علی کائنات کا سب سے بڑا مظلوم ہے‘‘ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کا ظلم اس کیفیت کے ساتھ ظلم کسی پر نہیں ہوا، وہ ذات جسے ’’نفس رسولؐ‘‘ ہونے کا شرف حاصل ہو اس طرح تنہا رہ جائے کہ صرف ایک مظلوم اور بے بس خاتون کے سوا اس کا کوئی یار و مددگار نہ ہو اور پھر وہ پورے پچیس سال کے عرصہ تک خانہ نشین ہو کر رہ جائے ــــ یعنی پچیس سال کے عرصے تک اس پر ظلم ہوتا رہے اور وہ خاموش رہے۔

② ......دنیا نے علیؑ کو نہیں پہچانا

(فصول المہمہ میں ہے) جو لوگ کہتے ہیں کہ ’’پچیس برس گزرنے کے بعد ایک وقت ایسا آ گیا کہ لوگ اس بات کی طرف متوجہ ہوگئے کہ اب تک ہم نے غلطی کی ہے، علیؑ پر ظلم کرتے رہے، اب وہ اس نقصان کی تلافی کرنا چاہتے ہیں، اب تک انہوں نے علیؑ کو نہیں پہچانا تھا اب انہیں معرفت حاصل ہوگئی ہے‘‘

ایسی سوچ بذات خود ایک غلط سوچ ہے، اگر ہم تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ایسا نہیں ہے کہ لوگوں کو پچیس سال بعد اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو اور انہوں نے سمجھ لیا ہو کہ جس طرح حضرت رسول خدا (ص) نے آنجنابؑ کا

تعارف کرایا تھا واقعاً آپ اسی طرح تھے، قطعاً ایسی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ اوّل تو لوگوں نے دوسروں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر آپ کی بیعت کی تھی اور دوسرا جب آنجنابؑ سریر حکومت پر جلوہ افروز ہوئے پھر بھی لوگوں کو آپ کی صحیح معرفت حاصل نہیں ہوئی بلکہ آپ کو بھی لوگ اسی طرح ’’خلیفہ‘‘ سمجھتے تھے جس طرح آپ سے پہلے لوگوں کو سمجھتے تھے ــــ!!

بالفاظ دیگر اگر آپ اس زمانے کے لوگوں سے سوال کرتے کہ ’’حضرت علی علیہ السلام نے حکومت کی صلاحیت کیونکر حاصل کر لی ہے اور تم لوگوں نے کس بنا پر ان کی بیعت کی ہے؟‘‘ تو وہ آپ کو سابقہ خلفاء سے تقابل کرتے ہوئے جواب دیتے کہ جس طرح ان سے پہلے خلفاء کی بیعت کی تھی ’’یعنی علی کو چوتھا خلیفہ سمجھ کر بیعت کی تھی نہ اس وجہ سے کہ چونکہ حضور پیغمبر خداؐ نے آپ کو بحیثیت اپنے خلیفہ اور جانشین کے متعارف کرایا اور آپ کے فضائل و مناقب بیان فرمائے اور خدا کی طرف سے منصوص خلیفے کے عنوان سے ان کی شناخت کرائی، اس کی دلیل یہ ہے کہ علی علیہ السلام جب بھی کسی جگہ پر کسی خرابی کی اصلاح کرنا چاہتے جو سابقہ دور میں رواج پا چکی تھی تو لوگوں کی آوازیں بلند ہو جاتی تھیں۔

بطور نمونہ، ماہ رمضان کے نوافل زمانہ رسالتؐ میں اور حضرت ابوبکر کی خلافت کے دوران بلکہ خود حضرت عمر کے ابتدائی دنوں تک انفرادی صورت میں پڑھے جاتے تھے، مگر بعد میں حضرت عمر نے حکم دیا کہ انہیں جماعت کے ساتھ ہی پڑھا کرو‘‘ یہ بھی فرمایا کہ یہ ’’بہترین بدعت ہے‘‘ مکتب خلفاء کی صحاح ستہ میں اس کی صراحت موجود ہے۔

اس کے بعد ان نوافل کو جماعت کے ساتھ پڑھا جانے لگا اور یہ سلسلہ حضرت عثمان کی وفات تک جاری رہا، جب حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام

کا دور خلافت آیا اور آپ نے اس ''بہترین بدعت'' کو ختم کرنا چاہا تو ''واعمراہ، واعمراہ'' کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور لوگوں نے احتجاج شروع کر دیا، چنانچہ شیخ حر عاملی کی کتاب ''وسائل الشیعہ'' میں ہے:

''خَطَبَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ علیه السلام ......اِلٰی اَنْ قَالَ قَدْعَمِلَتِ الْوُلَاةُ قَبْلِیْ اَعْمَالًا خَالَفُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ (ص) مُتَعَمِّدِیْنَ لِخِلَافَةِ قَانِتِیْنَ (نَاقِضِیْنَ) لِعَهْدِهٖ، مُغَیِّرِیْنَ لِسُنَّتِهٖ، وَلَوْحَمَلْتُ النَّاسَ عَلٰی تَرْکِهَا تَفَرَّقَ عَنِّیْ جُنْدِیْ حَتّٰی اَبْقٰی وَحْدِیْ اَوْقَلِیْلٌ مِّنْ شِیْعَتِیْ ......اِلٰی اَنْ قَالَ......وَاللّٰهِ لَقَدْ اَمَرْتُ النَّاسَ اَنْ لَا یَجْتَمِعُوْا فِی شَهْرِ رَمَضَانَ اِلَّا فِیْ فَرِیْضَةٍ وَّاَعْلَمْتُهُمْ اَنَّ اجْتِمَاعَهُمْ فِی النَّوَافِلِ بِدْعَةٌ، فَتَنَادٰی بَعْضُ اَهْلِ عَسْکَرِی مِمَّنْ یُّقَاتِلُ مَعِیَ ''یَا اَهْلَ الْاِسْلَامِ غُیِّرَتْ سُنَّةُ عُمَرَ''

حضرت امیر علیہ السلام نے اپنے ایک خطبے کے دوران فرمایا:

''مجھ سے پہلے حکمرانوں نے ایسے ''کارنامے'' انجام دیئے ہیں جن میں جان بوجھ کر رسولِ خداؐ کے ساتھ مخالفت کی گئی، ان کے عہد کو توڑا گیا اور ان کی سنت میں ردو بدل کیا گیا، میں لوگوں کو زبردستی ان بدعات کے ترک کرنے پر آمادہ کرتا ہوں تو خود میرے اپنے لشکر کے لوگ ہی مجھ سے دور ہو جاتے ہیں اور میں اکیلا رہ جاتا ہوں یا کچھ شیعہ میرے ساتھ رہ جاتے ہیں......''

''......خدا کی قسم! میں نے لوگوں کو حکم دیا کہ ماہ رمضان میں صرف واجب نمازوں کو ہی جماعت کے ساتھ ادا کیا کرو اور مستحب نمازوں کی جماعت بدعت ہے

تو میرے ہمرکاب جہاد کرنے والے میرے اپنے فوجی سپاہی چیخ اٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ: ''اے مسلمانو! عمر کی سنت کو بدلا جا رہا ہے!!''

ایک اور روایت میں ہے کہ جب حضرت امیر المومنین علیہ السلام کوفہ تشریف لائے اور اپنے فرزند امام حسن علیہ السلام سے فرمایا کہ لوگوں میں اعلان کر دیں کہ مستحبی نمازوں کو جماعت کے ساتھ نہیں پڑھا جائے گا تو امام حسنؑ کے اعلان کے بعد کھلبلی مچ گئی اور وہ داد و فریاد کرنے لگے کہ ''واعمراہ، واعمراہ'' امیر المومنین علیہ السلام نے پوچھا: یہ کیسی آوازیں ہیں؟ امام حسن علیہ السلام نے لوگوں کے ردعمل سے آپ کو آگاہ کیا، امیر المومنینؑ نے فرمایا ''ہم نے حجت تمام کر دی ہے اب ان سے کہہ دو جو جی چاہے کریں''

(وسائل الشیعہ کتاب الصلوٰۃ باب عدم جواز الجماعۃ فی صلوٰۃ النوافل فی شهر رمضان ولا فی غیرہ _ غَیْرَمااستثنی حدیث ۲،۴، روضۃ الکافی جلد ۸ ص ۵۹، بحار الانوار جلد ۹۶ ص ۳۰۲، ۴۸۳ تفسیر کنز الدقائق جلد ۵ ص ۳۴۴)

حضرت امیر علیہ السلام کے تخت حکومت پر قدم رکھنے کا مقصد کیا تھا؟ یہی کہ جس طرح ہم حضرت امیر علیہ السلام کو پہچانتے ہیں اور منصوص من اللہ امام مانتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں نے بھی آپؑ کو امام جان کر آپ کی اطاعت کی تھی اور شیعہ ہو گئے تھے؟ حالانکہ لوگوں کا آپ کو ثلاثہ کے ردیف میں شمار کرنا ہی آپ پر بہت بڑا ظلم تھا، اسی ظلم کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب امیر علیہ السلام یوں دردِ دل بیان کرتے ہیں:

میں پیغمبر خداؐ کے زمانے میں ان کے جزء کی مانند تھا، جس طرح آسمان پر ستاروں کو دیکھا جاتا ہے لوگ مجھے اسی طرح دیکھا کرتے تھے، پھر زمانہ والوں نے مجھے ایسا گرایا کہ مجھے اول اور دوم کے برابر لا کھڑا کیا، اس کے بعد پانچ لوگوں

کے برابر سمجھا گیا جس کا ایک نمونہ عثمان تھے ___ آپ کا یہ اشارہ حضرت عمر کی تشکیل کردہ چھ رکنی کمیٹی کی طرف ہے ___ زمانہ (والوں) نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مجھے ہند کے بیٹے (معاویہ) اور نابغہ کے بیٹے (عمرو عاص) کے برابر لا کھڑا کیا۔

ادھر لوگوں کا علیؑ کو نہ پہچاننا اور دوسری طرف مولاؑ کی تنہائی! اس سے بڑھ کر آپ پر اور کیا ظلم ہوسکتا ہے؟ نہیں معلوم کہ ہمارے ائمہؑ میں سے کوئی ایسے امام بھی گزرے ہیں جن کے حامی و مددگار صرف تین آدمی ہوں؟ آیا امام حسین علیہ السلام بھی اسی طرح تھے؟ آیا امام حسن علیہ السلام کو بھی یہی کیفیت درپیش تھی؟ آیا انبیاء علیہم السلام بھی ایسی ہی صورتحال سے دوچار تھے؟ ذرا غور تو کیجئے کہ علیؑ کی پانچ سالہ خلافت ظاہری کے عرصہ میں آپ پر کونسا ظلم نہیں ڈھایا گیا؟ خوارج نے مولا کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ معاویہ نے علی اور شیعیان علیؑ پر کونسے ستم نہیں روا رکھے؟ ان کا مولا علیؑ کے ساتھ کیا سلوک تھا؟

③ ......عوام الناس کا علیؑ پر ظلم

منجملہ ان مظالم کے جو آپ پر ہوئے، لوگوں کی طرف سے بھی آپ پر بہت سے ظلم ہوئے چاہئے تو یہ تھا کہ لوگ آپ کو اپنا امام سمجھ کر ان کی اطاعت کرتے الٹا انہوں نے آپ پر ظلم کی کوئی حد نہیں چھوڑی جس کے مظالم کو دیکھ کر علی علیہ السلام آرزو کیا کرتے تھے کہ میں اس بات کو اچھا سمجھتا ہوں کہ معاویہ تم میں سے دس آدمی لے لے اور اپنے ساتھیوں میں سے صرف ایک آدمی مجھے دیدے!! نہج البلاغہ خطبہ ۹۷ میں فرماتے ہیں:

"اَمَاوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَیَظْهَرُنَّ هٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ عَلَیْكُمْ ، لَیْسَ لِاَنَّهُمْ اَوْلٰی بِالْحَقِّ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لِاِسْرَاعِهِمْ اِلٰی بَاطِلِ صَاحِبِهِمْ

وَاَبْطَائِكُمْ عَنْ حَقِّیْ ، وَلَقَدْاَصْبَحَتِ الْاُمَمُ تَخَافُ ظُلْمَ رُعَاتِهَاوَاَصْبَحْتُ اَخَافُ ظُلْمَ رَعِیَّتِیْ ، اِسْتَنْفَرْتُكُمْ لِلْجِهَادِفَلَمْ تَنْفِرُوْاوَلَمْ تَسْمَعُوْا" دَعَوْتُكُمْ سِرًّاوَّجَهْرًاافَلَمْ تَسْتَجِیْبُوْاوَنَصَحْتُ لَكُمْ فَلَمْ تَقْبَلُوْا، اَشُهُوْدٌكَغُیَّابٍ وَّعَبِیْدٌكَاَرْبَابٍ اَتْلُوْاعَلَیْكُمُ الْحُكَمَ فَتَنْفِرُوْنَ مِنْهَاوَاَعِظُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ الْبَالِغَةِ فَتَفَرَّقُوْنَ عَنْهَا،وَاَحُثُّكُمْ عَلٰی جِهَادِاَهْلِ الْبُغْیِ فَمَاآتِی عَلٰی اٰخِرِالْقَوْلِ حَتّٰی اَرَاكُمْ مُتَفَرِّقِیْنَ ،اَیَادِیْ سَبَاتَرْجِعُوْنَ اِلٰی مَجَالِسِكُمْ، وَتَتَخَادَعُوْنَ عَنْ مَّوَاعِظِكُمْ وَاُقَوِّمُكُمْ غُدْوَةً وَّتَرْجِعُوْنَ اِلٰی عَشِیَّةٍ كَظَهْرِالْحَنِیَّةِ عَجَزَالْمُقَوِّمَ وَاَعْضَلَ الْمُقَوَّمُ" آگاہ رہو! اس خدا کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے آخر کار یہ لوگ (معاویہ اور اس کے طرفدار) تم پر کامیاب ہو جائیں گے اس لئے نہیں کہ وہ حق کی طرف تم سے سبقت لے گئے ہیں بلکہ اس لئے کہ باطل کی جس راہ پر ان کے حکمران چل رہے ہیں وہ اس کی طرف بڑی تیزی سے چل رہے ہیں اور اس سلسلے میں وہ سخت کوشاں ہیں، جبکہ تم لوگ حق کے معاملہ میں سستی کا شکار ہو، دنیا کی قومیں اپنے حکمرانوں کے ظلم سے وحشت زدہ ہیں جبکہ میں اپنی رعیت کے ظلم سے نالاں ہوں، تمہیں دشمن کے ساتھ جہاد کیلئے آمادہ کرتا ہوں تو تم چلتے نہیں ہو، تمہارے کانوں تک آواز پہنچاتا ہوں مگر تم سننے کیلئے تیار نہیں ہو، ظاہر اور مخفی طور پر تمہیں دعوت دیتا ہوں لیکن تم اس کا جواب نہیں دیتے، تمہیں نصیحت کی لیکن تم نے اسے قبول نہ کیا، آیا تم حاضر ہونے کے باوجود غیر حاضر ہو (کہ میری باتوں کو نہیں سنتے) یا آقاؤں کی صورت میں غلام ہو؟ تمہیں خدا کے فرامین سناتا ہوں تم دوڑ لگاتے ہو...... تمہیں دلنشین وعظ کرتا ہوں لیکن تم منتشر ہو جاتے ہو، سرکش لوگوں کے ساتھ تمہیں جہاد کی ترغیب دلاتا ہوں مگر ابھی میری بات پوری نہیں ہو پاتی کہ دیکھتا ہوں کہ تم قوم سبا کی مانند تتر بتر ہو جاتے ہو، تم

لوگ نصیحت کے لبادے میں ایک دوسرے کو فریب دینے میں لگے رہتے ہو، تاکہ میرے مواعظ کے اثرات کو زائل کردو، میں تمہیں صبح کے وقت سیدھا کرتا ہوں لیکن شام کے وقت اپنی اسی کجی کی طرف لوٹ جاتے ہو، اس سخت اور مضبوط کمان کی مانند جسے نہ تو کوئی سیدھا کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور نہ ہی خود اس میں سیدھا اور صاف ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

''اَیُّهَا الشَّاهِدَةُ اَبْدَانُهُمُ الْغَآئِبَةُ عُقُوْلُهُمُ الْمُخْتَلِفَةُ اَهْوَائُهُمُ الْمُبْتَلیٰ بِهِمْ اُمَرَائُهُمْ صَاحِبُكُمْ يُطِيْعُ اللّٰهَ وَاَنْتُمْ تَعْصُوْنَهٗ وَصَاحِبُ اَهْلِ الشَّامِ يَعْصِی اللّٰهَ وَهُمْ يُطِيْعُوْنَهٗ ، لَوَدِدْتُ وَاللّٰهِ اِنَّ مُعَاوِيَةَ صَارَفَنِیْ بِكُمْ صَرْفَ الدِّيْنَارِ بِالدِّرْهَمِ ، فَاَخَذَمِنِّیْ عَشْرَةً مِّنْكُمْ وَ اَعْطَانِیْ رَجُلاً مِّنْهُمْ ، يَااَهْلَ الْكُوْفَةِ مُنِيْتُ بِكُمْ بِثَلَاثٍ وَّاثْنَيْنِ صُمٌّ ذَوُوْاَسْمَاعٍ وَّبُكْمٌ ذَوُوْ كَلَامٍ وَّعُمْیٌ ذَوُوْاَبْصَارٍ ،لَا اَحْرَارَ صِدْقٍ عِنْدَ اللِّقَاءِ وَلَا اِخْوَانَ ثِقَةٍ عِنْدَ الْبَلَآءِ تَرِبَتْ اَيْدِيْكُمْ ،يَااَشْبَاهَ الْاِبِلِ غَابَ عَنْهَا رُعَاتُهَا، كُلَّمَا جَمَعْتُ مِنْ جَانِبٍ تَفَرَّقْتُمْ مِنْ جَانِبٍ اٰخَرَ وَاللّٰهِ لَكَاَنِّیْ بِكُمْ فِيْمَآ اَخَالُ اَنْ لَّوْحَمَسَ الْوَغٰی وَحَمِیَ الضِّرَابَ قَدِانْفَرَجْتُمْ مِّنِ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ انْفِرَاجَ الْمَرْأَةِ عَنْ قُبُلِهَا''

اے وہ لوگ کہ جن کے جسم تو حاضر ہیں لیکن عقلیں غائب ہیں اور جن کی خواہشات الگ الگ ہیں اور اے وہ کہ جن کے حکمران ان کے ذریعہ آزمائے جارہے ہیں تمہارا حاکم تو خدا کی اطاعت کرتا ہے لیکن تم اس کی نافرمانی کرتے ہو، جبکہ حاکم شام خدا کی نافرمانی کرتا ہے مگر اس کی رعایا اس کی اطاعت کررہی ہے خدا کی قسم میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ معاویہ تمہارے بدلے میں مجھے اپنے افراد دے دے جیسا کہ درہم کے بدلے میں دینار کا تبادلہ کیا جاتا ہے، تم میں سے دس افراد لے

لے اور مجھے ایک آدمی دے دے، اے اہل کوفہ! میں تین چیزوں سے جو (تم میں ہیں) اور دو چیزوں سے (جو تم میں نہیں ہیں) آزمایا جارہا ہوں اور ان مصائب میں مبتلا ہوں، تمہارے کان تو ہیں مگر بہرے ہو، بولتے تو ہو لیکن گونگے ہو، آنکھیں رکھتے ہوئے مگر نابینا ہو، نہ تو ہنگامِ وغا آزاد مرد اور صادق ہو اور نہ ہی ہنگام آزمائش قابل اعتماد بھائی!! تمہارے ہاتھ خاک آلود ہوں! اے شتر بے مہار لوگو! جنہیں جب ایک طرف سے اکٹھا کیا جاتا ہے تو دوسری طرف سے منتشر ہوجاتے ہیں خدا کی قسم! میں تمہیں ایسی حالت میں دیکھ رہا ہوں کہ اگر سخت جنگ برپا ہوجائے اور اس کی آتش شعلہ ور ہوجائے تو تم ابوطالبؑ کے بیٹے کے اطراف سے ایسے تتر بتر ہوجاؤ گے جس طرح (زچگی کے وقت) عورت اپنے بچے سے جدا ہوجاتی ہے۔

۲۔کبھی فرماتے ہیں تم پر نفرین ہو، تمہیں تنبیہ کرتے کرتے تھک گیا ہوں

ملاحظہ فرمائیے نہج البلاغہ خطبہ ۳۴: ترجمہ

> تمہارا برا ہو! میں تمہیں تنبیہ کرتے کرتے تھک گیا ہوں، آیا تم نے دنیا کی پست زندگی کو آخرت کی (سعادت مندانہ اور دائمی) زندگی کے بدلے میں قبول کرلیا ہے؟ اور عزت و سربلندی کے مقابلہ میں ذلت و بدبختی کو پسند کرلیا ہے؟ میں جب بھی تمہیں تمہارے دشمن کے ساتھ جہاد کی طرف بلاتا ہوں تو خوف کی وجہ سے بے اختیار تمہاری آنکھوں کے ڈھیلے گھومنے لگ جاتے ہیں، گویا موت کے خوف نے ہوش کو تمہارے سروں سے نکال دیا ہے اور بدمست لوگوں کی طرح اپنے آپے سے باہر ہوچکے ہو، میری بار بار کہی جانے والی باتیں تمہارے کانوں تک نہیں پہنچتیں (زندگی کی صحیح راہیں تلاش کرنے میں) مارے مارے

پھر رہے ہو معلوم ہوتا ہے تمہاری عقلیں جواب دے گئی ہیں اور
تمہاری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی، تم ہمارے لئے ہرگز قابل
اعتماد نہیں ہو اور نہ ہی کسی صورت میں میرے لئے باوثوق سہارا_
(خونخوار اور بدکار دشمنوں کے مقابلہ میں) تم پر اعتبار نہیں کیا
جا سکتا اور نہ ہی ایسے طاقتور مددگار ہو کہ بوقت ضرورت تمہاری
طرف رخ کیا جا سکے

تمہاری مثال شتر بے مہاروں کی سی ہے کہ جنہیں ایک طرف سے اکٹھا کیا
جاتا ہے تو وہ دوسری طرف سے منتشر ہو جاتے ہیں، خدا کی قسم! تم (دشمن کے خلاف)
جنگ کرنے کیلئے نہایت ہی برا ذریعہ ہو، تمہارے خلاف خطرناک منحوس تدبیریں
سوچی جا رہی ہیں مگر تمہاری ان کے مقابلے میں کوئی بھی تدبیر نہیں ہے، مسلسل
تمہارے گرد و پیش کے علاقے کم ہوتے جا رہے ہیں (تمہارے شہروں کو دشمن اپنے
علاقے میں شامل کرتا جا رہا ہے) مگر تمہاری رگ حمیت نہیں پھڑکتی (تمہیں زک
پہنچانے کیلئے) دشمن کی آنکھیں نہیں سوتیں مگر تم ہو کہ غفلت اور بے خبری میں مست ہو،
خدا کی قسم ان لوگوں کیلئے شکست حتمی ہے، جو نصرت اور مدد سے دست بردار ہو جاتے
ہیں، بخدا مجھے گمان ہے کہ اگر سخت جنگ برپا ہو جائے اور موت کی حرارت اور سوزش
تمہارے نزدیک آ جائے تو فرزند ابو طالبؑ سے ایسے کٹ جاؤ جیسے سر، تن سے جدا ہو
جاتا ہے اور جسے بعد میں بدن سے جوڑا بھی نہیں جا سکتا۔

۳۔کبھی مولا انہیں ”مردوں کی شکل میں نامردو!“ کے عنوان سے یاد
فرماتے ہیں، غور فرمائیں نہج البلاغہ خطبہ ۲۷:

اے مردوں کی شکل میں نامردو! تمہاری خواہشیں بچوں کی سی
اور عقلیں حجلہ نشین دلہنوں جیسی (جن کی سوچ صرف زر و زیور اور

عیش و نوش تک ہوتی ہے) میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ کبھی
تمہاری شکلیں نہ دیکھتا اور نہ ہی تمہیں جانتا ہوتا، پہچان بھی ایسی
کہ خدا کی قسم جس کا انجام سوائے پشیمانی اور غم و غصہ کے اور کچھ
نہیں، خدا تمہیں غارت کرے (اور اپنی رحمت سے دور رکھے)
تم نے میرا دل پیپ سے بھر دیا اور میرا سینہ غیظ و غضب سے
پُر کر دیا اور غم کے کاسے بھر کر مجھے گھونٹ گھونٹ کر کے پلائے تم
نے میری مدد کو ترک اور نافرمانی کر کے (دشمن کی سرکوبی کے)
میرے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے۔

۴۔نہج البلاغہ خطبہ ۱۱۶ میں کبھی آپ یہ آرزو کرتے ہیں کہ خدا آپ کے
اور ان لوگوں کے درمیان جدائی ڈال دے، فرماتے ہیں:

”لَوَدِدتُّ اَنَّ اللّٰہَ فَرَّقَ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُم وَاَلْحَقَنِیْ بِمَنْ
ھُوَاَحَقُّ بِیْ مِنْکُم“

بخدا میں اس بات کو دوست رکھتا ہوں کہ خداوند عالم میرے
اور تمہارے درمیان جدائی ڈال دے اور مجھے ان لوگوں سے
ملا دے جو تمہاری نسبت مجھ سے زیادہ سزاوار ہیں۔

۵۔کبھی ان سے ”لَا اَبَالَکُمْ“ (اے بے اصل لوگو!) کہہ کر مخاطب ہوتے
ہیں، نہج البلاغہ خطبہ ۳۹ میں فرماتے ہیں:

میرا ایسے لوگوں سے پالا پڑا ہوا ہے جنہیں میں جب بھی حکم
دیتا ہوں وہ اطاعت نہیں کرتے اور جب بلاتا ہوں جواب نہیں
دیتے، او بے اصل لوگو! دین خدا کی مدد کیلئے کس بات کے
منتظر ہو؟ آیا تمہارا کوئی دین نہیں ہے جو تمہیں اپنے گرد جمع

کر سکے ؟ یا تمہاری کوئی غیرت نہیں جو تمہیں غصہ دلائے ؟ میں تمہارے درمیان کھڑے ہوکر بلند آواز سے پکارتا ہوں اور دردمندی کے ساتھ تم سے مدد طلب کرتا ہوں مگر تم نہ تو میری بات سنتے ہو اور نہ میرے حکم کو مانتے ہو، تمہارا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ تمہاری بداعمالیوں کا انجام کھل کر سامنے نہیں آجائے گا (اور تم اس پشیمانی کا اظہار کرو اور س وقت بات کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی ہوگی اور پشیمانی بے سود ہوگی) ایسی صورت میں نہ تو تمہارے ذریعہ کسی بے گناہ کے خون کا بدلہ لیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تمہاری مدد سے کسی مطلوب نتیجے تک جا پہنچا جا سکتا ہے۔

۶۔ کبھی آپ ان لوگوں کے میدان جنگ میں شرکت نہ کرنے کیلئے ان کے حیلوں بہانوں کی شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''تمہارے چہرے بگڑیں'' ملاحظہ فرمائیے نہج البلاغہ خطبہ ۲۷:

تعجب بالائے تعجب !! خدا کی قسم یہ بات دل کو مردہ کر دیتی ہے اور (انسان کی روح میں) رنج وغم کا موجب ہوتی ہے کہ وہ (ظالم شامی) تو باطل کی راہوں میں باہم متحد و متفق ہوں لیکن تم حق کی راہ میں اس قدر منتشر و متفرق !! تمہارے چہرے بگڑیں اور ہمیشہ رنج وغم میں مبتلا رہو !! کیونکہ تم (نے دشمن کے سامنے اس قدر سستی اور انتشار کا مظاہرہ کیا کہ) ان کے تیروں کا نشانہ بن گئے، وہ تم پر پے در پے حملے کر رہے ہیں اور تم کوئی حملہ نہیں کر پاتے، وہ تم سے جنگ کر رہے ہیں اور تم ان سے نہیں

لڑتے، خدا کی علی الاعلان معصیت ہو رہی ہے اور تم (عملی طور پر) اس پر رضامندی اختیار کئے ہوئے ہو، جب میں تمہیں گرمیوں میں دشمن کے ساتھ لڑنے کا حکم دیتا ہوں تو تم کہتے ہو ابھی سخت گرمی ہے آپ ہمیں اتنا مہلت دیں کہ گرمی کی شدت ختم ہو جائے اور اگر میں سردیوں میں یہ حکم دیتا ہوں تو کہنے لگ جاتے ہو کہ اس وقت تو بہت سردی ہے، ہمیں اس قدر اجازت دیں کہ سردی کی شدت ختم ہو جائے'' گرمی اور سردی سے فرار کے یہ سب تمہارے بہانے ہیں، جب تم سردی اور گرمی میں اس قدر وحشتناک ہو اور فرار کی راہیں تلاش کرتے ہو تو بخدا (دشمن کی) شمشیر سے تو اس سے بھی کہیں زیادہ ہی فرار کرو گے۔

۷۔ کبھی آپ انہیں جہاد کی دعوت دیتے تو وہ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں آپ ان سے فرماتے ہیں کہ ''آیا تم گونگے ہو؟'' نہج البلاغہ خطبہ ۱۱۹ کے مطابق:

''مَابَالُكُمْ أَمُخْرَسُوْنَ اَنْتُمْ'' جنگ صفین اور نہروان کے بعد لوگوں کی معاویہ کی سرکوبی کیلئے جہاد کی طرف بلایا تو انہوں نے چپ سادھ لی تو فرمایا: تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم گونگے ہو گئے ہو؟ فرمایا:

''اِنَّهُ لَاغِنَآءَ فِیْ كَثْرَةِ عَدَدِكُمْ مَعَ قِلَّةِ اجْتِمَاعِ قُلُوْبِكُمْ''

تمہاری عددی برتری کا کوئی فائدہ نہیں جب تمہارے دل ہی منتشر ہیں۔

۸۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۳ میں کبھی ان لوگوں سے جنگ سے فرار اختیار کرنے کی وجہ سے انہیں ''سوسماروں کے ریوڑ'' سے تشبیہ دے کر فرماتے ہیں:

''كَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَیْكُمْ تَكِشُّوْنَ كَشِیْشَ الضِّبَابِ

لَاتَأْخُذُوْنَ حَقًّا وَّلَاتَمْنَعُوْنَ ضَيْمًا''

گویا میں تمہیں بعض حملوں میں فرار کرتے وقت سوسماروں کے ریوڑ کی مانند چیختا چلاتا دیکھتا ہوں تم اپنا حق کسی سے واپس لے سکتے ہو اور نہ ہی کسی کے ظلم کو روک سکتے ہو۔

۹۔کبھی فرماتے ہیں: ''میرے علاوہ کسی اور رہبر کے منتظر ہو؟'' توجہ فرمائیں: نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۳

''اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ قَدْبَثَثْتُ لَكُمُ الْمَوَاعِظَ الَّتِىْ وَعَظَ الْاَنْبِيَآءُ بِهَا اُمَمًا وَّاَدَّيْتُ اِلَيْكُمْ مَّآاَدَّتِ الْاَوْصِيَآءُ اِلٰى مِنْ بَعْدِهِمْ وَاَدَّبْتُكُمْ بِسَوْطِىْ هٰذَافَلَمْ تَسْتَقِيْمُوْا وَحَدَوْتُكُمْ بِالزَّوَاجِرِ فَلَمْ تَسْتَوْسِقُوا لِلّٰهِ اَنْتُمْ اَتَتَوَقَّعُوْنَ اِمَامًا غَيْرِىْ يُطَأُبِكُمُ الطَّرِيْقَ وَيُرْشِدُكُمُ السَّبِيْلَ ؟''

اے لوگوں میں نے انہی وعظوں اور نصیحتوں کو تمہارے درمیان نشر کیا ہے جو انبیاء نے اپنی امتوں کے درمیان نشر کی تھیں اور جو کچھ انبیاء کے جانشینوں نے لوگوں کو بیان کیں میں نے بھی وہی کچھ بیان کیں، میں نے نصیحتوں کو تازیانوں کی مانند تمہارے اوپر برسایا تاکہ تمہیں ادب سکھاؤں لیکن پھر بھی تم راہ راست پر نہ آئے میں نے تمہیں بڑی تنبیہ کی لیکن تم جمع نہ ہو سکے خدارا مجھے بتاؤ کہ تم میرے علاوہ کسی اور امام اور رہبر کے انتظار میں تو نہیں ہو؟ جو تمہارے لئے راہیں ہموار کرے اور تمہیں حق کی طرف راہنمائی کرے؟

۱۰۔کبھی ان سے فرماتے ہیں: ''افسوس کہ تم قابل اعتماد لوگ نہیں ہو'' غور کیجئے:

''مَآاَنْتُمْ بِوَثِيْقَةٍ يُّعْلَقُ بِهَاوَلَازَوَافِرِعِزٍّيُّعْتَصَمُ اِلَيْهَا لَبِئْسَ حُشَاشُ نَارِالْحَرْبِ اَنْتُمْ ،اُفٍّ لَّكُمْ لَقِيْتُ مِنْكُمْ بَرَحًافَلَااَحْرَارٌعِنْدَالنِّدَاءِ وَلَااِخْوَانَ ثِقَةٍ عِنْدَالنَّجَاءِ''

نہ تو تم ایسا ذریعہ ہو جس پر اعتماد کیا جا سکے اور نہ طاقتور مددگار ہو کہ جن کے دامن کو تھاما جا سکے، تم آتش جنگ میں جھونکے جانے کیلئے کس قدر خراب ایندھن ہو تم پر افسوس ہے، میں تمہارے ہاتھوں کس قدر دکھ دیکھ چکا ہوں میں ایک دن تمہیں آشکار اور بلند آواز کے ساتھ پکارتا ہوں کہ جنگ کیلئے نکلو!! اور دوسرے دن آہستہ تمہارے کانوں میں یہی کہتا ہوں لیکن تم لوگ نہ تو اس وقت آزاد منش انسانوں کی طرح ہوتے ہو جب بلند آواز سے پکارتا ہوں اور نہ ہی سرگوشی کے موقعہ پر قابل اعتماد بھائی ثابت ہوتے ہو۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۵)

اگر آپ نہج البلاغہ کا بنظر غائر مطالعہ فرمائیں تو آپ کو اور بھی بہت سے مقامات پر آنجنابؑ اپنے ہم عصر لوگوں سے شکوہ شکایت فرماتے نظر آئیں گے، اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ مولا علیؑ کو ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا جو آپ پر ظلم کرتے تھے۔

آج بھی مولا علیؑ پر ظلم کیا جا رہا ہے، علیؑ کے ماننے والوں پر ظلم ہو رہا ہے، آج کی روشن دنیا میں بھی لوگوں نے مولا علی علیہ السلام کو صحیح معنوں میں نہیں پہچانا۔ یہ جو تاریخ کو دہرایا جاتا ہے، اس کا تجزیہ اور تحلیل کی جاتی ہے، اس کا مقصد صرف اور

صرف یہ ہوتا ہے کہ دنیا کو مولا علیؑ کی شناخت ہو جائے۔

اگر چہ آج کا دور ''وحدت'' کا دور ہے، ایسا دور ہے جس میں دشمن کے مقابلہ میں تمام مسلمانوں کو ''دنیائے کفر'' کامل کر مقابلہ کرنا چاہئے، کفر ملت واحدہ بن کر عالم اسلام کے مقابلے میں کھل کر آ گیا ہے، مگر وحدت کے معنی قطعاً یہ نہیں کہ حقائق کو بیان ہی نہ کیا جائے۔

حضرت امام خمینی (رضوان اللہ علیہ) سب سے زیادہ ''داعی وحدت'' تھے، انہوں نے بھی اپنے وصیت نامہ کے چیدہ چیدہ مواقع پر حدیث ثقلین اور مسئلہ تشیع اور اہل بیتؑ کو کھل کر بیان فرمایا، اس طرح سے انہوں نے ہمیں یہ سبق دیا کہ بیان حقائق، وحدت کے منافی نہیں ہے، اس لئے کہ اگر یہ حقائق بیان نہ ہوں تو امیر المؤمنین علیہ السلام پر ظلم کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ہمیں تو امید ہے کہ یہ حقائق اسلامی ممالک کی یونیورسٹیز (Universities) میں بیان ہوں اور بطور نصاب پڑھائے جائیں، تا کہ جوان اور تعلیم یافتہ نسل حقائق سے آگاہ ہو اور انہیں قبول کرے اور ایک دن ایسا آئے کہ مظلوم مولاؑ کو اپنا حقیقی مقام عطا ہو۔

آج کے روشن دور اور روشن فکر اور روشن خیال معاشرے میں بھی بہت سے مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ علیؑ، تین کے ساتھ چوتھے ہیں اور ان میں باہمی کوئی فرق نہیں ہے، لہٰذا علمی مدارس اور درسگاہوں کا فرض بنتا ہے کہ حقائق کو بیان کریں تا کہ علیؑ پر روا رکھا جانے والا ظلم کم بلکہ ناپید ہو جائے۔

ہمیں ان لوگوں کو حقائق سے آگاہ کرنا چاہئے جو مولا علیؑ کا دوسرے لوگوں سے موازنہ کرتے ہیں؛ کہ آؤ اور مولا علیؑ کے کلام کو ان کے ہم عصر دوسرے لوگوں کے کلام سے ملا کر دیکھو اور خود ہی موازنہ کرو کہ اس کا کس قدر باہمی فرق ہے، آیا کوئی ان سے موازنہ کے قابل بھی ہے؟ پھر ان سے پوچھا جائے کہ آیا علیؑ کو پیغمبر اسلام کے

علاوہ کسی اور کے ساتھ قیاس کیا جا سکتا ہے؟

④......فضائل علیؑ کی پردہ پوشی

علیؑ کی مظلومیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس مظلوم امامؑ کے فضائل و مناقب کو چھپایا گیا، دشمنوں نے حسد، دشمنی اور کینہ کی وجہ سے چھپایا، کیونکہ جب انہوں نے آپؑ کے مقامات عالیہ اور کرامات شاخہ کو دیکھا تو اپنی دشمنی اور حسد کی وجہ سے انہیں ہر ممکن چھپانے کی کوشش کی، چنانچہ ابن ابی الحدید معتزلی شرح نہج البلاغہ جلد ا ص ۱۷ لکھتے ہیں:

''فَقَدْ عَلِمْتُ اَنَّهُ اسْتَوْلٰی بَنُوْ اُمَيَّةَ عَلٰى سُلْطَانِ الْاِسْلَامِ فِیْ شَرْقِ الْاَرْضِ وَ غَرْبِهَا وَ اجْتَهَدُوْا بِكُلِّ حِيْلَةٍ فِیْ اِطْفَآءِ نُوْرِهٖ وَالتَّحْرِيْضِ عَلَيْهِ، وَوَضْعِ الْمَعَايِبِ وَ الْمَثَالِبِ لَهٗ وَ لَعَنُوْهُ عَلٰى جَمِيْعِ الْمَنَابِرِ وَ تَوَاعَدُوْا مَادِحِيْهِ بَلْ حَبَسُوْهُمْ وَ قَتَلُوْهُمْ وَ مَنَعُوْا مِنْ رِّوَايَةِ حَدِيْثٍ يَّتَضَمَّنَ لَهٗ فَضِيْلَةً اَوْ يُرْفَعُ لَهٗ ذِكْرًا حَتّٰى حَظَرُوْا عَلٰى اَنْ يُّسَمِّيَ اَحَدٌ اسْمَهٗ''۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ بنو امیہ عالم اسلام کی مشرق سے مغرب تک کی سرحدوں کے حکمران تھے اور وہ اس عرصہ میں نور علیؑ کو ہر ممکن خاموش کرنے کی کوشش میں لگے رہے، حقائق کا چہرہ بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، امیر المؤمنین علیؑ کی توہین و تنقیص میں جھوٹی اور جعلی حدیثیں گھڑنے میں پوری پوری کوشش کی، منبروں پر آپؑ کی ذات کو علی الاعلان ناسزا کہا جاتا رہا، آپؑ کی مدح وستائش کرنے والوں کو دھمکیاں دی گئیں بلکہ قید خانوں میں ڈالا گیا حتی کہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، جن احادیث وروایات میں آپؑ کی فضیلت بیان ہوئی ہے یا جن میں آپؑ کی عظمت و

سر بلندی کا تذکرہ تھا انہیں عوام الناس تک پہنچنے سے ہر ممکن روکا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ''علی'' نام رکھنے کو بھی جرم قرار دے دیا گیا۔

ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ جلد ۱۱ ص ۴۴ میں رقمطراز ہیں کہ: ''کَتَبَ مُعَاوِیَةُ اِلٰی عُمَّالِهٖ اَن بَرِئَتِ الذِّمَّةُ مِمَّن رَّوٰی شَیْئًا مِّنْ فَضْلِ اَبِیْ تُرَابٍ وَ اَهْلِ بَیْتِهٖ''۔ معاویہ نے اپنے تمام کارندوں کو ایک سرکلر (سرکاری فرمان نامہ) جاری کیا کہ جو شخص ابوتراب (علیؑ) اور ان کے اہل بیتؑ کی شان میں کوئی حدیث بیان کرے گا اس کے لئے امان نہیں ہے۔

اس فرمان کا یہ اثر ہوا کہ کسی کو اس بات کی جرائت نہیں تھی کہ دینی مسائل تک میں آپؑ سے کوئی حدیث بیان کرتا، چنانچہ ابوجعفر اسکافی کہتے ہیں: ''اِنَّ بَنِیْ اُمَیَّةَ مَنَعُوْا مِنْ اِظْهَارِ فَضَائِلِ عَلِیٍّ وَ عَاقَبُوا عَلٰی ذَالِکَ الرَّاوِیَ لَهٗ حَتّٰی اَنَّ الرَّجُلَ اِذَا رَوٰی عَنْهُ حَدِیْثًا لَّا یَتَعَلَّقُ بِفَضْلِهٖ بَلْ بِشَرَائِعِ الدِّیْنِ لَا یَتَجَاسَرُ عَلٰی ذِکْرِ اسْمِهٖ فَیَقُوْلُ عَنْ اَبِی زَیْنَبَؑ''۔ بنی امیہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے فضائل بیان کرنے سے روکا کرتے تھے اور آنجنابؑ کی فضیلت میں ذکر ہونے والی احادیث کے راویوں کو گرفتار کر کے سزا دیا کرتے تھے، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص آنجنابؑ کی کوئی ایسی حدیث روایت کرتا جو شرعی مسائل اور احکام کے بارے میں ہوتی نا کہ آپ کی فضیلت میں، تو انہیں بھی آپؑ کا اسم گرامی ذکر کرنے کی جرائت نہیں ہوتی تھی بلکہ کنایہ کے طور پر یہ کہتے تھے: ''ابوزینبؑ سے میں نے یہ روایت کی ہے''۔

صرف اسی پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے کہ آپؑ کے فضائل پر مشتمل کسی حدیث کو بیان نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی نامردی اور ذلت کی حد یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ جو بات بھی فضیلتِ علی علیہ السلام کا سبب ہوا کرتی تھی وہ آپؑ کے دشمنوں کی

طرف اور جو چیزیں آپؑ کے دشمنوں کی مذمت میں ہوتی تھیں وہ اس مظلوم کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے، چنانچہ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۳ ص ۳۷ میں ہے ملاحظہ فرمائیں: ''اِنَّ مُعَاوِیَةَ بَذَلَ لِسَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ مِّأَةَ اَلْفِ دِرْهَمٍ حَتّٰی یَرْوِیَ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰیَةَ نَزَلَتْ فِیْ عَلِیِّ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ: ''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُکَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَافِیْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ اِذَاتَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَایُحِبُّ الْفَسَادَ'' (البقرہ /۲۰۷) وَاِنَّ الْاٰیَةَ الثَّانِیَةَ فِی ابْنِ مُلْجِمٍ وَّهِیَ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: ''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ'' (البقرہ /۲۰۴، ۲۰۵) فَلَمْ یَقْبَلْ بَذَلَ مِأَتَیْ اَلْفِ دِرْهَمٍ فَلَمْ یَقْبَلْ بَذَلَ لَهٗ ثَلَاثَمِأَةِ اَلْفٍ فَقَبِلَ وَرَوٰی ذَالِکَ''

معاویہ نے سمرہ بن جندب کو ایک لاکھ درہم کی اس بناء پر پیشکش کی کہ قرآن کی وہ آیت جو منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ یہ روایت کرے کہ یہ علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ ہے سورہ بقرہ کی ۲۰۷ ویں آیت: ''اور کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی چکنی چپڑی باتیں دنیاوی زندگی میں تمہیں اچھی لگتی ہیں ......اور جو آیت شب ہجرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی وہ قاتل علی بن ابی طالب علیہ السلام یعنی ابن ملجم ملعون کے بارے میں اتری ہے اور وہ سورہ بقرہ کی ۲۰۴ اور ۲۰۵ ویں آیات ہیں'' یعنی ''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ'' مگر سمرہ بن جندب نے اسے مسترد کر دیا پھر اس نے دو لاکھ درہم کی پیشکش کی مگر اس نے یہ بھی مسترد کر دی، پھر تیسری اور آخری مرتبہ تین لاکھ درہم کی پیشکش کی جسے اس نے قبول کر لیا اور اس موضوع کی حدیث گھڑ لی۔

معاویہ کی دشمنی صرف یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس نے ایک اور قدم آگے

بڑھایااور اپنے گورنروں کے نام سرکاری حکم نامہ جاری کیا ملاحظہ ہو شرح بن ابی الحدید جلد ۱۱ص ۴۴:

''عثمان کے بارے میں فضائل ومناقب پر مشتمل احادیث جعل کرنے والوں کے نام اور پتے اور جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں مجھے لکھ بھیجو، نیز ان کو عزت دی جائے اور انہیں احترام دیا جائے''۔

کتاب کی اصل عبارت یہ ہے:

''کَتَبَ مُعَاوِیَۃُ اِلیٰ عُمّالِہٖ :اَنْ انْظُرُوْا مِنْ قِبَلِکُمْ مِنْ شِیْعَۃِ عُثْمَانَ وَمُحِبِّیْہِ وَاَھْلِ وِلَایَتِہٖ وَالَّذِیْنَ یَرْوُوْنَ فَضَآئِلَہٗ وَمَنَاقِبَہٗ فَادْنُوْامَجَالِسَھُمْ وَقَرِّبُوْھُمْ وَاکْرِمُوْھُمْ وَاکْتُبُوْلِیْ بِکُلِّ مَایَرْوِیْ کُلُّ رَجُلٍ مِّنْھُمْ وَاسِمَہٗ وَاسْمَ اَبِیْہِ وَعَشِیْرَتِہٖ''

شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱۱ص ۴۴ کے مطابق:

معاویہ کے اس شاہی فرمان کا یہ اثر ہوا کہ حضرت عثمان کے فضائل ومناقب کیلئے جعلی حدیثوں کا بازار گرم ہوگیا اور دھڑادھڑ مارکیٹ میں آنا شروع ہوگئیں یہاں تک کہ معاویہ پریشان ہوگئے آخر کار انہیں ایک اور فرمان نامہ جاری کرنا پڑا کہ:
''فضائل عثمان اوران کے مناقب کے سلسلے میں ہونے والی احادیث اب ''بے شمار'' ہوگئی ہیں اب حضرات شیخین کے بارے میں یہ سلسلہ شروع کیا جائے_ اور ہاں دیکھو کہ کہیں ابوتراب (علیؑ) کی شان میں کوئی شخص کوئی حدیث بیان کررہا ہے تو فوراً اسی طرح کی حدیث دوسروں کے بارے میں وضع کرلی جائے؛'' اصل عبارت یوں ہے:

''فَفَعَلُوْاذٰلِکَ حَتّٰی اَکْثَرُوْافِیْ فَضَآئِلِ عُثْمَانَ وَمَنَاقِبِہٖ ......ثُمَّ کَتَبَ اِلیٰ عُمَّالِہٖ اَنَّ الْحَدِیْثَ فِیْ عُثْمَانَ قَدْکَثُرَوَافَشَافِیْ کُلِّ مِصْرٍوَّفِیْ

کُلِّ وَجْہٍ نَاحِیَۃٍ،فَاِذَاجَآئَکُمْ کِتَابِیْ ھٰذَافَادْعُواالنَّاسَ اِلَی الرِّوَایَۃِ فِیْ فَضَآئِلِ الصَّحَابَۃِ وَالْخُلَفَآءِ الْاَوَّلِیْنَ ،وَلَاتَتْرُکُوْاخَبَرًایَّرْوِیْہِ اَحَدًامِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ فِیْ اَبِیْ تُرَابٍ اِلَّاوَتَاْتُوْنِیْ بِمُنَاقِضٍ لَہٗ فِی الصَّحَابَۃِ فَاِنَّ ھٰذَااَحَبُّ اِلَیَّ وَاَقَرُّلِعَیْنِیْ وَاَدْحَضُ لِحُجَّۃِ اَبِیْ تُرَابٍ وَّشِیْعَتِہٖ وَاَشَدُّاِلَیْھِمْ مِّنْ مَّنَاقِبِ عُثْمَانَ وَفَضْلِہٖ'

⑤......ناسزاگوئی

حضرت امیر علیہ السلام کے ساتھ دشمنی کی حد ہوگئی ،ایک طرف تو فضائل ومناقب پر پردہ ڈالا گیا اور دوسری طرف آپ کے فضائل کو دوسروں سے منسوب کردیا گیا، یہی نہیں بلکہ ان کے دشمن کی شان میں بے شمار حدیثیں بھی جعل کی گئیں، بات صرف یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ چار قدم اور آگے بڑھ گئے ،آنجنابؑ پر جمعہ کے خطبوں، نمازوں اور دیگر اجتماعات میں ناسزاگوئی کو پورے اسلامی ملکوں میں رواج دیدیا گیا، اس بارے میں تاریخ بڑی افسوس ناک داستانیں بیان کرتی ہے۔

علامہ امینی علیہ الرحمہ اپنی کتاب الغدیر جلد ۲ص ۱۰۲ میں کتاب معجم البلدان حموی سے نقل کرتے ہیں کہ: ''لُعِنَ عَلِیُّ ابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ)عَلٰی مَنَابِرِالشَّرْقِ وَالْغَرْبِ''

حضرت امیر علیہ السلام پر مشرق ومغرب کے تمام اسلامی ممالک کے منبروں پر ناسزاگوئی جاری رہی۔

علامہ امینی علیہ الرحمہ مکتب خلفاء کی کتابوں سے نقل کرتے ہیں:
''اِنَّہٗ کَانَ فِیْ اَیَّامِ بَنِیْ اُمَیَّۃَ اَکْثَرُمِنْ سَبْعِیْنَ اَلْفِ مِنْبَرٍیُّلْعَنُ

عَلَیْهَا عَلِیُّ ابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ عَلَیْهِ السَّلَام بِمَاسَنَّهٗ لَهُمْ مُعَاوِیَهُ مِنْ ذَالِکَ ''

بنی امیہ کے دوران حکومت ستر ہزار سے زائد منبروں پر حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کو سب وشتم کیا جاتا رہا اور اس کی بنیاد معاویہ نے رکھی تھی۔

چنانچہ جب اموی افراد سے ہمارے ائمہؑ اس بارے میں احتجاج کرتے تو وہ جواب میں کہتے: ''ہماری حکومت اس کے بغیر مستحکم نہیں ہوسکتی''

شرح بن ابی الحدید جلد۱۳ ص۲۰۲ میں ہے:

محمد بن اسحٰق حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے ایک فرزند سے روایت کرتے ہیں کہ میرے والد (امام سجاد علیہ السلام) نے مروان سے فرمایا:

''مَابَالُکُمْ تَسُبُّوْنَهٗ عَلَی الْمَنَا بِرِ ؟قَالَ اِنَّهٗ لَا یَسْتَقِیْمُ لَنَا اَمْرٌ اِلَّا بِذَالِکَ ''

تم لوگ امیر المومنین (علی) علیہ السلام کو منبروں پر سب وشتم کیوں کرتے ہو؟ تو اس نے کہا کہ: ہماری حکومت اس کے بغیر مستحکم اور ہمارا اقتدار اس کے بغیر پائیدار نہیں رہ سکتا۔

شرح بن ابی الحدید جلد۴ ص۴۷ کے مطابق

دنیا کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ آنجنابؑ پر سب وشتم کرکے اور آپ کو ناسزا کہہ کر ہی ان کی دنیا آباد ہوسکتی ہے لہذا انہوں نے اس بارے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، ایک مرتبہ معاویہ کوفہ آئے اور لوگوں نے ان کا شاندار استقبال کیا ان استقبال کرنے والوں میں ابوہریرہ بھی شامل تھے جب انہوں نے لوگوں کا اس قدر جم غفیر دیکھا تو اپنے دونوں زانوں پر کھڑے ہوکر اپنی پیشانی کو پیٹنا شروع کردیا لگے ،اس طرح سے لوگوں کے جذبات اور زیادہ ہوگئے تو انہوں نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً ہی رسول خداؐ کی ایک حدیث گھڑلی اور کہا کہ آنحضرتؐ نے علیؑ کی

مذمت میں یہ یہ کہا ہے، لوگوں نے سن کر یہ خبر معاویہ تک پہنچائی، معاویہ نے اس ''خدمت'' کے بدلے میں انہیں مدینہ کی گورنری سونپ دی۔

ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمائیے، ایک آدمی حجاج (بن یوسف) کے پاس آکر کہنے لگا: ''میرے ماں باپ نے میرا نام ''علی'' رکھ کے مجھ پر ظلم کیا ہے، مہربانی کرکے میرا نام تبدیل کردیجئے'' حجاج نے اس کا نام تبدیل کردیا اور علیؑ سے دشمنی کے بدلے میں اسے ایک سرکاری عہدہ بھی عطا کردیا۔

عبارت کے الفاظ یہ ہیں:

''کَانَ الْحَجَّاجُ (لعنه الله) یَلْعَنُ عَلِیًّا (علیه السلام) وَیَأْمُرُ بِلَعْنِهٖ وَقَالَ لَهٗ مُتَعَرِّضٌ بِهٖ یَوْمًا وَّهُوَ رَاکِبٌ :اَیُّهَا الْاَمِیْرُ اِنَّ اَهْلِیْ عَقُّوْبِیْ فَسَمَّوْنِیْ عَلِیًّا، فَغَیِّرِ اسْمِیْ! فَقَالَ لِلُّطْفِ مَا تَوَصَّلْتَ بِهٖ قَدْ سَمَّیْتُکَ کَذَا وَوَلَّیْتُکَ الْعَمَلَ الْفُلَانِیْ فَاشْخَصْ اِلَیْهِ'' (ایضا جلد۴ ص۵۸، جلد۱۱ ص۴۶)

لوگوں پر بنی امیہ کی پروپیگنڈہ مشینری کا اس حد تک اثر ہوا کہ انہوں نے امام مظلومؑ کو ناسزا کہنا مستحبات کا حصہ بنالیا اور وہ بھی سال کے باعظمت ترین دن ''عرفہ'' _۹ ذوالحجہ_ کے دن، چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص ہشام بن عبدالملک کے پاس آیا اور اس بات کی یاددہانی کرائی کہ ''آج وہ دن ہے کہ جس میں خلفاء حضرات، ابوترابؑ پر (نعوذ باللہ) سب وشتم کو مستحب جانتے تھے'' عبارت کے الفاظ اس طرح ہیں:

''قَامَ رَجُلٌ مِّنْ وُّلْدِ عُثْمَانَ اِلٰی هَشَّامِ بْنِ عَبْدِالْمَلِکِ یَوْمَ عَرَفَةَ فَقَالَ: ''اِنَّ هٰذَا یَوْمٌ کَانَتْ خُلَفَآءُ تَسْتَحِبُّ فِیْهِ لَعْنَ اَبِیْ تُرَابٍ '' (شرح بن ابی الحدید جلد۱۳ ص۲۲۱)

بنی امیہ کی سازش یہ تھی کہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو ناسزا گوئی عوام

الناس کی ثقافت کا ایک حصہ بن جائے اور اپنی اولاد کی تربیت بھی اسی نہج پر کریں، اس کی دلیل یہ ہے کہ خود امویوں کا ایک گروہ معاویہ کے پاس آیا اور انہیں یہ پیشکش کی چونکہ آپکا دلی مقصد پورا ہو گیا ہے لہٰذا بہتر ہے کہ علیؑ کی بدگوئی کا سلسلہ بند کر دیا جائے'' تو انہوں نے جواب دیا:

''لَاوَاللّٰہِ حَتّٰی یَرْبُوَعَلَیْہِ الصَّغِیْرُوَیَھْرُمُ عَلَیْہِ الْکَبِیْرُوَلَایَذْکُرُلَہٗ ذَاکِرٌفَضْلاً''

نہ خدا کی قسم! علیؑ کی ناسزا گوئی ہرگز ختم نہیں کی جا سکتی یہاں تک کہ چھوٹے بچے بڑے ہو جائیں اور بڑے بوڑھے ہو جائیں اور ان میں یہ سوچ راسخ ہو جائے اور علیؑ کا نام لینے والا تک کوئی باقی نہ رہے۔ (شرح بن ابی الحدید جلد۲ ص ۵۷)

زمانہ گزرتا رہا اور یہ ''لعنتی سوچ'' پروان چڑھتی رہی اور نوبت با اینجا رسید کہ کچھ لوگ اپنے حکام سے بھی کئی قدم آگے بڑھ گئے اور انکی خوشنودی کے حصول کیلئے صرف آنجنابؑ کی ذات تک ہی ناسزا گوئی کو محدود نہیں رکھا اس مظلوم کی مظلومہ زوجہ (سیدہ فاطمۃ الزہراؑ) اور مظلوم اولاد (حسنین شریفینؑ) تک کو بھی معاف نہیں کیا، چنانچہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ:

ایک شخص نے حجاج بن یوسف کے پاس آکر کہا: ''ہمارے پاس وہ فضائل و مناقب ہیں جو کسی اور قوم وقبیلہ کے پاس نہیں ہیں'' حجاج نے پوچھا: ''وہ کیا ہیں؟'' کہا:

''مِنَّا نِسْوَۃٌ نَذَرْنَ اِنْ قُتِلَ حُسَیْنُ بْنُ عَلِیٍ اَنْ تَنْحَرَ کُلُّ وَاحِدَۃٍ عَشْرَ قَلَائِصَ فَفَعَلْنَ وَمَامِنَّارَجُلٌ عُرِضَ عَلَیْہِ شَتْمُ اَبِیْ تُرَابٍ وَلَعْنُہٗ اِلَّا وَفَعَلَ وَزَادَابْنَیْہِ حَسَنًاوَّحُسَیْنًا وَّ اُمَّھُمَافَاطِمَۃَ''

ہماری کچھ عورتوں نے نذر مانی تھی کہ حسین بن علیؑ قتل کئے جائیں تو ان

میں سے ہر ایک عورت دس اونٹ ذبح کرے گی، چنانچہ انہوں نے اپنی نذر کو پورا کر دیا اور جب ہمیں کہا گیا کہ ابوترابؑ (علیؑ) کو گالیاں دو اور لعنت کرو ـــ (نعوذ باللہ) ـــ تو ہم نے نہ صرف ان کو گالیاں دیں اور لعنت کی بلکہ اس کے دونوں بیٹوں حسنؑ و حسینؑ ـــ اور حسنینؑ کی والدہ ـــ فاطمۃ الزہراؑ ـــ کو بھی ساتھ ملا لیا۔

البتہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام اپنے بعد رونما ہونے والے ایسے حوادث کی پیش گوئی فرما چکے تھے، جیسا کہ نہج البلاغہ میں ہے:

''اَلَاوَاِنَّہٗ سَیَأْمُرُکُمْ لِسَبِّیْ وَالْبَرَآءَ ۃِ مِنِّی............''

آگاہ رہو کہ بہت جلد ہی معاویہ تمہیں مجھ سے بیزاری اور میری بدگوئی کا حکم دے گا...... (نہج البلاغہ خطبہ ۵۷)

اس بارے میں مزید معلومات کیلئے شرح بن ابی الحدید فصل: **''فیما رُوی من سب معاویہ وحزبہ لعلی علیہ السلام''** اور فصل **فیما ذکر الاحادیث الموضوعۃ فی ذم علی''** کا مطالعہ فرمائیں ـــ

اب آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس گفتگو کا ذکر کیا جائے جس میں انہوں نے ان لوگوں پر اعتراض کیا جو علی علیہ السلام کو برا بھلا کہہ رہے تھے:

علامہ امینی رحمۃ اللہ علیہ چند ایک علماء اہل سنت سے نقل فرماتے ہیں کہ: جب حضرت عبداللہ بن عباس کی بینائی جواب دے چکی تھی ایک دن راہ چلتے انہیں ایک آواز سنائی دی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کچھ لوگ حضرت علی علیہ السلام کو گالیاں دے رہے ہیں، ابن عباسؓ نے اپنے راہنما سے کہا مجھے ان لوگوں کے پاس لے چلو جب ان کے پاس پہنچے تو فرمایا:

"اَیُّکُمُ السَّآبُّ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ؟قَالُوا سُبْحَانَ اللّٰهِ مَنْ سَبَّ اللّٰهَ فَقَدْ اَشْرَکَ فَقَالَ اَیُّکُمُ السَّآبُّ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ؟فَقَالُوا سُبْحَانَ اللّٰهِ وَمَنْ سَبَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَدْ کَفَرَ ،قَالَ فَاَیُّکُمُ السَّآبُّ لِعَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍؑ ؟قَالُوا اَمَّا هٰذَا فَقَدْ کَانَ قَالَ فَاَنَا اَشْهَدُ بِاللّٰهِ وَاُشْهِدُهٗ اَنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ (ص)یَقُوْلُ :"مَنْ سَبَّ عَلِیًّا فَقَدْ سَبَّنِی وَمَنْ سَبَّنِیْ فَقَدْ سَبَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ وَمَنْ سَبَّ اللّٰهَ اَکَبَّهُ اللّٰهُ عَلٰی مَنْخِرَیْهِ فِی النَّارِ"

تم میں سے کون اللہ کو گالیاں بک رہا تھا؟ ان لوگوں نے کہا: "سبحان اللہ !جو خدا کو گالیاں دیتا ہے وہ مشرک ہے" فرمایا پھر کون رسول اللہؐ کو گالیاں دے رہا تھا؟ انہوں نے کہا: "واہ! سبحان اللہ رسول اللہ کو گالیاں بکنے والا تو کافر ہے" فرمایا: پھر کون علی بن ابی طالبؑ کو ناسزا کہہ رہا تھا؟ تو کہا: ہاں البتہ یہ ضرور ہے ،اس پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: میں خدا کو گواہ بنا کر اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ میں نے بذات خود حضرت رسول خداؐ سے سنا ہے کہ جو علی علیہ السلام کو گالیاں دے گا وہ مجھے گالیاں دے گا اور جو مجھے گالیاں دے گا وہ اللہ کو گالیاں دے گا اور جو خداوند تعالیٰ کو گالیاں دے گا خداوند عالم اسے منہ کے بل جہنم میں ڈال دے گا۔

(الغدیر جلد۲ ص۲۹۹)

⑥ ......شیعیان علیؑ کا قتل اور ایذائیں

دشمنان علیؑ کا منصوبہ یہ تھا کہ شیعہ اور تشیع کا نام ونشان تک باقی نہ رہے،اسی لئے انہوں نے شیعیان و دوستان علیؑ کے قتل پر کمر باندھ لی تھی،ان کے گھروں کو مسمار کر دیا کرتے تھے اور جب چاہتے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا کرتے تھے،حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:

"وَکَانَ عَظْمُ ذَالِکَ وَکَبْرُهٗ فِیْ زَمَنِ مُعَاوِیَةَ بَعْدَ مَوْتِ الْحَسَنِ علیه السلام فَقُتِلَتْ شِیْعَتُنَا بِکُلِّ بَلْدَةٍ وَّقُطِّعَتِ الْاَیْدِیْ وَالْاَرْجُلُ عَلَی الظَّنَّةِ وَکَانَ مَنْ یُّذْکَرُ بِحُبِّنَا وَالْاِنْقِطَاعِ اِلَیْنَا سُجِنَ اَوْ نُهِبَ مَالُهٗ اَوْ هُدِمَتْ دَارُهٗ ......ثُمَّ جَاءَ الْحَجَّاجُ فَقَتَلَهُمْ کُلَّ قِتْلَةٍ وَّاَخَذَهُمْ بِکُلِّ ظَنَّةٍ وَّتُهْمَةٍ حَتّٰی اَنَّ الرَّجُلَ لَیُقَالُ لَهٗ اِنَّهٗ زِنْدِیْقٌ اَوْ کَافِرٌ اَحَبُّ اِلَیْهِ مِنْ اَنْ یُّقَالَ شِیْعَةُ عَلِیٍّ عَلَیْهِ السَّلَامُ"

شیعیان علیؑ کے قتل عام اور غارتگری کا سلسلہ معاویہ کے دور حکومت میں عروج پر تھا اور وہ بھی حضرت امام حسن علیہ السلام کی شہادت کے بعد،اس دور میں شیعوں کے ہاتھوں اور پاؤں کو کاٹ دیا جاتا تھا،تمام شہروں میں انہیں شہید کر دیا جاتا تھا،بعض لوگوں کو قید خانوں میں ڈال دیا جاتا تھا ان کے مال واسباب کو لوٹ لیا جاتا تھا ان کے گھروں کو مسمار کر دیا جاتا تھا اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا......حتیٰ کہ حجاج بن یوسف کا دور آن پہنچا اور اس دور میں سختیوں کا اضافہ ہو گیا قتل وغارتگری کا سلسلہ بڑھ گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اگر کسی کو کافر یا بے دین کہا جاتا تو وہ ان کیلئے بہتر تھا کہ کسی کو "علیؑ کا شیعہ" کہا جائے۔ (شرح بن ابی الحدید جلد۱۱ ص۳۴)

معاویہ نے اپنے سرکاری فرمان نامہ (سرکلر) میں اپنے گورنروں اور دیگر حکام کو ہدایت کی کہ:

"اگر کسی شخص کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ علیؑ اور اہل بیتؑ کا دوست ہے تو اس کا نام سرکاری ملازمین کی فہرست سے خارج کر دیا جائے اس کی تنخواہ بند کر دی جائے اور اسے تمام دوسری سرکاری سہولیات سے محروم کر دیا جائے"

عبارت کے الفاظ یوں تھے: "اُنْظُرُوا مَنْ قَامَتْ عَلَیْهِ الْبَیِّنَةُ اَنَّهٗ یُحِبُّ عَلِیًّا وَّاَهْلَ بَیْتِهٖ فَامْحُوا مِنَ الدِّیْوَانِ وَاَسْقِطُوْا عَطَآئَهٗ وَرِزْقَهٗ" (شرح بن

ابی الحدید جلد ۱۱ص ۳۵)

ایک اور حکم نامہ میں اس نے کہا:

''مَنِ اتَّھَمُوْہُ بِمُوَالَاۃِ ھٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ فَنَکِّلُوْا بِہٖ وَاَھْدِمُوْا دَارَہٗ''

جن پر علیؑ اور اہل بیتؑ سے دوستی کا الزام ہوتو اس کے کان ناک کاٹ دو اور گھروں کو منہدم کردو۔

ایک اور سرکاری فرمان نامے میں اس نے کہا:

''اَنْ لَّا یُجِیْزُوْا لِاَحَدٍ مِّنْ شِیْعَۃِ عَلِیٍّ وَّاَھْلِ بَیْتِہٖ شَھَادَۃً''

علیؑ اور اہل بیتؑ کے شیعوں کی گواہی کہیں پر بھی قبول نہ کرو۔ (شرح بن ابی الحدید جلد ۱۱ص ۴۴)

اس دور میں کوفہ کے لوگوں کی پریشانی دوسروں سے زیادہ تھی، کیونکہ شیعیان علیؑ کی تعداد اس شہر میں زیادہ تھی اور معاویہ کی طرف سے زیاد بن ابیہ اس شہر کا گورنر تھا اور وہ شیعیان علیؑ کو اچھی طرح جانتا تھا، شیعیان علیؑ پر اس نے کیا کیا مظالم ڈھائے؟ تاریخ اس کی یوں نشاندہی کرتی ہے: ''فَقَتَلَھُمْ تَحْتَ کُلِّ حَجَرٍ وَّ مَدَرٍ وَّ اَخَافَھُمْ وَقَطَعَ الْاَیْدِیَ وَالْاَرْجُلَ وَسَمَلَ الْعُیُوْنَ وَصَلَبَھُمْ عَلٰی جُزُوْعِ النَّخْلِ وَطَرَّدَھُمْ وَشَرَّدَھُمْ عَنِ الْعِرَاقِ فَلَمْ یَبْقَ بِھَا مَعْرُوْفٌ مِّنْھُمْ'' زیاد بن ابیہ انہیں جہاں بھی پاتا قتل کردیتا، انہیں ہراساں کرتا، ان کے ہاتھ پاؤں کٹوادیتا انہیں ملک بدر کردیتا حتیٰ کہ کوفہ میں کوئی قابل ذکر شیعہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔

(شرح بن ابی الحدید جلد ۱۱ص ۴۲)

حضرت میثم تمار اور مولا علی علیہ السلام کے بہت سے دوستوں کے کوفہ میں سولی پر لٹکائے جانے کے واقعات ہماری مذکورہ بالا گفتگو کے گواہ ہیں۔

(ایضاً جلد ۲ص ۲۹۱)

نوٹ: اس سلسلے میں مزید تفصیل کیلئے ہم شرح بن ابی الحدید جلد ۲ص ۲۹۱ باب ''ذکر ما منی بہ ال البیت من الاذیٰ والاضطھاد'' کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ (شرح بن ابی الحدید جلد ۱۱ص ۴۳)

⑦ ...... ہنگام شب آپ کی تدفین

امام مظلوم کی مظلومیت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ آپؑ نے اپنی شہادت سے پہلے اپنے فرزند امام حسن مجتبیٰؑ کو وصیت فرمائی کہ:

''ثُمَّ غَیِّبْ قَبْرِیْ'' بیٹے! جب تم مجھے دفن کرلوتو میری قبر کو چھپادو۔

(بحار الانوار جلد ۴۲ص ۲۹۲)

ایک اور مقام پر امیر المومنین علیہ السلام کے غلاموں میں سے ایک غلام سے منقول ہے کہ جب ہم امیر المومنین علیہ السلام کی تدفین سے فارغ ہوکر آرہے تھے تو: ''فَلَحِقْنَا بِقَوْمٍ مِّنَ الشِّیْعَۃِ لَمْ یَشْھَدُوا الصَّلٰوۃَ عَلَیْہِ فَاَخْبَرْنَاھُمْ بِمَاجَرٰی وَبِاِکْرَامِ اللّٰہِ تَعَالٰی اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ''

حضرت علی علیہ السلام کے شیعوں کی ایک جماعت سے ملاقات ہوئی جو نماز جنازہ میں شریک نہیں ہوسکے تھے، ہم نے انہیں بتایا کہ آنجنابؑ کی شہادت سے لیکر تدفین تک کے عرصے میں اللہ تعالی نے انہیں کن کن کرامتوں سے نوازا؟ (یعنی وہ کرامتیں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میرے تابوت کو پیچھے سے اٹھانا اس کا اگلا حصہ جبرائیل ومیکائل اٹھائیں گے اور اسی طرح کی دوسری کرامتیں) ''فَقَالُوْا نُحِبُّ اَنْ نُّعَایِنَ مِنْ اَمْرِہٖ کَمَا عَایَنْتُمْ''

تو وہ کہنے لگے: وہ کچھ ہم بھی دیکھنا پسند کرتے ہیں، گویا وہ حضرت کی قبر مبارک کی زیارت کرنا چاہتے تھے، کہ وہ کہاں ہے؟

''فَقُلْنَالَهُمْ اِنَّ الْمَوَاضِعَ قَدْغُضِیَ اَثَرُهُ بِوَصِیَّةٍ مِّنْهُ''

ہم نے انہیں کہا: ''ہم نے امیر علیہ السلام کی وصیت کے مطابق آپ کی قبر کے نشان کو مٹا دیا ہے'' (بحار الانوار جلد۴۲ ص۲۱۷)

ایک روایت کے مطابق:

''دُفِنَ قَبْلَ طُلُوعِ الْفَجْرِ ''طلوع فجر سے پہلے آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

(بحار الانوار جلد۴۲ص۲۱۷)

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے:

آخر کیا وجہ ہے کہ آپ کو چپکے سے اور رات کی تاریکی میں دفن کیا گیا؟ آخر کیا وجہ ہے کہ آپکی تدفین کی خبر کسی کو نہیں دی گئی؟ جو ہستی کل تک مسلمانوں کی حاکم تھی، جو لوگوں کو نماز جمعہ پڑھاتی تھی، جو ان کے دکھوں اور دردوں کا مداوا کرتی تھی، جب اس دنیا سے خصت ہوئی تو بڑی خاموشی کے ساتھ آدھی رات کے وقت اسی جسد اطہر کو گنتی کے چند لوگوں کے ذریعہ سپرد خاک کیا گیا اور قبر کے نشانات مٹا دیئے گئے۔

کتابوں میں اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں:

دشمن کا اس قدر خوف تھا کہ مبادا کوئی آپ کے جسد اطہر کو قبر سے نکال کر اس کی بے حرمتی کرے، کوئی ایسی جسارت کرے جو قطعا کسی مسلمان سے روا نہیں چہ جائیکہ امیر المومنین کے ساتھ ہو، اسی لئے آپ کو خاموشی کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا، آنحضرتؑ کی قبر مبارک حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے توسط سے معلوم ہوئی۔

علیؑ اور اہل بیتؑ پر مظالم کے اسباب

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام، امامت اور اہلبیتؑ کے

بغیر مکمل نہیں ہے، کیونکہ ارشاد خداوندی ہے: ''یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِن رَّبِّکَ وَاِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ''یعنی اے رسولؐ! جو بات تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہے وہ (لوگوں تک) پہنچا دے اور اگر تم نے یہ کام نہ کیا تو اس کی رسالت کی تبلیغ نہیں کی (مائدہ/ ۶۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر امامت کے مسئلے کی تبلیغ نہ کی گئی تو خود رسالت کی تبلیغ نہ ہوئی، گویا اسلام، امامت کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت امام حسین علیہ السلام نے دیکھا کہ ان لوگوں نے امامت کے مسئلہ کا خاتمہ اور اہل بیتؑ کو گوشہ نشین کر دیا ہے، تو آپ نے فرمایا: ''مجھے اسلام خطرے میں نظر آتا ہے'' اس لئے کہ امامت کے بغیر اسلام ناقص بلکہ اسلام نہیں ہے، کیونکہ حضرت رسول خدا(ص) کی بھی تمام تر کوششیں یہی رہیں کہ اسلام اور قرآن و اہل بیتؑ ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں۔

حضور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت کے تیسرے سال آیت: ''وانذر عشیرتک الاقربین ''(شعراء/۲۱۴) کے نزول سے لیکر رحلت کے عرصے تک (مکمل بیس سال کی مدت میں) مختلف مواقع اور مناسبتوں کے تحت لوگوں کو مسلسل باور کراتے رہے کہ ''اسلام کا مستقبل اس وقت محفوظ اور بیمہ شدہ ہے جب لوگ اہل بیتؑ کے ساتھ رہیں گے''

انہوں نے اپنی دعوت کے روز اول ہی سے علی اور اہل بیتؑ عصمت اور امامت کا لوگوں کے سامنے اعلان کر دیا تھا اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور آپ نے اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے یہی فرمایا:

''اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِیْ اَهْلَ بَیْتِیْ مَااِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ ''میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں

چھوڑے جارہاہوں، ایک کتاب خدا (قرآن) اوردوسری میری عترت (اہل بیتؑ)
اگرتم ان دونوں کے دامن کومضبوطی سے تھامے رہوگےتو میرے بعد ہرگز گمراہ نہیں
ہوگے۔

(الغدیرجلداص۱۷۶،فضائل الخمسہ من الصحاح الستۃ جلد۲ص۵۲،بحارالانوا
رجلد۲ص۱)

یعنی اگرقرآن واہل بیتؑ دونوں سے تمسک رکھوگےتو گمراہ نہیں ہوگے
اورگراہل بیتؑ کوایک طرف کرکے صرف قرآن سے تمسک کادعویٰ کروگے
توہرگزہدایت نہیں پاؤگے۔

حضور پاک ﷺ نے ہی اسی چیز کوبیان فرمایا تھااور بات بالکل واضح تھی
کہ اگرلوگ اہل بیتؑ کاساتھ چھوڑ دیں گے اوراہل بیت کوگوشہ نشینی پر مجبور کردیں
گےتو اسلام اپنے راستے سے ہٹ جائے گا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ کام اب انجام پاچکا ہے، بہت
سے اقدامات ہوچکے ہیں، بڑی تعداد میں منصوبوں پرعمل ہوچکا ہے اورانجام کاراہل
بیت اطہار علیہم السلام کوگوشہ نشینی کی طرف دھکیلا جاچکا ہے، پیغمبر خدا نے بیس (۲۰)
سال تک محنت کی کہ لوگ اہل بیت اطہار کے نزدیک ہوجائیں، لیکن اس کے مقابلے
میں مخالفین نے پچاس سال تک سعی وکوشش کی کہ لوگوں کواہل بیت سے دور کردیا
جائے بالآخر یہ لوگ اپنی چالوں میں کامیاب ہوگئے۔

حضور پاک ﷺ کی ساری زندگی یہی کوشش رہی کہ لوگوں کوعلیؑ وفاطمہؑ اور
ان کی اولاد پاکؑ سے آشنا کیا جائے اورانہیں یہ سمجھایا جائے کہ وہ علیؑ وزہراؑ اوراہل
بیتؑ کے ساتھ تمسک کیے رہیں، مگرافسوس کہ آنحضرت کی رحلت کے ساتھ یہی منصوبہ
تیارکیا گیا کہ امہ کواہل بیت سے جدا کیا جائے ورانہوں نے ایسا کرکے بھی دکھایا۔

یہ توہماری اجمالی گفتگوتھی اب ذراتفصیل سے ان قدامات پرروشنی ڈالی
جاتی ہے۔

● پہلااقدام:

ابھی سرکاررسالتمآب ''صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کی آنکھیں بند بھی نہیں ہوئی
تھیں کہ: ''حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ'' کاشور مچادیا گیا کہ: ''ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے''
(الغدیرجلد۵ص۳۴۰)

یعنی پیغمبراکرمؐ بیس سال سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ: ''لوگو! قرآن واہل
بیتؑ (دونوں) کے ساتھ متمسک رہو'' لیکن ان لوگوں نے حضورؐ کی موجودگی
میں اورزندگی کے آخری لمحات میں کمال جسارت سے کہنا شروع کردیا کہ ''ہمیں
صرف کتاب اللہ کافی ہے'' گویا ہمیں اہل بیتؑ کی ضرورت نہیں۔

● دوسرااقدام:

لوگوں نے دیکھا کہ اس بیس سال کے عرصہ میں رسول خدا نے علی مولاؑ کی
شخصیت کے بارے میں بہت کچھ مطالب بیان فرمائے ہیں اورہوسکتا ہے کہ آنیوالی
نسلوں کیلئے یہ اوراس قسم کی کئی اور چیزیں یادگار کے طور پر باقی رہ جائیں، لہٰذا ایک
سرکاری فرمان (سرکلر) جاری کردیا گیا کہ: ''حدیث نویسی'' ممنوع ہے لہٰذا حدیث
کونہ لکھا جائے، ان کا بہانہ یہ تھا کہ ''اگراحادیث کوتحریر کیا جائے گا تو قرآن کے ساتھ
مخلوط ہوجائیں گی اور پتہ نہیں چل سکے گا کہ قرآن کیا ہے اورحدیث کیا ہے؟''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ جو باتیں نبی اکرمؐ نے
علیؑ اوراولاد علیؑ کے بارے میں ارشاد فرمائی ہیں وہ حیطۂ تحریر میں نہ لائی جائیں تاکہ
آنی والی نسلیں اس سے بہرہ مند نہ ہوسکیں، یہ اور بات ہے کہ خداوند عالم نے اس
کابندوبست کسی اورطریقے سے کرلیا اوراس شمع کوروشن رکھا اورآج تک روشن ہے

اور قیامت تک روشن رہے گی وہی مشہور و معروف جملہ کہ: "دشمنوں نے بغض اور حسد کی وجہ سے اور دوستوں نے تقیہ اور خوف کی بنا پر ان کے فضائل کو چھپائے رکھا لیکن اس کے باوجود آج بھی کتابیں ان کے فضائل سے چھلکتی نظر آتی ہیں"

(بحار الانوار جلد ۴۱ ص ۱۳۹ منقول از شرح نہج البلاغہ بن ابی الحدید)

● تیسرا اقدام:

چونکہ سرکار رسالتمآبؐ نے حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت اور فضائل کے بارے میں بہت کچھ ارشاد فرمایا تھا لہٰذا لوگوں نے ضروری سمجھ لیا کہ علیؑ کے مدمقابل کچھ شخصیتیں تراشی جائیں اور ان کے سامنے لا کھڑا کیا جائے، یعنی جہاں پر علیؑ کا نام آئے وہاں پر ان لوگوں کا نام لیا جائے اور وہ اس طریقے سے اس میدان میں آپہنچے یعنی اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علیؑ رسول اللہ (ص) کے خاص صحابی ہیں تو کہا جائے اس قسم کے اصحابِ پیغمبرؐ کی کوئی کمی نہیں ہے۔

حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تمہاری علمی پناہ گاہ علی بن ابی طالبؑ ہیں" لیکن اس صورت حال کو ایسا پیچیدہ بنا دیا کہ اگر عامۃ الناس کبھی سوال کرنا چاہیں تو کبھی علیؑ سے پوچھ لیں اور کبھی کسی اور سے تقریباً ہر ایک کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ دوسرے اصحاب کرام کی طرح علیؑ بھی ایک صحابی رسول ہیں، البتہ اس بات پر اصرار کیا گیا کہ زیادہ زور صحابی ہونے پر دیا جائے، جس سے لوگوں کو علیؑ کے مقابلے میں کھڑا کیا گیا اور یہی خطرناک صورت حال تھی، آپ جانتے ہیں کہ عوام الناس زیادہ بصیرت اور آگاہی سے بہرہ مند نہیں ہوتے۔

ایک مثال ملاحظہ فرمائیے، جس سال حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی شہادت واقع ہوئی اس سال کو "عام الفقہاء" یعنی فقہاء کی رحلت کا سال قرار دیا گیا، گویا یہ کہا گیا کہ اس سال چند فقہا رحلت فرما گئے، جن میں سے ایک حضرت امام

زین العابدینؑ بھی تھے، دوسرے فلاں، تیسرے فلاں اور چوتھے فلاں وغیرہ اور اس فضاء کو ہموار کیا گیا اور حضرت امام سجاد علیہ السلام کا تعارف دوسرے فقہاء (مجتہدین) کی طرح کرایا گیا، نا کہ آپ ان سے ایک اعلیٰ اور بالا اور امامِ معصومؑ ہیں۔

● چوتھا اقدام:

یہ ایسے اقدامات تھے جو مولا علی علیہ السلام کی خلافت سے پہلے انجام پا چکے تھے، جبکہ آپ کی خلافت کے پانچ سالہ دور میں فضا کو ایسا مکدر کیا گیا اور آپ کو جنگوں سے اس قدر دوچار کیا گیا کہ آپ کسی بھی قسم کی اصلاح نہ کر سکے اور نہ ہی اپنا صحیح تعارف کرا سکے۔

اگر آپ دیکھتے ہیں کہ تیسری خلافت کے بعد لوگ آپ کے دروازے پر آجھکے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ علیؑ کے شیعہ تھے اور ہماری طرح مولا کی معرفت کے حامل تھے، بلکہ آپکے پاس اس خیال سے آئے کہ آپ بھی پہلے، دوسرے اور تیسرے کی طرح ایک چوتھے خلیفہ ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ سابقہ ادوار میں پیدا ہونے والی کسی خرابی کی اصلاح کرنا چاہتے تو لوگ شور مچانا شروع کر دیتے اور آپ کو اس کی اصلاح نہیں کرنے دیتے تھے۔

یعنی ان پانچ برسوں میں وہ حضرت علی علیہ السلام کی اتباع اہل بیتؑ پیغمبرؐ کے عنوان سے نہیں، بلکہ سابقہ خلفاء کی مانند اور ایک خلیفہ کی مانند ایک خلیفہ کی حیثیت سے کیا کرتے تھے، البتہ اس دورانیہ کی برکتیں بہت زیادہ ہیں جن میں سے ایک نہج البلاغہ بھی ہے اور شاید بیشتر علمی مطالب جو مولا علیؑ کی جانب سے ہمارے لئے یادگار کے طور پر موجود ہیں اسی دورانئے کے ہیں۔

● پانچواں اقدام:

امیر شام نے ایک فرمان نامہ کے ذریعہ سرکاری طور پر اعلان کر دیا کہ "کسی

کوحق حاصل نہیں کہ علی علیہ السلام کے فضائل میں سے کسی بھی فضیلت کو بیان کرے''

غور فرمایا آپ نے سابقہ لوگوں نے کہا تھا کہ: ''نہ لکھو'' اور یہ نہیں کہا تھا کہ ''نقل نہ کرو''، لیکن اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کہا کہ کسی کو حق حاصل نہیں کہ فضائل علیؑ میں سے کوئی بھی فضیلت بیان کرے یا نقل کرے، اس نے اپنے اقتدار کے زعم میں ایک اور قدم آگے بڑھا دیا جو کارگر بھی ثابت ہوا۔

● **چھٹا اقدام:**

امیر شام نے ایک اور سرکلر جاری کیا کہ ''دوسرے خلفاء کے حق میں بھی فضائل تیار کرو اور لوگوں میں پھیلاؤ''، یعنی پہلے کہا کہ علیؑ کی کوئی فضیلت بیان نہ کی جائے بعد میں کہا دوسروں کے فضائل کو خوب پھیلایا جائے، چنانچہ جن لوگوں کے نزدیک دین کی کوئی اہمیت نہیں تھی ان کا دین ''دنیا اور پیسہ'' تھا ان کے نزدیک ''کیسا خدا کیسا نبی، پیسہ خدا پیسہ نبی'' تھا وہ دھڑا دھڑ حدیثیں جعل کرنے لگے، حتیٰ کہ خود امیر شام کی شان میں بھی جعلی حدیثیں گھڑی گئیں اور اس حد تک ان ''احادیث'' کا انبار لگ گیا کہ خود امیر شام نے سمجھ لیا کہ یہ تو اب رسوائی کا موجب ہوگا لہٰذا ایک سرکلر جاری کیا: ''بس اب اتنا ہی کافی ہے''

● **ساتواں اقدام:**

سابقہ دور میں کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کے خلاف کوئی بات کہہ سکیں، کسی کو حضرت امیر علیہ السلام اور حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے خلاف بات کرنے کی کوئی جرأت نہیں تھی۔

خلیفہ ثانی حضرت عمر سے بارہا حتیٰ کہ ستر مرتبہ مختلف مواقع پر یہ سنا گیا: ''لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَکَ عُمَر'' اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو چکا ہوتا، باوجودیکہ علی علیہ السلام کو تخت خلافت سے محروم کئے ہوئے تھے مگر ان کی شخصیت کے قائل تھے اور

ان کی تعریف و تمجید کیا کرتے تھے۔

لیکن یہ ''شرف'' صرف معاویہ کو حاصل ہے کہ انہی کے ''زریں دور'' میں اہلبیت علیہم السلام کے خلاف پروپیگنڈا نہ صرف شروع ہوا بلکہ اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا، نوبت یہاں تک جا پہنچی تھی کہ جب دربار شام میں یہ خبر پہنچی کہ ''علیؑ'' کو محراب مسجد میں شہید کر دیا گیا ہے تو لوگ تعجب سے پوچھنے لگے کہ ''علیؑ نماز بھی پڑھتے تھے؟!!''

اگر ہم کہیں پر یہ پڑھتے ہیں یا کسی سے سنتے ہیں کہ: ''حضرت امام حسن علیہ السلام کے جنازہ کے پیچھے پیچھے ان کی ڈھائی سو یا تین سو بیویاں چل رہی تھیں'' تو یہ سب اسی مسموم پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے جو اہل بیت اطہار علیہم السلام کے خلاف چلایا گیا اور یہ پروپیگنڈہ اس قدر موثر تھا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے دس سالہ دور امامت ___ یعنی سن ۵۰ھ تا سن ۶۰ھ ___ میں ایک بھی شخص آپ کو امام سمجھ کر آپ کے پاس نہیں آیا، وہی حسینؑ ہیں جن کے متعلق رسول گرامی نے اس قدر تاکید فرمائی تھی بالفرض اگر انہیں امام نہ مانتے مگر حدیث کی رو سے تو کم از کم اپنے دینی مطالب کے حصول کیلئے ان کی طرف رجوع کرتے، مگر نہ ایسا کسی نے نہیں کیا۔

علامہ طباطبائی علیہ الرحمہ اپنے ایک کتابچہ میں جو انہوں نے علم امام کے بارے میں تحریر کیا ہے، لکھتے ہیں: ''میں نے کتاب وسائل الشیعہ کے پورے سیٹ کا اول سے آخر تک مطالعہ کیا ہے ___ یاد رہے کہ وسائل الشیعہ ۳۵ ہزار فقہی احادیث پر مشتمل ہے ___ لیکن ان ۳۵ ہزار میں، میں نے کہیں نہیں دیکھا کہ ''کسی نے امام حسینؑ کے دس سالہ دور امامت میں ان سے سوال کیا ہو اور کوئی دینی مسئلہ پوچھا ہو'' اس سے اہل بیت علیہم السلام کی مظلومیت اور گوشہ نشینی کا پتہ چلتا ہے''

اگر اہل بیت اطہارؑ ایک طرف ہو جائیں، اگر خدا، صفات خداوندی، رسول

خدا، اور باقی انبیاء کا تعارف اہل بیت نہ کراتے اور اس خاندان عصمت وطہارت سے
فقہ ومعارف نہ ہوتے تو پھر ہمارے پاس کیا ہوتا؟

جو لوگ اہل بیتؑ کے ساتھ نہیں تھے اور نہ ہیں، دیکھئے خدا کے بارے
میں وہ کیا کہتے ہیں، یقین جانئے کہ آج بھی ہیں وہ لوگ جو خدا کے جسم کے قائل ہیں،
___اس وقت ہمارے سامنے خادم الحرمین الشریفین کی طرف سے تحفہ کے طور پر حجاج
کرام کو دیا جانے والا مترجم قرآن مجید ہے جس کا ترجمہ اور تفسیر مولانا محمد جونا گڑھی اور
مولانا صلاح الدین یوسف نے تحریر کئے ہیں، جبکہ نظر ثانی کا کام ڈاکٹر وصی اللہ بن
محمد عباس اور ڈاکٹر اختر لقمان نے انجام دیا ہے اور سال 2005-06ء کے موقع
پر حجاج کرام کو تحفہ کے طور پر دیا گیا ہے، اس کے صفحہ نمبر ۱۴۶۸ میں تحریر ہے: ''آگ
میں لوگ ڈالے جائیں گے اور جہنم کہے گی ''ہل من مزید'' کیا کوئی اور بھی ہیں؟ حتیٰ
کہ اللہ تعالیٰ جہنم میں اپنا پاؤں رکھ دے گا جس سے جہنم پکار اٹھے گی ''قط قط'' بس
بس'' (صحیح بخاری تفسیر سورہ ق)......(سیری در صحیحین ص ۳۳۵)

یہ سب کچھ اہل بیتؑ سے دوری کا نتیجہ ہے اور یہ جو حضرت امام محمد باقر علیہ
السلام فرماتے ہیں: ''مشرق سے لیکر مغرب تک کہیں بھی چلے جاؤ صحیح علم صرف اور
صرف ہمارے ہی گھرانے سے ملے گا'' بے جا نہیں ہے (بحار الانوار جلد ۴۶ ص ۳۳۵)
یہ بالکل حقیقت ہے اور اس میں ذرا برابر شک کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ یہی گھرانہ ہی
تو ہے جس کو وحی الٰہی سے سروکار رہا ہے اور آیت تطہیر نے اس کی ضمانت دی ہے یہ
خاندان ہر قسم کی غلطی اور شائبہ سے پاک اور مبرا ہے، رہے دوسرے لوگ، تو ان کے
پاس کوئی ضمانت نہیں ہے اور نہ ہی ان پر اعتماد اور اطمینان کیا جاسکتا ہے۔
(از افادات حضرت آیت اللہ استادی دامت برکاتہ۔قم)

ملکی انتشار اور اس کے اسباب

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کی ابھی تکمیل بھی نہیں ہوئی تھی کہ تخریبی
کارروائیاں شروع ہوگئیں اور آپ کے گرد وپیش سازشوں کا ایک جال بُن دیا گیا، ہر
طرف فتنے اُٹھ کھڑے ہوئے، ایک فتنے کو کچلا جاتا تو دوسرا فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا، اسے
دبایا جاتا تو کسی اور گوشے سے نیا فتنہ ابھر آتا۔ یہاں تک کہ آپ کا مختصر دور حکومت
انہیں الجھنوں کو سلجھانے اور نت نئے فتنوں کو فرو کرنے میں گزر گیا۔

ان فتنوں اور پیہم خانہ جنگیوں کی بنا پر کچھ لوگوں نے یہ رائے قائم کرلی ہے
کہ یہ شورش و بدنظمی سیاسی کمزوری کا نتیجہ تھی اور امیر المومنین اصول سیاست سے
ناواقف اور ملکی نظم ونسق کے قیام سے قاصر تھے۔ بیشک امیر المومنینؑ کا دور خانہ جنگی اور
ہنگامہ آرائی کی جولانگاہ بنا رہا اور باہم آویزیوں کی وجہ سے ملکی حدود میں توسیع نہ ہوسکی،
مگر اس انتشار و پراگندگی کی وجہ سیاسی کمزوری نہ تھی بلکہ یہ نتیجہ تھا ان ناگوار حالات کا
جن کی داغ بیل سابقہ حکومتوں میں پڑ چکی تھی اور اب وہ اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے،
واقعات شاہد ہیں کہ دولت کی فراوانی اقتدار کی محرک ہوتی ہے، چنانچہ فتوحات کے
نتیجہ میں حاصل ہونے والے اموال غنیمت نے ذہنوں کے رخ خلافت سے ملوکیت
کی طرف موڑ دیئے اور ہوس جاہ واقتدار نے پوری فضا کو مسموم کر کے رکھ دیا اور کوئی
گوشہ بھی باقی نہ چھوڑا۔

اگر یہی حالات کسی اور مدبر وسیاست اندیش کو پیش آتے تو وہ ان ناگزیر
نتائج سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکتا، جن کے نتائج سے آپ دوچار ہوئے تھے، بلکہ
بعید نہ تھا کہ دشمن کی ستیزہ کاریوں کا مقابلہ نہ کرسکتا اور اس کی طوفانی یلغاروں کے آگے
سپر انداختہ ہوجاتا۔

ایمانِ مجسم، امام معظم امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام مسندِ خلافت پر اس
وقت بیٹھے جب مدینہ شورشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، اطراف و جوانب اور دوسرے
علاقوں سے انقلاب پسند سمٹ کر مدینہ میں جمع تھے، سابقہ عمال، حکومت کے خلاف
ریشہ دوانیاں کر رہے تھے۔ معاویہ شام میں خودمختاری کے خواہاں تھے، زبیر کوفہ میں اور
طلحہ بصرہ میں اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان سب نے آپس میں گٹھ جوڑ کر کے ہر موڑ
اور ہر دوراہے پر رکاوٹیں کھڑی کیں۔ لشکر کشی کر کے دعوت مبارزت دی اور جنگ
کے شعلے بھڑکا کر ملکی امن وامان کو تباہ کرنے کی ٹھان لی۔

یہ امیر المومنین علیہ السلام کے سیاسی فہم وتدبر اور سوجھ بوجھ کا نتیجہ تھا کہ فرائض نظم و
نسق کی انجام دہی کے ساتھ ان بغاوتوں کو بھی کچلتے رہے۔ حالانکہ جو لوگ آپ کے
پرچم کے نیچے جمع تھے ان میں اکثریت نہ ہم رنگ و ہم آہنگ تھی اور نہ اسے حضرت
سے خلوص ہی تھا۔ ان مختلف الآراء لوگوں کے خیالات ونظریات میں ہم آہنگی پیدا
کر کے انہیں ایک وحدت بنانا اور انہیں لے کر دشمن کی دل بادل فوجوں سے ٹکرا جانا
آسان مرحلہ نہیں تھا، مگر حضرت انہی مختلف عناصر کو لے کر دشمن سے نبرد آزما ہوئے اور
اسے شکست دی۔ شامیوں کی شکست بھی یقینی تھی، اگر وہ حیلہ وفریب سے حضرت کے
لشکر میں پھوٹ نہ ڈلواتے، ان معرکوں اور صف آرائیوں کے باوجود حضرت نے جس
حد تک ملکی اصلاحات کیں، نظم وانضباط قائم کیا اور رعایا کے فلاحی امور پر نظر رکھی۔ وہ
آپ کی عظیم سیاسی بصیرت اور نظم ونسق کی اہلیت کا روشن ثبوت ہے، ابن ابی الحدید نے
اپنی کتاب شرح نہج البلاغہ جلد ۲ ص ۱۸۴ میں تحریر کیا ہے: ''ہماری جماعت کے بعض
متکلمین کا قول ہے کہ اگر کوئی انصاف پسند علی علیہ السلام کی سیاست پر نظرِ غائر ڈالے
اور یہ دیکھے کہ آپ اپنے اصحاب کے ہاتھوں کس صورت حال سے دوچار تھے، تو
معاملات کی سختی اور پیچیدگی کی بنا پر آپ کی سیاست ایک معجزہ سے کم نہ ہوگی''

اس ذہنی تبدیلی کے علاوہ چند اور اسباب وعوامل بھی ملکی انتشار و پراگندگی
میں کارفرما تھے:

پہلا سبب: یہ تھا کہ حضرت علیؑ کی سیاست خالص اسلامی سیاست تھی، آپ
کسی صورت میں اخلاقی اور اسلامی حکومت کو اقتدار پر قربان کرنے کے لیے تیار نہ تھے،
چہ جائیکہ حیلہ گری اور دنیا سازی سے کام لے کر اقتدار کے استحکام کی فکر کرتے یا دورخی
سیاست اور چکنی چپڑی باتوں سے اپنا مقصد نکالتے، اگر آپؑ بھی وہی طریقہ اختیار
کرتے جو مخالفین نے دیانت کے تقاضوں سے منہ موڑ کر اختیار کیا تھا تو جہاں آپ کو
بظاہر ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا وہاں آپ کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہوتے۔ مگر
اس صورت حال میں آپ کی اسلامی حکومت، ملوکیت قرار پاتی اور خلافت الٰہیہ کا عملی
نمونہ نہ ہوتی کہ جس میں نہ مکر وفریب کی گنجائش ہے اور نہ عوام فریبی کا دخل ہے، ظاہر
ہے جہاں ایک طرف اخلاقی آئین اور دینی ضوابط کی پابندیاں راستہ روکے کھڑی
ہوں اور دوسری طرف ہر قسم کے مکر وفریب اور الزام تراشی میں باک محسوس نہ کیا جاتا
ہو وہاں چیخ چیخ کر گلا، پھاڑ پھاڑ کر فتنہ وشر کو ہوا دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مخالفین نے یہ
سمجھتے ہوئے کہ علی علیہ السلام اپنے مسلمہ اصولوں میں لچک پیدا نہ ہونے دیں گے،
آپؑ کے خلاف ہر طرح کے سیاسی حربوں سے کام لیا اور آپ کی صاف دلی سے پورا
فائدہ اٹھایا، احمد حسن زیّات نے اپنی کتاب ''ادب العربی'' ص ۱۷۴ میں تحریر کیا ہے
کہ: ''حضرت علیؑ دینی معاملات میں لچک اور دنیوی امور میں زمانہ سازی سے آشنا ہی
نہیں تھے، آپ کے یہی بلند عادات واطوار وہ تھے، جن سے ''چالاک لوگوں'' نے فضا
کو آپ کے خلاف کرنے میں مدد لی۔

دوسرا سبب: یہ تھا کہ حضرت، خواص کی دلجوئی کے لیے عوام کو نظر انداز
کرنا گوارا نہ کرتے تھے، بلکہ ہمیشہ ان کے مفاد کو خواص اور سربرآوردہ افراد کے

مفادات پر ترجیح دیتے تھے اور اپنے عمال کو بھی یہی ہدایت فرماتے تھے۔ چنانچہ مالک اشتر کو تحریر فرمایا: ''تمہیں سب طریقوں سے زیادہ وہ طریقہ پسند ہونا چاہیے جو حق کے اعتبار سے بہترین، انصاف کے لحاظ سے سب کو شامل اور رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کی رضا مندی کے مطابق ہو، کیونکہ عوام کی رضا مندی خواص کی ناراضگی کو بے اثر بنا دیتی ہے اور خواص کی ناراضگی عوام کی رضا مندی کے ہوتے ہوئے نظر انداز کی جاسکتی ہے'' یہ طرزِ عمل جاہ طلب اور اقتدار پسند طبیعتوں پر شاق گزرا اور انہوں نے اپنا تفوق اور امتیاز برقرار رکھنا چاہا اور جب انہیں معاشرہ میں اپنا مقام حاصل ہوتا ہوا نظر نہ آیا تو نظم ونسق کو درہم برہم کرنے در پے ہوگئے اور عوام کو اپنے انقلاب آفرین نعروں سے متاثر کر کے ہنگامہ وشورش پر اتر آئے تاکہ ان کی بالا دستی اور امتیازی حیثیت برقرار رہے۔

تیسرا سبب: یہ تھا کہ حضرت مساویانہ تقسیم کے اصول پر کاربند تھے اور اعلیٰ وادنیٰ اور عرب وعجم کی تفریق کے قائل نہ تھے، اس سے اگرچہ عوام اور موالی واعجام کا طبقہ خوش ہوگیا مگر امتیاز پسند لوگوں کے دلوں میں گرہ پڑ گئی، وہ جس طرزِ عمل کے خوگر ہو چکے تھے اس کے خلاف کسی روش کو پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ وہ اس پر سیخ پا ہوئے، پرزور احتجاج کیا اور جب ان کی آواز موثر ثابت نہ ہوئی تو شام کا رخ کر لیا جہاں حضرت امیرؑ کے خلاف سازشیں تیار کی جارہی تھیں۔

بحارالانوار جلد۹ ص۵۳۹ میں ہے فضیل بن جعدہ کہتے ہیں:

''امیر المومنینؑ سے عرب کی روگردانی کا اصل سبب ''مال'' تھا، آپ اعلیٰ کو ادنی پر اور عربی کو عجمی پر ترجیح نہ دیتے اور نہ دیگر حکمرانوں کی طرح امراء وسرداران قبائل کی آؤ بھگت کرتے تھے اور نہ کسی کو اپنی طرف مائل کرتے تھے جبکہ فریق مخالف کی روش اس کے برعکس تھی، اسی لیے لوگ علی علیہ السلام کو چھوڑ کر مخالف گروہ سے جا ملے''

جب امیر المومنین علیہ السلام سے کہا گیا کہ جن لوگوں سے فتنہ برپا کرنے کا اندیشہ ہے یا مخالف گروہ میں چلے جانے کا خطرہ ہے انہیں کچھ دے کر روک لیں، چنانچہ کتاب المناقب جلد۲ ص۳۳ میں ہے، آپؑ نے فرمایا: کیا تم مجھے اس امر کا پابند کرنا چاہتے ہو کہ بے راہ روی سے کچھ لوگوں کی امداد حاصل کروں تو خدا کی قسم جب تک سورج نکلتا اور ستارہ آسمان پر چمکتا رہے گا میں ایسا نہیں کروں گا، اگر مسلمانوں کا مال میرا ذاتی مال ہوتا تو بھی میں اسے سب میں برابر تقسیم کرتا رہوں گا، چہ جائیکہ یہ تو ہے ہی انہی کا''

امیر المومنین علیہ السلام کی اس سیرت وروش کے مقابلے میں فریق مخالف کا طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ سیاسی مقصد کی برآری کے لیے بے دریغ دولت لٹاتے اور خزانوں کے منہ کھول کر لوگوں کے دین وایمان کا سودا کرتے تھے، چنانچہ تاریخ کامل ج۳ ص۲۳۱ میں ہے:

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ جاریہ بن قدامہ، احنف بن قیس، جون بن قتادہ اور حتات مجاشعی امیر شام کے پاس آئے، تو انہوں نے حتات کو ستر ہزار درہم اور دوسروں کو ایک ایک لاکھ درہم دیئے، حتات کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے ان سے کہا: تم نے مجھے میرے قبیلے میں رسوا کرنے کا سامان کیا ہے، اوروں کو ایک ایک لاکھ اور مجھے ستر ہزار درہم دیئے ہیں، تو انہوں نے کہا: ''اِنِّی اشْتَرَیْتُ مِنَ الْقَوْمِ دِیْنَهُمْ'' میں نے ان لوگوں سے اُن کا دین خرید کیا ہے۔ تو حتات نے کہا: میرا بھی دین خرید لیجئے۔

اب جہاں یہ صورت ہو کہ درہم و دینار کے بدلے دین وایمان کا کھلم کھلا سودا ہوتا ہو اور لوگ روپے پیسے کے عوض دین بیچنے پر آمادہ ہو جاتے ہوں تو وہاں پر یہ توقع کیونکر کی جاسکتی تھی کہ امیر المومنینؑ کی محتاط روش انہیں خوش رکھ سکے گی اور مال ودولت کو ٹھکرا کر محض دینی جذبہ کے زیر اثر حق سے وابستہ رہیں گے۔

چوتھا سبب: یہ تھا کہ وہ امور جو خلاف شریعت ہوتے ہوئے شرعی صورت اختیار کر چکے تھے اور دین کا جزو سمجھے جا رہے تھے حضرت اپنی منصبی ذمہ داری کی بنا پر انہیں

شرعی جواز دینے کے لیے تیار نہ تھے اور عوام کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ جو چیزیں اُن کے ذہنوں میں اتر جاتی ہیں، ان سے دستبردار ہونا گوارا نہیں کرتے اور نہ اس کے خلاف کوئی بات سننا چاہتے ہیں چنانچہ شرح ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۱۸۴ میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرتؑ نے منبر پر کوئی بات کہہ دی تو عبیدہ السلمانی نے کھڑے ہو کر صاف کہہ دیا: ''آپ ایک اکیلے کی رائے سے ہمیں آپ کی وہ رائے زیادہ پسند ہے جو جماعت کی رائے کے موافق ہو''

اس اختلاف رائے نے بھی انتشار کے اسباب فراہم کیے اور لوگ ایسی بات کو جو ان کے پہلے طرزِ عمل کے خلاف ہوتی لے اڑے لوگوں میں بدظنی پیدا کر کے فتنہ و شر کو پھیلاتے۔

پانچواں سبب: یہ تھا کہ حضرت نے برسرِ اقتدار آتے ہی ان تمام عمال و حکام کی برطرفی کا اعلان کر دیا جو سابقہ حکومتوں کی طرف سے متعین تھے، اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ ان عمال نے ان لوگوں سے جو عہدوں کے امیدوار تھے اور کامیاب نہ ہو سکے تھے گٹھ جوڑ کر کے حضرت عثمان کے خون کے قصاص کی تحریک چلائی اور امیر المومنین علیہ السلام کے خلاف محاذ جنگ قائم کر کے ملکی نظم و نسق کو تباہ کرنے میں بھر پور حصہ لیا۔

ان تمام محرکات، فتنہ و انتشار کے باوجود حضرتؑ نے جس حد تک ملکی حالات کو بگڑنے سے بچایا وہ صرف آپ کی سیاسی بصیرت، معاملہ فہمی اور حسن تدبر کا نتیجہ تھا، ورنہ شورش پسندوں نے تفرقہ و انتشار پھیلانے اور ملکی نظم کو درہم برہم کرنے میں کون سی کسر اٹھا رکھی تھی؟

جنگِ جمل

جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ عنان اقتدار سنبھالتے ہی

امیر المومنین علیہ السلام نے سب سے پہلا جو کام کیا وہ یہ کہ مملکت کے صوبوں پر سابقہ حکومت کے عمال و حکام کو برطرف کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی حکومت کو کمزور کرنے کے لیے ان برطرف اور معزول افراد نے قاتلینِ عثمان سے قصاص کے مطالبہ کے نام پر بصرہ کے مقام پر جنگ شروع کر دی جو تاریخ اسلام میں ''جنگِ جمل'' کے نام سے مشہور ہے اور یہ وہ بلاخیز اور ہلاکت آفرین جنگ ہے جو امیر المومنین علیہ السلام کے اوائل عہد حکومت میں ''خونِ عثمان'' کے نام پر لڑی گئی، اس خون ریز جنگ کے نتائج و عواقب اور تفریق بین المسلمین کی ذمہ داری بڑی حد تک ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو حضرت عثمان کی زندگی میں ان کی مخالفت میں پیش پیش اور لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکاتے تھے اور حضرت رسالت مآبؐ کے نعلین اور پیراہن مبارک کو ان کے سامنے رکھ کر برملا کہتے تھے کہ ابھی یہ چیزیں کہنہ بھی نہیں ہو پائیں کہ تم نے رسول خدا (ص) کے دین اور ان کے سنن و احکام کو سرے سے بدل کر رکھ دیا ہے۔

ایسے لوگ عوامی مزاج کے سمجھنے میں کافی درک رکھتے تھے، انہوں نے عوام کے جذبات بھڑکانے کا وہ طریقہ اختیار کیا جو موثر ترین ہو سکتا تھا، وہ سمجھتے تھے کہ لوگ پیغمبر اسلامؐ سے والہانہ عقیدت کی بنا پر آپؐ کے جسم مبارک سے مس ہونے والے آثار کو دیکھنے کی انتہائی تڑپ رکھتے ہیں اور جب یہ چیزیں ان کی نگاہوں کے سامنے آئیں گی تو ان میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ان چیزوں کو دیکھتے ہی لوگوں کے دلوں میں غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے قصرِ خلافت کے گرد گھیرا ڈال لیا اور وہ خود راہی مکہ ہو گئے اور وہاں پر بیٹھ کر نتائج کا انتظار کرنے لگے۔ چنانچہ اسی اثنا میں مدینہ سے اخضر نامی ایک شخص آیا، اس سے پوچھا گیا کہ مدینہ کی شورش انگیزی کا نتیجہ کیا ہوا، اس نے کہا: ''خلیفہ نے مصر کے بلوائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور ہنگامہ و شورش پر قابو پا لیا ہے'' تاریخ طبری کے مطابق

انہوں نے تاسف آمیز لہجہ میں کہا: ''انا للہ و انا الیہ راجعون'' کیا ان لوگوں کو قتل کر ڈالا ہے جو اپنا حق مانگنے اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے آئے تھے، خدا کی قسم ہم اس پر راضی نہیں ہیں۔

ابھی وہ افسردگی اور دل شکستگی کی حالت میں تھے ہی کہ ایک دوسرے شخص نے آکر بتایا کہ اخضر کی دی ہوئی خبر غلط ہے، مصریوں میں سے کوئی نہیں مارا گیا وہ مدینہ میں کھلے بندوں دندناتے پھر رہے ہیں، بلکہ خلیفہ ان کے ہاتھوں مارے گئے ہیں، یہ سن کر انہیں ایک طرح کا اطمینان ہوگیا۔ شرح ابن ابی الحدید جلد۲ ص ۷۷ میں ہے: انہوں نے کہا: ''یہ اس کے کرتوتوں کا نتیجہ ہے اور خدا تو اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا''

چنانچہ اب مکہ میں قیام کے بجائے مدینہ میں جانا ان کے لیے ضروری ہوگیا، تاکہ اپنے اثر و نفوذ سے مخالف آرا کو دبا کر جسے برسرِ اقتدار لانا چاہتے تھے اس کے لیے فضا کو سازگار بنائیں، چنانچہ فوراً سفر کا ساز و سامان کیا اور مدینہ روانہ ہوگئے، ابھی مکہ سے چھ میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ مقام ''سرف'' پر ''عبید بن ابی سلمہ'' سے ملاقات ہوگئی، اس سے خلیفہ اور مدینہ کی سیاسی کیفیت کے بارے دریافت کیا: اس نے کہا: خلیفہ مارے گئے ہیں! پوچھا: ''پھر کیا ہوا؟'' اس نے کہا: اہلِ مدینہ نے حضرت علیؑ کی بیعت کر لی ہے۔

انہوں نے سننے کے لیے تو سن لیا مگر زمین پیروں تلے سے کھسکتی اور آسمان دھواں بن کر اڑتا نظر آنے لگا۔ کانوں کو یقین نہیں آیا تو پھر پوچھا: کیا علیؑ کی بیعت ہوگئی ہے؟ کہا: ہاں! علیؑ کی بیعت ہو چکی ہے اور ان کے علاوہ ان سے زیادہ اس مسند پر بیٹھنے کا سزاوار تھا بھی کون؟ اب ان لوگوں کے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا اور تاریخ کامل بن اثیر جلد۳ ص ۱۰۵ کے مطابق ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا:

اگر علیؑ کی بیعت ہوگئی ہے تو کاش یہ آسمان زمین پر پھٹ پڑے اب ہمیں مکہ کو واپس جانا چاہیے، چنانچہ انہی قدموں پر مکہ کا رخ کر لیا اور خلیفہ کے قتل پر اپنے رنج و غم کا افسوس کرتے ہوئے کہا: جیسا کہ اسی صفحہ پر ہے کہا: ''خدا کی قسم! خلیفہ مظلوم مارے گئے ہیں، خدا کی قسم ان کے خون کا انتقام لے کر رہیں گے۔''

عبید بن ابی سلمہ اس فوری انقلاب اور متضاد طرزِ عمل کو دیکھ کر حیرت میں کھو گیا اور آگے بڑھ کر کہا: آپ ہی تو بار بار اور اعلانیہ ان کے خلاف باتیں کیا کرتے تھے اور اب ایک دم میں آپ لوگوں کی رائے میں تبدیلی کیسے آگئی؟ کہا: ہم پہلے یہی کہا کرتے تھے۔ مگر انہوں نے آخر وقت میں توبہ کر لی تھی اب ہماری یہ رائے پہلی رائے سے زیادہ مناسب ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ جب ان سے تبدیلی کا کوئی معقول عذر نہ بن سکا تو توبہ کی بات بنائی اور لے دے کے یہی ایک بات تو بنائی جاسکتی تھی، مگر اس سے عبید بن ابی سلمہ کو مطمئن نہ کر سکے، چنانچہ عبید نے صاف صاف کہہ دیا: ''قسم بخدا! یہ تو بہت ہی بودا عذر ہے''

بہر حال وہ اب جلد سے جلد مکہ پہنچنا چاہتے تھے، انہوں نے عبید کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور آگے بڑھ گئے۔ جب مکہ واپس آگئے تو لوگوں نے کہا: ''ابھی ابھی تو آپ روانہ ہوئے تھے کہ پلٹ کر بھی آگئے؟'' کہا: خلیفہ بے گناہ مارے گئے ہیں' ان کا خون رائیگاں نہیں جانے دیں گے اور اس وقت تک واپس نہیں آئیں گے جب تک ان کے خون کا انتقام نہ لے لیں۔

چنانچہ ان لوگوں نے یہاں آکر خلیفہ کی مظلومیت کا ڈھنڈورہ پیٹ کر حضرت علیؑ کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کر لیا۔ جب مدینہ میں موجود کچھ لوگوں کو معلوم ہوا کہ مکہ میں حضرت علیؑ کے خلاف ایک محاذ کھل چکا ہے تو انہوں نے ان کے نام ایک زوردار خط لکھا کہ ''وہ لوگوں کو خلیفہ کی مظلومیت اور ان کے بے گناہ مارے

جانے کا یقین دلا کر انتقام کی تحریک چلائیں اور جس طرح بن پڑے انہیں علیؑ کی بیعت سے روکیں'' اس قسم کے پیغامات نے ان کے ارادے کو اور تقویت دی اور انہوں نے پورے جوش خروش سے اور زور وشور کے ساتھ ''قصاص'' کے نام پر لوگوں کو دعوت دینا شروع کر دی۔ پہلے عبداللہ بن عامر حضرمی نے جو خلیفہ کی طرف سے مکہ کا والی تھا اس آواز پر لبیک کہی اور سعید بن عاص، ولید بن عقبہ اور دیگر اموی ان کے ہمنوا بن کر کھڑے ہو گئے۔

ادھر مدینہ میں کچھ لوگ تھے جو قصاص کی آڑ میں ہنگامہ کھڑا کر کے اپنی محرومی و ناکامی کا بدلہ لینا چاہتے تھے، لیکن مدینہ کی فضا اس ہنگامہ آرائی کے لیے سازگار نہ تھی، کیونکہ قتل کے سلسلے میں اہلِ مدینہ کا کردار دیکھے ہوئے تھے جس کے بعد اس کی کوئی صورت نہ تھی کہ وہ انتقام کے نام پر انہیں اپنے گرد جمع کر لینے میں کامیاب ہو جاتے، البتہ مکہ میں یہ تحریک کامیاب ہو سکتی تھی، کیونکہ وہاں پر کچھ مشہور لوگ اور بنی امیہ کے افراد جمع ہو چکے تھے اور لوگوں کو حضرت علی علیہ السلام کے خلاف کرنے میں پیہم مصروف تھے اور ایک طبقہ کو اپنا ہمنوا بنا بھی چکے تھے، چنانچہ اُن لوگوں نے چار مہینے جوں توں کر کے مدینہ میں گزارے اور پھر اپنی مہم کی تکمیل کے لیے مکہ جانے کا فیصلہ کر لیا اور حضرت علیؑ سے کہا کہ: ہمارا ارادہ عمرہ کا ہے ہمیں مکہ جانے کی اجازت دی جائے۔ امام علیہ السلام ان کے تیوروں کو دیکھ کر سمجھ رہے تھے کہ وہ بیعت کی پابندیوں سے آزاد ہو کر مکہ کو اپنی جولانیوں کا مرکز بنانا چاہتے ہیں، چنانچہ تاریخ یعقوبی جلد۲ ص۱۵۶ میں ہے کہ آپ نے فرمایا: واللہ! ان کا ارادہ ''عمرہ'' کا نہیں ہے، بلکہ غدر و فریب پر اتر آئے ہیں۔

امیر المومنینؑ مکہ جانے کا خیال ان کے ذہنوں سے نکال دینا چاہتے تھے مگر یہ خیال ان کے ذہنوں سے نہ نکلا اور وہ برابر اصرار کرتے رہے، آخر کار حضرت نے

ان سے دوبارہ بیعت لے کر انہیں مکہ جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ انہوں نے مکہ پہنچ کر مقتول کے خون کی ذمہ داری حضرت علیؑ پر عائد کر کے مکہ میں پہلے سے موجود لوگوں کے موقف کی تائید کی اور اس جماعت کے سرگرم رکن بن گئے اور یہ لوگ لگے بندھے منصوبے کے تحت مکہ میں ڈیرے ڈال کر بیٹھ گئے اور بنی ہاشم اور خصوصاً حضرت علی علیہ السلام پر مقتول خلیفہ کے قتل کا الزام عائد کر کے باقاعدہ قصاص کی مہم شروع کر دی۔ مہم کو رُو بکار لانے کے لیے سرمایہ کی بھی ضرورت تھی، اس کا حل یوں نکل آیا کہ بصرہ کا معزول حاکم عبداللہ بن عامر بن کریز بیت المال کی جمع جتھا لے کر مکہ پہنچ گیا اور مکہ سے یعلی بن امیہ چھ لاکھ درہم اور چھ سو اونٹ اپنے ساتھ لایا اور تمام سرمایہ جنگی اخراجات کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ چنانچہ تاریخ ابوالفداء جلد۱ ص۱۷۲ میں ہے کہ ''یعلیٰ تمام جمع پونجی سمیٹ کر نکل کھڑا ہوا اور مکہ پہنچ کر ان لوگوں کے ساتھ آملا اور وہ مال ان کی تحویل میں دے دیا''

اس کے ساتھ ہی اہلِ مکہ سے بھی سرمایہ فراہم کیا گیا اور وہ مالی لحاظ سے مطمئن ہو گئے۔

جب یہ ابتدائی انتظامات مکمل ہو گئے تو ایک خاتون کی رہائش گاہ پر باہمی صلاح ومشورہ کے لیے جمع ہوئے، جنگ کا مسئلہ تو طے شدہ تھا البتہ محاذ جنگ کا ابھی کوئی تصفیہ نہیں ہوا تھا، خاتونِ محترمہ کی رائے تھی کہ مدینہ کو محاصرہ میں لے کر جنگ چھیڑ دی جائے، مگر اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا کہ بلوائیوں کے ہوتے ہوئے اہلِ مدینہ سے نمٹنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے اور کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ شام کو جانا چاہیے، مگر جیسا کہ تاریخ ابن اثیر جلد۳ ص۱۰۶ میں ہے کہ عبداللہ بن عامر نے کہا: شام میں امیر شام، کے ہوتے ہوئے تمہاری ضرورت نہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی شام کو محاذ جنگ بنانے سے مانع تھی کہ امیر شام

نے خلیفہ وقت کے ماتحت ہوتے ہوئے ان کی مدد سے گریز کیا، وہ ان لوگوں کی مدد پر کیونکر آمادہ ہوتے اور جس نے حضرت علیؑ کی بیعت پر آمادگی نہ کی ہو وہ ان کی کامیابی کے بعد کسی اور کی خلافت بلا چون وچرا کس طرح تسلیم کر لیتے۔ اس میں شک نہیں کہ امیر شام ان کے ہمنوا ضرور تھے مگر اسی حد تک جس حد تک امیر المومنین علی علیہ السلام کو اقتدار سے الگ کرنے کا تعلق تھا، اس مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد کسی بھی شخص کی خلافت کو تسلیم کر لینا ان کی اقتدار پسند طبیعت سے ناممکن تھا۔

آخر بصرہ کے معزول حاکم عبداللہ بن عامر بن کریز کے کہنے سے بصرہ پر اتفاق کر لیا گیا، بصرہ کو محاذ جنگ قرار دینے میں جہاں یہ مصلحت کارفرما تھی کہ وہاں پر ان کے ہم خیال اور ہمنوا کثرت سے موجود ہیں جو جنگ میں اس کا ساتھ دیں گے، وہاں ان کو یہ فائدہ بھی نظر آرہا تھا کہ حجاز کے ایک طرف شام واقع ہے اور دوسری سمت عراق، اگر بصرہ کو محاذ جنگ بنا کر عراق پر تسلط قائم ہو گیا تو حجاز ان مخالف طاقتوں میں گھر کر رہ جائے گا، جس کے بعد امیر المومنین علیہ السلام کی سپاہ کو بآسانی شکست دے کر اقتدار پر قبضہ کیا جا سکے گا، یا ان دونوں طاقتوں کے زیر اثر رکھا جا سکتا ہے۔

اس تجویز سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے پیشِ نظر خون کا قصاص نہ تھا، اگر ان کا مقصد قصاص لینا ہوتا تو بصرہ پر دھاوا کرنے کے بجائے مدینہ پر حملہ آور ہوتے، جہاں یہ حادثہ رونما ہوا تھا اور جہاں اس حادثہ کے ذمہ دار افراد موجود تھے، جبکہ بصرہ میں نہ تو کوئی قاتل تھا اور نہ وہاں کے باشندے ان کے مقصد میں حائل تھے کہ انہیں راہ سے ہٹانا ضروری ہوتا۔

غرض محاذ جنگ کے تعین کے بعد کوچ کی تیاریاں شروع ہو گئیں، یعلیٰ نے قبیلہ عُرینہ کے ایک شخص سے چھ سو درہم میں ایک اونٹ خرید کر خاتون کی خدمت میں پیش کیا اور عمومی اعلان کیا کہ جس کے پاس سامانِ سفر، ہتھیار اور سواری نہ ہو وہ آئے،

اسے تمام چیزیں مہیا کی جائیں گی، چنانچہ کتاب تاریخ الاسلام ذہبی جلد۲ ص۱۴ میں ہے حضرت امیر المومنینؑ نے یعلیٰ کے متعلق فرمایا: ''**کان یعطی الرجل الواحد ثلثین دینارا و السلاح و الفرس علی ان یقاتلنی** ''وہ میرے خلاف لڑنے کے لیے ہر شخص کو گھوڑا، ہتھیار اور تیس تیس دینار دیتا تھا۔

غرض سات سو کی تعداد کے ساتھ جو اس وقت ان کے پرچم کے نیچے جمع ہو چکی تھی بصرہ کی سمت روانہ ہو گئے، راستہ میں اور لوگ بھی کچھ بے سوچے سمجھے اور کچھ ان کی باتوں سے متاثر ہو کر ساتھ ہوتے گئے اور لشکر کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی۔

تاریخ طبری جلد۳ ص۲۷۲ میں ہے: جب یہ لشکر ''ذاتِ عرق'' میں پہنچا، جہاں سے بصرہ کی راہ لینا تھی، تو لشکر میں موجود ''سعید بن عاص'' نے اپنے ایک ہمراہی اور اُس چند مخصوص ہمنواؤں سے تنہائی میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ: ہم لوگ کدھر کو منہ کیے جا رہے ہیں اور ہمارا اس دشت پیمائی سے مقصد و مدعا کیا ہے؟ تو وہ بولا: تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہم بصرہ جا رہے ہیں اور ہمارا مقصد خلیفہ کے قاتلوں سے انتقام لینا ہے، اس نے کہا: ''ثَارُکُمْ عَلٰی اَعْجَازِ الْاِبِلِ تَقْتُلُوْهُمْ اِرْجِعُوْا اِلٰی مَنَازِلِکُمْ لَاتَقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ ''اُن کے قاتل تو تمہارے ساتھ اونٹوں پر سوار ہیں، انہیں قتل کر دو اور اپنے گھروں کو واپس جاؤ اور ناحق ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔

تو اس نے جواب دیا کہ کس منہ سے گھر جائیں، اب بصرہ تو جانا ہی ہوگا، تا کہ تمام قاتلوں سے انتقام لے سکیں۔ سعید یہ سن کر اپنے دوسرے ہمراہیوں کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کہ اگر تم نے یہ جنگ جیت لی اور مقصد میں کامیاب ہو گئے تو مسند خلافت پر کس کو بٹھاؤ گے؟ کہا: ''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے، ہم دونوں میں سے جسے عوام منتخب کر لیں گے وہی خلیفہ ہوگا'' سعید نے کہا: جب تم خلیفہ کے قصاص کے لیے گھروں سے نکلے ہو تو تمہیں خلیفہ کے بیٹوں میں سے کسی کو خلیفہ بنانا چاہئے اور

ان کے دونوں بیٹے ''ابان'' اور ''ولید'' لشکر میں موجود ہیں، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ تم قصاص کا لبادہ اوڑھ کر اپنے لیے اقتدار کی راہ ہموار کر رہے ہو! تاریخ طبری ج۳ ص ۴۷۲ میں ہے: اس پر انہوں نے کہا: ''نَدَعُ شُيُوْخَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَ نَجْعَلُهَا لِاَبْنَآئِهِم'' کیا ہم سن رسیدہ مہاجرین کو چھوڑ کر، ان کے لڑکوں بالوں کو خلیفہ بنائیں؟

سعید سمجھ گیا کہ یہ لوگ قصاص طلبی کے لیے نہیں نکلے بلکہ سب کچھ حکومت اور اقتدار کے لیے ہے۔ چنانچہ وہ ان سے الگ ہو گیا اور اس کے ساتھ عبداللہ بن خالد، مغیرہ بن شعبہ اور قبیلہ بنی ثقیف کے لوگ بھی علیحدہ ہو کر طائف کی طرف چلے گئے اور باقی لشکر منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ادھر امیر المومنین علی علیہ السلام بغاوت شام کو فرو کرنے کی فکر میں تھے اور ایک لشکر ترتیب دے کر شام کی طرف حرکت کرنا چاہتے تھے کہ کچھ لوگوں کی بیعت شکنی اور لشکر کشی کی اطلاع مدینہ پہنچی۔ حضرتؑ نے مدینہ کے سرکردہ اشخاص کو مسجد نبوی میں جمع کیا اور فرمایا: تمہیں کچھ لوگوں کے باغیانہ اقدام کا علم ہو چکا ہے۔ تم میرا ساتھ دو تاکہ ان لوگوں کو بصرہ پہنچنے سے پہلے راستہ میں روک لیا جائے۔ کچھ لوگ ان لوگوں کی بااثر شخصیتوں کے مقابلے میں کھڑا ہونے سے ہچکچانے لگے اور کچھ لوگوں نے انکار کرتے ہوئے حضرت کو صاف جواب دے دیا، البتہ ہیثم بن تیہان، زیاد بن حنظلہ اور ابوقتادہ انصاری جیسے افراد نے حمایت حق کے جذبہ کے تحت بھرپور تعاون کا یقین دلایا اور کامل ابن اثیر جلد ۳ ص ۱۱۳ کے مطابق ابوقتادہ نے پر جوش لہجے میں کہا: ''يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَلَّدَنِيْ هٰذَا السَّيْفَ وَ قَدْ اَغْمَدْتُهُ زَمَانًا وَ قَدْ حَانَ تَجْرِيْدُهُ عَلٰى هٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ لَا يَأْلُوْنَ الْاُمَّةَ غِشًّا'' یا امیر المومنین! یہ تلوار مجھے رسول اللہ نے باندھی تھی اور ایک عرصہ سے نیام میں پڑی

ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ میں ان ظالموں کے خلاف اسے بے نیام کروں جو امت کو فریب دینے سے دریغ نہیں کرتے۔

کتاب انساب الاشراف جلد ا ص ۴۳۰ میں ہے کہ زوجہ پیغمبر خدا حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے فرزند عمر بن ابی سلمہ کو حضرت علیؑ کی خدمت میں پیش کیا اور کہا: میں اسے آپ کے سپرد کرتی ہوں یہ بیٹا مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے، یہ تمام معرکوں میں آپ کے ہمرکاب رہے گا۔ یہاں تک کہ خداوند عالم وہ فیصلہ کرے جو وہ کرنے والا ہے، اگر رسول خدا (ص) کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہوتی تو میں آپ کے ہمراہ جاتی.................''

امیر المومنین علیہ السلام نے مدینہ میں سہل بن حنیف انصاری کو مکہ میں قثم بن عباس کو اپنا قائم مقام مقرر کیا اور روایات کے اختلاف کی بنا پر چھ سو سے ایک ہزار افراد کے ساتھ جن میں چار سو بیعت رضوان میں شریک ہونے والے صحابہ کرام بھی تھے لے کر شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔

جب مدینہ میں تین میل کے فاصلے پر مقام ربذہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ آگے جا چکے ہیں اور بصرہ سے اِدھر دم نہیں لیں گے، اب انہیں راستہ میں روک لینے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا اور جنگ و قتال کے بغیر ان پر قابو پانا مشکل نظر آ رہا تھا۔ امیر المومنینؑ نے جنگ کے امکانات کے پیشِ نظر وہاں ربذہ میں پڑاؤ ڈال دیا اور چند آدمیوں کو مدینہ بھیج کر وہاں سے اسلحہ جنگ اور سواریاں طلب کیں اور فوج کی فراہمی کے لیے محمد بن جعفر اور محمد بن ابی بکر کو کوفہ روانہ کر دیا، تاکہ وہاں کے لوگوں سے عسکری امداد حاصل کریں اور جنگ کی صورت میں انہیں دشمن کے خلاف لڑنے کی دعوت دیں۔

جب وہ کوفہ پہنچے اور اہلِ کوفہ کو امیر المومنین کا پیغام دیا تو والی کوفہ ابوموسیٰ

اشعری بیچ میں دیوار بن کر حائل ہوگیا اور لوگوں کو روکنا شروع کردیا، امام علیؑ نے امام حسنؑ اور عمار یاسر کو اور پھر حجر بن عدی اور مالک اشتر کو کوفہ روانہ کیا، جنہوں نے اسے دارالامارہ چھوڑنے پر مجبور کردیا اور وہ رات کے اندھیرے میں قصر دارالامارہ سے نکل کر کوفہ کے کسی گوشہ میں چھپ کر بیٹھ گیا اور صبح ہوتے ہی شام کی طرف چل دیا، ادھر اہلِ کوفہ گروہ درگروہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ابوموسیٰ کے روکنے اور بعض مقامات سے خطوط لکھے جانے کے باوجود بارہ ہزار شمشیر زن مقام ''ذی قار'' میں امیرالمومنین علیہ السلام کے پرچم کے نیچے جمع ہوگئے۔

ادھر مخالفین کا لشکر چشمہ حوأب سے ہوتے ہوئے جہاں کتے بھونکے تھے۔ چاہ ابوموسیٰ پہنچا اور حاکم بصرہ عثمان بن حنیف کو اس لشکر گراں کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ابوالاسود دئلی اور عمران بن حصین کو ان کے پاس بھیجا تا کہ ان سے بصرہ آنے کا سبب دریافت کریں، انہوں نے کہا کہ ہم مقتول خلیفہ کا ان کے قاتلوں سے قصاص لینے آئے ہیں، ابوالاسود نے کہا: یہاں بصرہ میں تو ان کا کوئی قاتل نہیں ہے، کہا: ''صحیح ہے مگر اہلِ بصرہ کے تعاون سے ان کے قاتلوں کا انتقام لینا چاہتے ہیں، جو علیؑ کے گرد و پیش جمع ہیں'' ابوالاسود ان کے اندازِ گفتگو سے سمجھ گئے کہ وہ جنگ وقتال پر تلے ہوئے ہیں، ان سے مزید گفتگو کا کوئی فائدہ نہیں اور عثمان بن حنیف کو ان لوگوں کے عزائم سے آگاہ کیا اور دفاعی انتظامات کو مضبوط تر کرنے کا مشورہ دیا، عثمان نے اہلِ شہر کو مسجد میں جمع کر کے انہیں دفاع کے لیے مستعد ہونے کو کہا۔

ادھر وہ لشکر چاہ ابوموسیٰ سے روانہ ہو کر حدود بصرہ میں داخل ہوگیا اور ''مربد'' (اونٹوں کی منڈی) میں پڑاؤ ڈالا اور اہلِ شہر چاروں طرف سمٹ کر یہاں جمع ہوگئے، یہاں پر خوب گہما گہمی تھی خوب دھواں دھار تقریریں ہوئیں جس نے اختلاف کیا اس کی پٹائی کی گئی کسی کو ڈھیلے مارے گئے کسی کو پتھر مارے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر گھر

پھوٹ اور بھائی بھائی میں تفرقہ پڑ گیا، البتہ بصرہ والوں کی اکثریت لشکر والوں کے ساتھ ہوگئی اور انہوں نے چاہا کہ امیرالمومنین علیہ السلام کے بصرہ میں وارد ہونے سے پہلے بیت المال اور شہر کے نظم ونسق پر قبضہ کرلیں اور اسی قصد سے لشکر نے شہر کی طرف پیش قدمی شروع کردی، عثمان بن حنیف بغیر کسی چون و چرا کے شہر کو ان کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھے، تمام راستوں کی ناکہ بندی کر کے جہاں تک ممکن تھا شہر کا تحفظ کرلیا، حملہ آور جہاں سے بڑھتے والیٔ بصرہ کے ساتھی آہنی دیوار بن کر کھڑے ہوجاتے اور آگے بڑھنے سے روک دیتے، لیکن فوجیوں کے بڑھتے ہوئے ریلے کو کب تک روکا جاسکتا تھا، عثمان والی بصرہ نے جب یہ دیکھا تو لشکر کے سردار کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ لوگوں کا مطالبہ کیا ہے اور یہ شورش اور ہنگامہ آرائی کیوں ہے؟ انہوں نے کہا: ہم خلیفہ مظلوم کے خون کا قصاص لینا چاہتے ہیں! کہا: قصاص لینے کا یہ کوئی طریقہ نہیں ہے، یہ کیوں نہیں کہتے کہ خلافت کے لیے لڑ رہے ہیں، انہوں نے کہا: اگر ایسا ہو بھی تو علیؑ ہم سے زیادہ خلافت کے اہل نہیں ہیں، آخر دونوں طرف سے بات بڑھنے لگی اور بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ فریقین نے تلواریں نکال لیں اور خونریز جنگ چھڑ گئی، جب دونوں طرف سے اچھے خاصے آدمی مارے گئے تو کچھ آدمیوں نے بیچ بچاؤ کر کے جنگ رکوادی اور یہ معاہدہ طے پایا کہ جب تک امیرالمومنین علیہ السلام تشریف نہیں لے آتے لڑائی بند کردی جائے۔ عثمان بن حنیف بدستور دارالامارہ میں رہیں اور حکومت کے انتظامی امور میں کوئی رد و بدل نہ کیا جائے۔

اس معاہدہ کو طے پائے ابھی دو ہی دن گزرے تھے کہ ایک سرد تاریک رات میں ان لوگوں نے والی بصرہ عثمان پر شب خون مارا، انہیں گرفتار کر کے چالیس کوڑے مارے او داڑھی، بھنوؤں اور پلکوں کے بال نوچ ڈالے، تاریخ کامل جلد۲

ص ۱۱۱ میں ابن اثیر تحریر کرتے ہیں کہ: ''ابھی دو ہی دن گزرے تھے کہ بیت الرزق کے نزدیک عثمان بن حنیف پر حملہ کر دیا اور گرفتار کر کے قتل کرنا چاہا مگر اس خیال سے کہ کہیں انصار غضبناک نہ ہو جائیں، اقدامِ قتل سے ڈر گئے، مگر ان کے سر، داڑھی اور بھنوؤں کے بالوں کو نوچ کر انہیں قید میں ڈال دیا''

کچھ دن قید میں رہنے کے بعد عثمان کو رہا کر دیا گیا اور وہ موت سے بچ گئے مگر ان کے ساتھیوں میں سے چالیس آدمی ان کی خون آشام تلواروں کے ساتھ قتل کر دیئے گئے۔ اس کشت وخون کے بعد انہوں نے بیت المال پر حملہ کر دیا اور بیت المال کے سپاہیوں کو جن کی تعداد پچاس تھی جکڑ کر باندھ دیا گیا اور پھر انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر ڈالا۔

ادھر سے امیر المومنین علیہ السلام کا لشکر بھی نواحی بصرہ میں پہنچ گیا، آپ کے لشکر کی تعداد بیس ہزار تھی اور ان لوگوں کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ چکی تھی، جب دونوں طرف کے لشکر میدان میں اتر آئے تو حضرتؑ نے انہیں جنگ کی تباہ کاریوں پر متنبہ کرتے ہوئے سمجھایا بجھایا مگر انہوں نے اپنی کثرت وقوت پر بھروسہ کرتے ہوئے ان باتوں کا کوئی اثر نہ لیا اور انجام سے آنکھیں بند کر کے انتقام خون کے نعرے لگاتے ہوئے صف بستہ کھڑے ہو گئے، حضرت نے بھی ان کی صفوں کے بالمقابل صفیں جما دیں اور اپنے لشکر کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا: ''جب تک دشمن ابتدا نہ کرے تم آگے نہ بڑھنا، جب تک وہ حملہ نہ کرے تم وار نہ کرنا، کسی بھاگنے والے کا راستہ نہ روکنا، کسی زخمی پر ہاتھ نہ ڈالنا، کسی صاحب عزت کی پردہ دری نہ کرنا، کسی کے ہاتھ پیر نہ کاٹنا، کسی لاش کی بے حرمتی نہ کرنا اور کسی عورت کو گزند نہ پہنچانا'' جب لشکر کو یہ ہدایات دے چکے تو خود بے زرہ وسلاح، گھوڑے پر سوار ہو کر صفوں سے باہر نکلے اور دشمن کے لشکر کی طرف منہ کر کے انہیں کافی سمجھایا بجھایا حضرت رسول خدا (ص) کے فرامین اور ان کی

پیشگوئیاں ان کے سامنے بیان کیں، کافی دیر تک گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

آپؑ کے ارشادات اور مواعظ سے کئی لوگوں نے اثر لیا اور اس اقدام پر اظہارِ ندامت اور پشیمانی کر کے جنگ کا میدان چھوڑ گئے۔ جب آپ سب پر اتمام حجت کر چکے تو قرآن کریم کو اپنے ہاتھوں میں اٹھالیا اور صفوں کا ایک چکر کاٹ کر بلند آواز سے کہا: تم میں کون ہے جو یہ قرآن لے کر صف اعداء کے سامنے جائے اور انہیں قرآن پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دے اور اسی کتاب کا واسطہ دے کر انہیں فتنہ انگیزی سے منع کرے؟ مگر یہ سمجھ لے کہ وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے!

کوفہ کے ایک جوان، مسلم بن عبد اللہ مجاشعی نے کہا: ''میں جاؤں گا'' حضرتؑ کے تین بار کہنے پر جب مسلم کے سوا کوئی تیار نہ ہوا تو آپ نے اسے دعائے خیر دی اور قرآن کو اس کے حوالے کیا، وہ مصحف اپنے ہاتھوں پر اٹھائے مخالف صفوں کے سامنے آیا اور انہیں قرآن کے اوامر ونواہی یاد دلائے اور ان پر عمل کی دعوت دی، مگر اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اور کسی نے توجہ نہ دی، اتنے میں خاتون کے ایک غلام نے اس پر تلوار سے حملہ کیا اور اس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے، مسلم نے قرآن کو سینے سے لگالیا اور تلوار کا وار کھا کر شہید ہو گیا، قرآن بھی تیروں کی بوچھاڑ سے چھلنی ہو گیا۔ امیر المومنین نے یہ اسلام سوز منظر دیکھا تو تاریخ طبری جلد ۳ ص ۵۲۲ میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اَلْآنَ حَلَّ قِتَالُهُمْ'' اب ان لوگوں سے جنگ کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے، چنانچہ مسلم مجاشعی کی اس مجاہدانہ سرفروشی کے بعد عمار یاسر دشمن کی صفوں کے قریب آئے اور انہیں وعظ ونصیحت کی اور جنگ سے باز رہنے کی تلقین کی ابھی وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ تیروں کی بوچھاڑ نے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا، پلٹ کر حضرت سے کہا: یا امیر المومنین! اب کس بات کا انتظار ہے؟ یہ لوگ جنگ کے علاوہ کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتے۔

امیر المومنینؑ کے صبر وسکوت اور صلح پسندانہ روش سے دشمن کے حوصلے بڑھ چکے تھے انہوں نے آپ کی صفوں پر تیر برسانے شروع کر دیئے، جانباز سپاہیوں کے سینے چھلنی ہو گئے اور زخموں سے نڈھال ہو کر زمین پر گرنے لگے، اسی اثنا میں ایک شخص کو اٹھا کر حضرت کے سامنے لایا گیا جو دشمن کے تیروں سے شہید ہو چکا تھا، عبداللہ بن بدیل اپنے بھائی عبدالرحمٰن کو لائے جو تیر کھا کر دم توڑ چکا تھا، حضرت نے یہ کیفیت دیکھی تو پیشانی پر بل آیا، تیور بدلے اور فرمایا: ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن'' اب میدان میں اترے بغیر کوئی چارہ نہ تھا، حجت ہر طرح سے تمام ہو چکی تھی، صلح کے آثار ختم ہو چکے تھے اور دشمن کی طرف سے پہل ہو چکی تھی، آپؑ نے پیغمبر خدا (ص) کی زرہ ذات الفضول طلب فرمائی اور اسے زیب تن کیا سر پر عمامہ باندھا، ذوالفقار ہاتھ میں لی میمنہ کی قیادت مالک اشتر، میسرہ کی کمان عمار یاسر کے سپرد کی، رسول خدا (ص) کا سیاہ علم عقاب محمد بن حنفیہ کو دیا اور فرمایا: ''محمد بیٹا! آگے بڑھو!'' محمد علم لے کر آگے بڑھے تو تیروں کی بوچھاڑ نے راستہ روکا، امامؑ نے آگے بڑھ کر علم محمد کے ہاتھ سے لے لیا، ایک ہاتھ سے علم سنبھالا اور ایک ہاتھ تلوار کے قبضہ پر رکھا اور فوج مخالف پر ٹوٹ پڑے اور اس طرح لڑے کہ کشتوں کے پشتے، لاشوں کے ڈھیر اور سروں کے انبار لگ گئے، جب لشکر کو تہہ و بالا کر چکے تو پلٹ کر علم محمد حنفیہ کو دیا، انہوں نے بھی اس طرح مردانہ وار حملہ کیا کہ لاشیں خاک وخون میں تڑپتی نظر آنے لگیں۔

اس ہنگامہ دار و گیر میں مروان، طلحہ کی تاک میں تھا کہ کسی طرح انہیں ختم کر کے خلیفہ کے خون کا انتقام لے لے، کیونکہ ان کے قتل کی ایک حد تک ذمہ داری ان پر بھی عائد ہوتی تھی، اس انتقامی جذبہ کے علاوہ انہیں ٹھکانے لگانے میں ایک سیاسی مقصد بھی کارفرما تھا اور وہ یہ کہ مروان سمجھتا تھا کہ جب تک طلحہ و زبیر زندہ ہیں خلافت ہماری قوم میں منتقل نہیں ہو سکتی، البتہ ان دونوں کے ختم کرنے کے بعد اس کا امکان

ہو سکتا تھا۔

زبیر تو اس سے پہلے امیر المومنین کے وعظ و نصیحت کی وجہ سے میدان چھوڑ کر جا چکے تھے، اگر وہ میدان میں ہوتے تو بعید نہ تھا کہ مروان کے ترکش کا تیر انہیں بھی نشانہ بناتا۔

مروان نے طلحہ کو ختم کرنے کا موقع ڈھونڈ نکالا اور اپنے ایک غلام کی اوٹ لے کر زہر آلود تیر ان پر چلایا جو ان کی پنڈلی کو چیرتا ہوا گھوڑے کے شکم میں پیوست ہو گیا، گھوڑا زخمی ہو کر بھاگ کھڑا ہوا اور ایک خرابے میں جا کر رکا اور وہیں پر طلحہ نے دم توڑ دیا، چنانچہ ابن سعد طبقات جلد۳ ص۲۲۳ میں تحریر کرتے ہیں: ''جمل کے دن مروان بن حکم نے طلحہ کو تیر مارا جو ان کی پنڈلی پر لگا، پھر مروان نے کہا: خدا کی قسم تمہارے بعد قاتل کے ڈھونڈنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی''

طلحہ کے مارے جانے اور زبیر کے میدان خالی کر جانے سے اصحابِ جمل کے حوصلے پست ہوئے نہ ولولے سرد پڑے، بلکہ استقلال و پامردی کے ساتھ میدان میں جمے رہے اور لڑنے مرنے پر تلے رہے، اس لیے کہ وہ جنگ کا مرکزی کردار بی بی صاحبہ کو سمجھتے تھے اور انہی سے ان کی عقیدتیں وابستہ تھیں، کوئی رہے یا چلا جائے اس سے انہیں کوئی غرض نہیں تھی۔ ان کی یہ عقیدت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ ان کے اونٹ کی مینگنیاں اٹھا اٹھا کر ہاتھوں سے توڑتے اور انہیں سونگھتے اور کہتے: ''یہ ہماری مادر گرامی کے اونٹ کی میگنیاں ہیں، ان سے مشک و عنبر کی خوشبو آ رہی ہے''

وہ اونٹ کی حفاظت علم لشکر کی طرح کرتے اور ہمہ وقت اس کے گرد حصار باندھے کھڑے تھے، اگرچہ مہار پکڑنے پر ہاتھ کٹتے، سینے چھدتے، خون بہتے مگر ثابت قدم رہتے اور اپنی جگہ سے جنبش نہ کرتے۔ بی بی صاحبہ محمل کے اندر سے مہار پکڑنے والوں کو کٹ کٹ کر گرتے دیکھتی تھیں اور ان کی ہمت افزائی کرتی تھیں۔

جس کے نتیجے میں جب بھی کوئی گرتا فوراً اس کی جگہ پر دوسرا آ کھڑا ہوتا اور مہار اپنے ہاتھوں میں لے لیتا۔ ان مہار پکڑنے والوں میں زیادی تر بنی ضَبہ، بنی ناجیہ، بنی ازد اور قریش کے آدمی ہوتے تھے، غرض ہر مرنے والے کے بعد باری باری وہ مہار پکڑتے رہے اور کٹ کٹ کر گرتے رہے۔ بالآخر امیرالمومنینؑ نے دیکھا کہ جنگ ابھی فیصلہ کن مرحلے میں داخل نہیں ہوئی، اس لیے خود میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ مہاجرین وانصار کے ایک دستہ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے امام حسن وامام حسین علیہما السلام دائیں بائیں تھے، محمد بن حنفیہ علم لیے آگے آگے چل رہے تھے، آپؑ نے محمد بن حنفیہ سے فرمایا: آگے بڑھو اور صفوں کو چیرتے ہوئے اونٹ کے پاس جا کر دم لو، جون ہی آگے بڑھے تیروں کی بارش شروع ہوگئی اور ان کے قدم رک گئے، حضرت نے آگے بڑھ کر محمد کے ہاتھ سے علم لے لیا، بائیں ہاتھ سے علم سنبھالا اور اپنے داہنے ہاتھ میں تلوار ذوالفقار لی اور دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے اور اس طرح حملہ کیا کہ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے اور اس طرح تابڑ توڑ تلوار چلائی کہ اس میں خم آ گیا۔

جب دشمن کی صفوں کو درہم برہم کر چکے تو اپنی صفوں کے قریب آئے اور تلوار کو گھٹنوں سے سیدھا کیا اور دوبارہ حملہ کے ارادہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، محمد بن حنفیہ، عمار بن یاسر، عدی بن حاتم اور حسنین شریفین نے عرض کیا: ''آپؑ ٹھہریئے، ہم میدان میں جاتے ہیں'' مگر آپ نے کسی کی ایک نہ سنی، چہرہ غیظ وغضب سے تمتمارہا تھا۔ آنکھوں سے شرارے برس رہے تھے اور سینہ سے شیر کے غرانے کی آواز آ رہی تھی، اب کس میں جرأت تھی کہ کچھ کہے اور زبان کھولے، سب خاموش ہوگئے، آپؑ نے علم محمد کے سپرد کیا اور اکیلے دشمن کی صفوں پر بپھرے ہوئے شیر کی طرح حملہ آور ہوئے اور صفوں کے اندر گھر کر اس طرح تلوار چلائی کہ صفیں الٹ گئیں، میدان لاشوں سے پٹ گیا اور لڑتے لڑتے تلوار پھر ٹیڑھی ہوگئی اور آپؑ اپنی صف کے قریب آئے اور گھوڑے

سے نیچے اتر کر تلوار سیدھی کی۔

جب آپ کے اعوان وانصار نے دیکھا کہ پھر میدان کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں تو انہوں نے آپ کو قسم دی کہ اپنی حالت پر رحم کھائیے، آپؑ نہ لڑیں ہم لڑیں گے، اگر آپ پر آنچ آئی تو دین پر بن جائے گی اور اسلام کا شیرازہ بکھر جائے گا، حضرت نے ان کے کہنے سننے سے ہاتھ روک لیا اور پلٹ کر محمد بن حنفیہ سے کہا: دیکھو بیٹا! اس طرح سے جنگ کی جاتی ہے، لوگوں نے کہا: امیرالمومنینؑ! کس میں دم خم ہے جو آپ کی طرح لڑے اور کس کے بازوؤں میں کس بل ہے جو اس طرح تلوار چلائے۔

اس پُر زور حملہ کی وجہ سے اصحابِ جَمل پر شکست کے آثار طاری ہو چکے تھے، اگرچہ ان کے سروں پر تلواریں چل رہی تھیں، سینوں میں خنجر اتر رہے تھے اور سر بازو اور کلائیاں کٹ کٹ کر گر رہی تھیں مگر اس وقت تک میدان چھوڑنا گوارا نہ کر سکتے تھے جب تک اونٹ ان کے درمیان کھڑا تھا اور اس کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اس کی جھول اور محمل میں تیر اس طرح پیوست تھے جس طرح ساہی کے بدن پر کانٹے ہوتے ہیں اور وہ اس خونی ہنگامہ کی تاب نہ لا کر اس طرح گھوم رہا تھا جس طرح چکی گھومتی ہے۔

حضرتؑ نے دیکھا کہ جب تک اونٹ میدان میں کھڑا ہے، جنگ ختم ہونے میں نہیں آئے گی، ادھر بصرہ والے کسی کو اونٹ کے پاس پھٹکنے نہ دیتے تھے اور اس پر تُلے ہوئے تھے کہ جان جاتی ہے تو جائے مگر اونٹ کو کوئی گزند نہ پہنچنے پائے، حضرت امام علیؑ نے اسے میدان سے ہٹانے کا ارادہ کیا اور قبیلہ ''نخع'' اور قبیلہ ''ہمدان'' کے جوانمردوں کو لے کر میدان میں بڑھے، آپؑ کو دیکھ کر فوجیں ہٹیں، پرے ٹوٹے اور آپؑ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اونٹ کے قریب پہنچ گئے اور اپنے ایک سپاہی ''بُجیر بن دلجہ نخعی'' سے کہا کہ آگے بڑھ کر اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالو'' بُجیر نے آگے بڑھ کر اونٹ کے پیروں پر وار کیا اونٹ نے ایک مہیب چیخ ماری اور پہلو کے بل زمین پر

آ گرا، اس کے گرتے ہی جنگ رُک گئی اور ایک عام بھگدڑ مچ گئی، کسی کو سر و پا کا ہوش نہ رہا، لاشوں اور کراہتے ہوئے زخمیوں کو روندتے ہوئے جدھر منہ آیا ادھر بھاگ کھڑے ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان میں سناٹا چھا گیا، محمد بن ابی بکر اور عمار یاسر نے حضرت علیؑ کے حکم سے اونٹ کے تسمے کاٹے اور محمل کو زمین پر رکھ دیا۔ محمد بن ابی بکر نے محمل کے اندر ہاتھ ڈالا۔ بی بی نے پوچھا کون ہو؟ کہا: آپ کا ناپسندیدہ بھائی، کہا: ''خثعمیہ کے بیٹے ہو؟'' کہا: ہاں، کہا: خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ ہو اور تمہیں کوئی آنچ تو نہیں آئی؟ محمد نے کہا: امیر المومنین علیؑ نے دریافت کیا ہے کہ آپ کو کوئی گزند تو نہیں پہنچی؟ فرمایا: ایک تیر بازو کو چھوتا ہوا گزر گیا تھا کوئی خاص گزند نہیں پہنچی۔

امیر المومنینؑ نے محمد کو حکم دیا کہ محمل کے اوپر ایک خیمہ نصب کر دو اور اس کی نگرانی خود کرو، تا کہ کوئی شخص اس کے قریب نہ آنے پائے اور جب رات کا پچھلا پہر ہوا تو انہیں عبداللہ بن خلف کی بیوہ صفیہ بنت حارث کے ہاں پہنچا دیا اور اونٹ کے بارے میں حکم دیا کہ اسے جلا دیا جائے اور جلا کر اس کی خاک ہوا میں اڑا دی جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور خاتمہ جنگ پر حضرت نے اپنے لشکر میں اعلان فرمایا کہ کسی بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے، کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، کسی کے گھر میں داخل نہ ہوا جائے، جو ہتھیار رکھ دے اور جو گھر کا دروازہ بند کر دے اس کے لیے امان ہے، فریق مخالف کے مال کو ہاتھ نہیں لگانا، البتہ جو ہتھیار، برتن اور سواری میدان جنگ میں تمہارے ہاتھ لگیں وہ تمہارا مال ہے، اس کے علاوہ کسی چیز کو روا نہیں سمجھنا، عورتوں اور کنیزوں پر تمہارا کوئی حق نہیں۔

غرض یہ جنگ ہزاروں بے گناہوں کا خون پی کر وسط جمادی الثانیہ ۳۶ ہجری مطابق نومبر ۶۵۶ عیسوی کو اپنے اختتام کو پہنچی اور تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش

سانحہ بن کر بہت سی تلخ یادیں چھوڑ گئی، حضرت علیؑ کے بیس ہزار کے لشکر سے زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار اور کم سے کم ایک ہزار افراد شہید ہوئے جبکہ فریق مخالف کے تیس ہزار کے لشکر سے زیادہ سے زیادہ بیس ہزار یا سترہ (۱۷) ہزار اور کم سے کم دس ہزار افراد کام آئے۔

پایہ تخت کی تبدیلی

جنگِ جمل میں اہلِ بصرہ نے اصحاب جمل کا اور اہلِ کوفہ نے امیر المومنین علیہ السلام کا ساتھ دیا تھا، آپ نے جنگ کے اختتام پر عبداللہ بن عباس کو بصرہ کا گورنر اور زیاد کو خراج اور بیت المال کا ناظم مقرر کر کے اہلِ کوفہ کی دلجوئی کے لیے کوفہ کا قصد فرمایا، جب ۱۲۔ رجب ۳۶ ہجری کو حدود کوفہ میں داخل ہوئے تو وہاں کے اعیان و اشراف جنہیں فتح و کامیابی کی اطلاع پہنچ چکی تھی استقبال کے لیے شہر سے باہر نکل آئے اور آپ کے ہمرکاب شہر میں داخل ہوئے اور عرض کیا کہ دارالامارہ میں قیام فرمائیں، مگر آپؑ نے وہاں قیام پسند نہ فرمایا اور سیدھے مسجد میں تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز ادا کر کے خطبہ دیا اور اہلِ کوفہ کی ہمدردی اور تعاون پر تحسین آمیز کلمات ادا فرمائے اور پھر محلّہ ''رحبہ'' میں تشریف لائے اور ایک متوسط درجہ کے مکان میں قیام فرمایا اور وقتی طور پر مدینہ کے بجائے کوفہ کو ''دارالخلافت'' قرار دینے کا فیصلہ کیا اور یہ فیصلہ ان وجوہ کی بنا پر کیا گیا۔

۱۔ کوفہ اسلامی مملکت کے وسط میں واقع تھا جہاں سے چاروں طرف کے علاقوں کی نگرانی ہو سکتی تھی، فارس کی سرحد قریب تھی، بری اور بحری سفر کی سہولتیں حاصل تھیں، رُسل و رسائل اور آمد و رفت میں ہر طرح سے آسانی تھی، مختلف شہروں کے باشندوں کی گزرگاہ ہونے کی وجہ سے مختلف مقامات کے حالات بآسانی معلوم ہو سکتے تھے اور

مرکزی حکومت کے احکام بڑی سہولت کے ساتھ دوسری جگہوں پر پہنچائے اور دشمن کے حملہ آور ہونے کی صورت میں دفاعی اقدامات عمل میں لائے جاسکتے تھے، چنانچہ جب شامی فوجوں نے آپؑ کے مقبوضہ علاقوں پر یلغار شروع کی تو جتنا کوفہ سے اس کا تدارک ہوتا رہا مدینہ میں ہوتے ہوئے اس سے بہتر طریق پر ممکن نہ تھا۔

۲۔ امیر المومنین علیہ السلام کو مسند خلافت پر بیٹھے اگرچہ سات ماہ ہوچکے تھے مگر امیر شام نے ابھی تک نہ آپؑ کی خلافت کو تسلیم کیا تھا اور نہ بیعت پر آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ اس صورت میں اس کی ریشہ دوانیوں اور رخنہ اندازیوں سے مطمئن نہ رہا جاسکتا تھا، بلکہ یہ خطرہ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اپنے منصب کی بحالی کے لیے جنگی اقدامات اور کشت وخون سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ لہٰذا ایک ایسی جگہ کا انتخاب ضروری تھا جہاں سے فوجی نقل وحرکت میں آسانی ہو اور بروقت مدافعانہ قدم اٹھایا جاسکے، اس اعتبار سے کوفہ موزوں ترین مقام تھا، کیونکہ کوفہ امیر شام کے پایہ تخت کے قریب تھا اور فوجوں کی نقل وحرکت میں کوئی دشواری نہ تھی۔ اس کے برعکس مدینہ دمشق سے کافی فاصلہ پر واقع تھا جہاں سے نہ فوجوں کی نقل وحرکت آسان تھی اور نہ بروقت رسد اور فوجی امداد مہیا ہوسکتی تھی۔

۳۔ جنگ جمل سے بخوبی اندازہ ہوچکا تھا کہ جتنی عسکری امداد کوفہ سے حاصل ہوسکتی ہے اتنی کمک کی توقع مدینہ سے نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ والی کوفہ اور ابوموسیٰ اشعری کی انتہائی مخالفت کے باوجود کوفہ کی بڑی اکثریت نے حضرت کے ساتھ تعاون کیا اور آپ کے پیغام پر بارہ ہزار شمشیر زن اٹھ کھڑے ہوئے تھے جبکہ مدینہ سے بمشکل ایک ہزار لوگوں نے جنگ میں حصہ لیا ہوگا۔ اس صورت میں دوراندیشی کا تقاضا یہی تھا کہ کوفہ کو دارالحکومت بنایا جائے تاکہ بروقت اہلِ کوفہ سے دشمن کے مقابلے میں مدد حاصل کی جاسکے۔

۴۔ کوفہ پہلے ہی سے ایک چھاؤنی اور فوجی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا جہاں جنگجو لوگ آباد کیے گئے تھے اور ان کی اولاد بھی طبعاً جنگ وقتال کی طرف مائل اور خوبو رکھتی تھی جبکہ مدینہ کے اکثر لوگ دولت کی فراوانی کے نتیجہ میں آرام طلب ہوچکے تھے، چنانچہ جب حضرت نے کوفہ کو دارالحکومت قرار دیا تو اس کے خلاف مدینہ والوں نے کوئی آواز بلند نہیں کی، بلکہ احتجاج کرنے کے بجائے ایک گونہ سکون محسوس کیا کہ اب وہ گھر کا پرامن ماحول چھوڑ کر میدانِ جنگ کی کڑی سختیاں جھیلنے کے لیے مجبور نہیں کیے جائیں گے۔ اُن حالات میں جبکہ جنگ کے امکانات قریب سے قریب تر ہوتے جارہے تھے ایسے لوگوں کو نظر انداز کرکے جو حرب وضرب کے عادی معرکہ آرائی کے خوگر ہوں عافیت پسند لوگوں پر سہارا نہیں کیا جاسکتا تھا۔

۵۔ امیر المومنین دیکھ چکے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد چند افراد کے علاوہ اہلِ مدینہ نے آپ کے حق کی فوقیت کا اعتراف تو درکنار ایک طرح سے بیگانگی وسرد مہری کا برتاؤ کیا تھا اور پچیس سال کے طویل عرصہ کے بعد جب حالات سدھرتے نظر آئے تو آپ کو خلافت کے قبول کرنے پر مجبور کیا اور بیعت کرلی، مگر زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ان میں کا ایک گروہ بیعت توڑ کر جنگ وجدال پر اتر آیا اور جو لوگ بیعت پر قائم رہتے ہوئے اس گروہ میں شامل نہ ہوئے، انہوں نے بے حسی اور جذبات کی کمزوری کا مظاہرہ کیا، چنانچہ قریش تعاون میں سرگرم عمل نظر نہیں آئے، بنی امیہ کے اکثر افراد امیر شام کے پاس واپس شام چلے گئے اور وہیں کے ہوکر رہ گئے، بنی تمیم طلحہ کو برسرِ اقتدار لانے کے خواہشمند تھے، بنی عدی عبداللہ بن عمر کے ہوا خواہ تھے جس نے حضرت علیؑ کی بیعت سے علیحدگی اختیار کرلی تھی، اسی طرح مختلف افراد مختلف وجوہ کی بنا پر تعاون سے گریز کرتے رہے، تو اس ماحول میں کیونکر توقع کی جاسکتی تھی کہ آڑے وقت پر کام آئیں گے اور امیر شام سے جنگ چھڑنے کی

صورت میں تعاون کریں گے۔

۶۔ مدینہ اپنی حرمت اور تقدس کی وجہ سے اس حد تک خطرات میں گھرا ہوا نہ تھا جس حد تک عراق خطرات سے دوچار تھا، امیر شام کی نظریں عراق پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی فکر میں تھا، اس وقت تک عراق میں ٹھہرنا اور اسے مرکز قرار دے کر قیام کرنا ضروری تھا، جب تک پیش آمدہ خطرات ٹل نہ جاتے اور مملکت کی فضا پر سکون نہ ہو جاتی۔ مگر نہ وہ خطرات ٹل سکے نہ شامیوں کی تاخت و تاراج کا سلسلہ ختم ہوا، بلکہ ہر روز نت نئے فتنے سر اٹھاتے رہے اور ان فتنوں کو فرو کرنے کے لیے آپ کو زندگی کے بقیہ ایام کوفہ ہی میں گزارنے پڑے۔

عمال حکومت کا تقرر

جب امیر المومنین جنگ جمل سے فارغ ہو کر کوفہ میں فروکش ہوئے تو ملکی نظم و انضباط کے لیے عمال کے تقرر کی ضرورت محسوس کی، اگرچہ جنگ جمل سے پہلے چند ایک علاقوں پر عمال مقرر کئے جا چکے تھے مگر بیشتر مقامات پر جنگی مصروفیات کی وجہ سے عمال کے متعین کرنے کی فرصت نہیں مل سکی تھی چنانچہ حضرت نے اپنی قلمرو مملکت میں جس میں حجاز، مصر، عراق، یمن، ایران، آذربائیجان وغیرہ شامل تھے اپنی صوابدید سے ولاۃ و حکام متعین فرمائے اور ان میں پیش آئندہ حالات کی بنا پر وقتاً فوقتاً تغیر و تبدل ہوتا رہا اور ایسا ہونا رعایا اور مملکت کے حالات پر نظر رکھنے کا نتیجہ ہے، ان عمال میں سے چند نمایاں شخصیات اور ان جگہوں کا تذکرہ ہوگا جہاں جہاں وہ مقرر ہوئے۔

۱۔ قیس بن سعد انصاری:

پیغمبر اکرمؐ کے بلند مرتبہ صحابی اور رئیس خزرج سعد بن عبادہ کے فرزند تھے،

علم و عمل کی بلندیوں پر فائز ہونے کے ساتھ قدرآور، وجیہ صورت، سخاوت، شجاعت اور خطابت ان کا خاص جوہر تھا، دور اندیشی اور معاملہ فہمی میں یکتائے روزگار تھے، قیس اگرچہ سیاسی حربوں کو دوسروں سے بہتر سمجھتے تھے مگر دینی تقاضوں کو نظر انداز کر کے مکر و فریب کی سیاست اختیار نہ کرتے تھے، چنانچہ کتاب ''الاصابہ'' جلد۳ ص۲۳۹ میں ان کا قول ''لَوْ لَا الْاِسْلَامُ لَمَکَرْتُ مَکْرًا لَا تُطِیْقُهُ الْعَرَبُ'' اگر اسلام مانع نہ ہوتا تو میں ایسی چال چلتا جس کا توڑ عرب کے بس کی بات نہ ہوتا۔

امیر المومنین علیہ السلام نے ماہ صفر ۳۶ ہجری میں انہیں مصر کی امارت کے لیے منتخب کیا۔

۲۔ سہل بن حنیف انصاری:

انصار کے قبیلہ اوس کے ایک ممتاز فرد، والی بصرہ عثمان بن حنیف کے بھائی، پیغمبر اسلامؐ کی صحبت سے شرفیاب اور امیر المومنینؑ کے مخلص اصحاب میں سے تھے، بدر اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک رہے، جنگ احد میں جب اکثر لوگوں کے قدم اکھڑ گئے تھے ان کے ثبات قدم میں لغزش نہ آئی نہ پہاڑی کی آڑ ڈھونڈی نہ راہِ فرار اختیار کی، بلکہ پیغمبر خدا کے ہاتھ پر موت کا عہد و پیمان باندھ کر لڑے، امیر المومنینؑ نے بصرہ روانہ ہونے سے پہلے انہیں مدینہ میں اپنا قائم مقام حاکم مقرر فرمایا، جنگ صفین میں اپنے ساتھ لے گئے اور واپسی پر فارس کا عامل مقرر کیا۔

۳۔ مالک اَشْتَر بن حارث:

مالک نام اور اَشْتَر لقب تھا، شجاعان عالم میں شمار اور شمشیر زنی اور نبرد آزمائی میں شہرہ آفاق تھے، جمل اور صفین میں کارنامے انجام دیئے اور اپنے حریفوں تک اپنی

تیغ زنی کا لوہا منوایا، امیر المومنین کے مخلص و معتمد اور بلند مرتبہ اصحاب میں شمار ہوتے ہیں اور امام علیہ السلام سے اس درجہ خصوصیت حاصل تھی کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ: ''مالک کا میری نظروں میں وہی مقام و مرتبہ ہے جو رسول خدا(ص) کے نزدیک میرا مقام و مرتبہ تھا'' اور مسند احمد بن حنبل جلد اص ۸۵ میں ہے کہ علی علیہ السلام نے فرمایا: ''كَانَتْ لِيْ مَنْزِلَةٌ مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ مَالَمْ تَكُنْ لِاَحَدٍ مِنَ الْخَلَآئِقِ'' رسول خدا(ص) کے نزدیک میرا وہ مقام تھا جو کائنات میں کسی کو نہ مل سکا، ۳۸ ہجری میں انہیں امارت مصر کے لیے منتخب کیا، مگر مصر پہنچنے سے پہلے ایک اموی کارندے نے امیر شام کے ایما پر انہیں شہد میں زہر دے کر شہید کر دیا اور مروج الذہب مسعودی جلد۲ ص۴۰ کے مطابق جب امیر شام کو ان کے انتقال کی خبر ہوئی تو خوش ہو کر کہا: ''اِنَّ لِلّٰهِ جُنُدًا مِنَ الْعَسَلِ'' شہد بھی اللہ کا ایک لشکر ہے۔

۴۔عبداللہ بن عباس:

پیغمبر اسلامؐ کے ابن عم تھے، ہجرت سے تین سال قبل پیدا ہوئے، امیر المومنینؑ کے زیر سایہ تربیت پائی، انہی سے علمی استفادہ کیا اور علم و حکمت اور فقہ و تفسیر میں بلندترین درجہ پر فائز ہوئے، ''حبرُ الامۃ'' اور ''ترجمانُ القرآن'' کے الفاظ سے یاد کئے جاتے تھے، جمل، صفین اور نہروان تینوں جنگوں میں حضرت کے ہمرکاب رہے۔ عثمان بن حنیف کے بعد بصرہ کے حاکم مقرر کیے گئے، آخر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی۔ ۶۸ ہجری میں طائف میں وفات پائی، حضرت محمد بن حنفیہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور سپرد لحد کیا۔

۵۔محمد بن ابی بکر:

اسماء بنت عمیس کے بطن سے حضرت ابوبکر کے فرزند تھے، حجۃ الوداع کے سال پیدا ہوئے۔ حضرت ابوبکر کے انتقال کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے اسماء سے عقد کرلیا تو محمد انہی کے زیر تربیت آگئے۔ امام علیہ السلام نے اپنی اولاد کی طرح ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی، جمل و صفین کے معرکوں میں شریک رہے، قیس بن سعد کی برطرفی کے بعد مصر کی امارت ان سے متعلق ہوئی۔ ۳۸ ہجری میں لشکر شام جب مصر پر حملہ آور ہوا تو دشمن کے ہاتھوں بڑی بے دردی کے ساتھ شہید کر دیئے گئے۔

۶۔ابوایوب انصاری:

نام خالد تھا اور باپ کا نام زید، مگر اپنی کنیت کے ساتھ زیادہ شہرت حاصل کی، رسول خدا(ص) نے ہجرت کے بعد مدینہ میں سب سے پہلے انہی کے ہاں سات ماہ قیام فرمایا تھا۔ ابوایوب انصاری نہایت ہی متقی اور پرہیزگار ہونے کے ساتھ بہادر اور نبردآزما بھی تھے۔ اسلامی غزوات میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور جمل، صفین اور نہروان میں امیر المومنینؑ کی صفوں میں امتیازی حیثیت سے شامل رہے، امیر المومنین کی طرف سے مکہ کے والی مقرر ہوئے ۵۱ ہجری میں وفات پائی اور قسطنطنیہ میں دفن ہوئے، آپ کا مزار صدیوں سے زیارت گاہ خاص و عام چلا آرہا ہے۔

۷۔مخنف بن سلیم ازدی:

امیر المومنین علیہ السلام کے معتمد اصحاب میں سے تھے، کربلا کے مشہور

وقائع نگار ابومخنف انہی کی اولاد سے تھے۔ ابومخنف کا نام لوط ہے اور باپ کا نام یحییٰ اور وہ سعید بن مخنف بن سُلیم ازدی کے فرزند تھے۔ مخنف بن سلیم کو امیر المومنین علیہ السلام نے ہمدان اور اصفہان کا عامل مقرر فرمایا، جب حضرت نے صفین کی طرف حرکت کا ارادہ فرمایا تو مخنف نے حضرت سے کوفہ آنے کی اجازت طلب کی تا کہ آپ کے ہمرکاب رہ کر شامیوں سے جہاد کریں۔ امامؑ نے اجازت مرحمت فرمائی، حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قبیلہ بنی ازد کا پرچم لے کر جنگ صفین میں شریک ہوئے۔

۸۔ قرظہ بن کعب انصاری:

اصحاب رسول میں شامل تھے، احد اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے، کوفہ میں سکونت اختیار کی اور حضرت امیر علیہ السلام کی طرف سے فارس کے حاکم مقرر ہوئے، جمل، صفین اور نہروان میں آپ کی نصرت کا شرف حاصل کیا۔ جنگ صفین میں حضرت نے انصار کا علم انہیں کے سپرد کیا اور حضرت ہی کے دور خلافت میں وفات پائی۔ آپؑ ہی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی، ان کے ایک فرزند عمرو بن قرظہ انصاری نے کربلا میں امام حسین علیہ السلام کی نصرت میں شرف شہادت حاصل کیا۔

۹۔ قُثم بن عباس:

پیغمبر اکرمؐ کے چچازاد بھائی اور شکل وصورت میں آپؐ کے مشابہ تھے۔ حضور اکرمؐ کے دفن کے موقع پر قبر اطہر میں اترے اور سب سے آخر میں باہر نکلے۔ کریم اور سخی تھے، سائلوں کو اپنے گرانقدر عطیات سے دوسروں کے آگے جھولی

پھیلانے سے بے نیاز کر دیتے تھے، امام علیہ السلام نے انہیں والی مکہ مقرر کیا تھا اور اپنے مکتوب میں انہیں تحریر فرمایا: ''صبح وشام اپنی نشست قرار دو، مسئلہ پوچھنے والوں کو مسئلہ بتاؤ، جاہل کو تعلیم دو اور عالم سے تبادلہ خیال کرو'' ان کلمات سے ان کی عدالت، علمی منزلت اور اہلیت افتاء کا اندازہ ہوسکتا ہے، امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد سعید بن عثمان کے ہمراہ سمرقند چلے گئے اور جامِ شہادت نوش فرما کر راہی جنت ہوئے۔

۱۰۔ یزید بن قیس ارحبی:

قبیلہ ہمدان کی شاخ ''بنی ارحب'' کے ایک ممتاز فرد تھے۔ کوفہ میں سکونت تھی، جنگ صفین میں اپنے بھائی سعید بن قیس ہمدانی کے ساتھ شریک ہوئے اور بڑی دلیری کے ساتھ لڑے۔ امیر المومنینؑ نے انہیں اصفہان، ہمدان اور رے کا عامل مقرر کیا۔

۱۱۔ کمیل بن زیاد نخعی:

امیر المومنین علیہ السلام کے مخصوص دوستوں میں سے تھے۔ نہایت عابد، زاہد، پرہیز گار اور علوم ومعارف آلِ محمدؐ کے امین تھے۔ حضرت امیرؑ نے انہیں دعا تعلیم فرمائی تھی جو ''دعائے کمیل'' کے نام سے مشہور ہے، کوفہ میں سکونت رکھتے تھے۔ جنگ صفین میں حضرت امیرؑ کے ہمرکاب رہے، شامیوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔ ۸۲ ہجری میں جب حجاج بن یوسف نے عبدالرحمان بن محمد بن اشعث کو شکست دے کر کوفہ پر قبضہ کرلیا تو چن چن کر شیعیان علیؑ کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ کوفہ میں کمیل بن زیاد کی شخصیت غیر معروف نہیں تھی۔ وہ حجاج کی سفا کی ظلم وستم اور خونریزی کو دیکھ کر کہیں روپوش ہوگئے۔ حجاج نے ان کے قبیلہ والوں سے پوچھ گچھ کی مگر کسی نے ان کا

اتا پتا بتانا گوارا نہ کیا، جس کی بنا پر حجاج نے سب کے وظائف روک لیے۔ جب جناب کمیل کو معلوم ہوا تو کہنے لگے میں بہت جی چکا ہوں مجھے جینے کی آرزو نہیں ہے میں اپنی قوم کو بھوکا مرتا نہیں دیکھ سکتا۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور حجاج کے ہاں پہنچ گئے، حجاج ان کے ساتھ نہایت سختی اور درشتی کے ساتھ پیش آیا، کمیل نے بھی اس کی ہر بات کا جواب اُسی کے لب ولہجہ میں دیا اور کہا اس وقت میں تمہارے قبضہ میں ہوں تم جو چاہو میرے ساتھ سلوک کرو، کل میرا اور تمہارا فیصلہ اللہ کی بارگاہ میں ہوگا، مجھے موت کی پروا نہیں ہے، میرے سید وسردار علی بن ابی طالب علیہ السلام مجھے خبر دے گئے تھے کہ ''تم ایک ظالم وسفاک کے ہاتھوں قتل ہوگے'' حجاج نے کہا: ''مجھے تیری تلاش بھی اسی غرض سے تھی'' یہ کہہ کر حکم دیا کہ ان کی گردن ماردی جائے، چنانچہ وہ اسی مقام پر شہید کردیئے گئے، شہادت کے وقت آپ کی عمر مبارک نوے (۹۰) برس تھی اور مزار مبارک کوفہ اور نجف کے درمیان زیارت گاہ خلائق ہے۔

۱۲۔عمر بن ابی سلمہ:

ام المومنین حضرت بی بی ام سلمہ (رضی اللہ عنہا) کے بطن سے ابوسلمہ بن عبد الاسد مخزومی کے فرزند تھے ۲ ہجری میں حبشہ میں پیدا ہوئے وفات رسولؐ کے وقت ان کا سن نو برس کا تھا۔

میدان جمل میں امیرالمومنینؑ کے میسرہ لشکر کے سردار تھے امام علی علیہ السلام نے انہیں بحرین کا والی مقرر کیا، جب حضرتؑ نے صفین کا ارادہ کیا تو انہیں بحرین سے واپس بلالیا اور جنگ کے بعد فارس کے حاکم بنائے گئے ۸۳ ہجری میں مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا۔

۱۳۔نعمان بن عجلان انصاری:

قبیلہ انصار کے سردار اور زبان آور شاعر تھے، امیرالمومنین کے حامی وناصر اور ان کے حق کی فوقیت کا اظہار اپنے اشعار میں کرتے تھے، امیرالمومنینؑ نے انہیں عمر بن ابی سلمہ کی جگہ بحرین اور عُمان کا والی مقرر کیا، جنگ صفین میں آپ کی حمایت میں لڑے۔ ان کے بھائی نُعیم بن عجلان انصاری، حسینیؑ لشکر میں شامل ہوکر روز عاشورا حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے، نعمان بن عجلان نے امام حسن علیہ السلام کے دورِ خلافت میں وفات پائی۔

۱۴۔عثمان بن حنیف انصاری:

انصارِ مدینہ کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ احد اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے۔ امیرالمومنینؑ کے مخلص اصحاب میں سے تھے۔ امیر علیہ السلام نے جنگ جمل سے پہلے انہیں بصرہ کا حاکم مقرر فرمایا، جنگ کے خاتمہ پر ان کی جگہ عبداللہ بن عباس متعین ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور امیر شام کے دور حکومت میں وفات پائی۔

۱۵۔سعید بن مسعود ثقفی:

حضرت امیر مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے چچا تھے، صفین میں اہلِ کوفہ کے سات دستوں میں سے ایک دستہ کے افسر مقرر ہوئے۔ حضرت کی طرف سے مدائن کے والی تھے۔ جب حضرت امام حسن علیہ السلام فوج کی بغاوت کی وجہ سے ابن بشیر اسدی کے ہاتھوں سے زخمی ہوئے تو مدائن میں سعید ہی کے ہاں منزل کی اور انہوں نے ہی ان کے علاج معالجہ کا سروسامان کیا۔

۱۶۔عبید اللہ بن عباس:

حضرت رسالت مآب ﷺ کے چچازاد بھائی تھے، امیر المومنین نے انہیں یمن کی امارت سپرد کی جب بُسر بن ارطاۃ نے یمن پر حملہ کیا اور ان کے دو معصوم بچوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تو یہ اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر یمن سے نکل کھڑے ہوئے، جس پر امیر المومنینؑ نے انہیں سرزنش کی۔

۱۷۔حسان بن حسان بکری:

امیر المومنین علیہ السلام کی طرف سے ''انبار'' کے والی تھے، جب امیر شام نے عراقی سرحدوں پر تاخت وتاراج (لوٹ مار) شروع کی تو سفیان بن عوف غامدی نے چھ ہزار کے لشکر کے ساتھ انبار پر حملہ کر دیا اور حسان کو ان کے تیس (۳۰) ہمراہیوں کے ساتھ شہید کر دیا۔

جنگ صفین

''صفین'' مغربی عراق میں دریائے فرات کے کنارے ''رقہ'' اور ''بالس'' کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے، جہاں پر امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اور امیر شام کے درمیان تاریخ اسلام کی ایک نہایت ہی مہیب اور ہولناک جنگ لڑی گئی جس کی مثال تاریخ میں ملنا محال ہے اور یہ جنگ یکم صفر ۳۷ھ کو شروع ہوئی اور دس صفر ۳۷ ہجری کو بروز جمعہ ختم ہوئی، اس مقام پر فوجوں کا قیام ایک سو دس دن رہا اور نوے معرکے پیش آئے، نوے ہزار کے قریب افراد مارے گئے، جن میں سے امیر المومنینؑ کے لشکر سے پچیس ہزار افراد شہید ہوئے، جن میں سے اسی (۸۰) اصحاب بدریین اور تریسٹھ (۶۳) بیعت رضوان میں شریک ہونے والے صحابہ کرام

تھے، جبکہ فریق مخالف سے پینسٹھ (۶۵) ہزار یا کم از کم بروایتے پینتالیس ہزار افراد کام آئے۔

یہ خونی ہنگامہ امیر شام اور ان کے دست راست عمرو بن عاص کے ذوق سربلندی اور ہوس اقتدار کی پیداوار تھا۔ امیر شام خلافت ثانیہ کے دور سے شام پر حکومت کرتے چلے آرہے تھے اور عمرو بن عاص مصر کا گورنر رہ چکا تھا، امیر شام ہر قیمت پر اپنے اقتدار کو بحال رکھنا چاہتے تھے۔ عمرو مصر کے اقتدار رفتہ کو پھر سے حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔ یہ اقتدار پسند افراد کا طبعی خاصہ ہے کہ وہ حکومت اور امارت سے روشناس ہونے کے بعد ہر حیلہ وتدبیر سے اسے باقی و برقرار رکھنا چاہتے ہیں، خواہ وہ اخلاق و دیانت کی قدروں کو کچل کر اور حق وانصاف کے تقاضوں سے منہ موڑ کر جنگ اور خونریزی میں اترنا پڑے یا حیلہ وفریب کی راہ کو اختیار کرنا پڑے۔

چنانچہ امیر شام نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے قصاص کا شاخسانہ کھڑا کیا اور عوام کو مشتعل کر کے انہیں جنگ کے شعلوں میں جھونک دیا اور عمرو بن عاص نے امارت مصر کی خاطر ہر چیز داؤ پر لگا دی اور حق کو جاننے اور پہچاننے کے باوجود باطل کی ہمنوائی پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ تاریخ کامل ابن اثیر جلد۳ ص۱۴۱ میں ہے کہ اس نے اپنی دنیا طلبی کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کرتے ہوئے امیر شام سے کہا: ''خدا کی قسم! اگرچہ ہم تمہارے ساتھ ہو کر قصاصِ خون کے سلسلے میں جنگ کر رہے ہیں، مگر دل کے اندر جو ہے سو ہے، جبکہ تم اس شخص سے برسرِ پیکار ہو جس کی سبقت اسلام میں، دینی فضیلت اور رسول خدا سے قرابتداری کا تمہیں علم ہے، لیکن ہم تو فقط اس دنیا کے درپے ہیں''

امیر شام نے قصاص کے نام پر ایک بھاری ہجوم اپنے گرد جمع کر کے جنگ چھیڑ دی، مگر وہ سمجھتے تھے کہ اس کا نتیجہ عروج یا زوال یعنی تخت یا تختہ ہے، اس لیے

انہوں نے جنگ جیتنے کے لیے کوئی حربہ اٹھا نہ رکھا، خواہ اس سے شرافت پر حرف آتا ہو یا انسانیت داغدار ہوتی ہو، چنانچہ صفین میں وارد ہوتے ہی پہلا قدم یہ اٹھایا کہ فرات پر پہرا بٹھا دیا اور اس کے جواز میں یہ کہا کہ: آخر ان لوگوں نے بھی تو خلیفہ مظلوم پر پانی بند کر دیا تھا، حالانکہ اگر انہیں پانی بند کرنے کا مشورہ دیا بھی جاتا تو انہیں یہ کہنا چاہیے تھا کہ علیؑ پر پانی بند نہ کیا جائے، کیونکہ محاصرہ کے دنوں میں خلیفہ کے ہاں اگر کسی نے پانی پہنچایا تھا تو وہ علی بن ابی طالبؑ ہی تھے۔

اس کے برعکس جب امیرالمومنینؑ کی فوجوں نے گھاٹ پر قبضہ کرلیا اور لوگوں نے امیر شام کے طرزِ عمل کا جواب ویسے ہی طرزِ عمل سے دینا چاہا تو آپ نے فرمایا: غلط روش کا جواب غلط روش نہیں ہے، فوراً گھاٹ خالی کر دیا جائے اور کسی کو پانی سے نہ روکا جائے، حالانکہ پانی روک کر کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے پہلے پانی بند کیا پھر ہم جواباً پانی روک رہے ہیں۔ مگر حضرت امام علی علیہ السلام یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ایسا اقدام کریں جس سے ان کی بلند نفسی و وسعت قلبی اور عالی ظرفی مجروح ہوتی ہو۔

اسی طرح سے جب عمار یاسر کی شہادت سے ان لوگوں کا باغیانہ موقف بے نقاب ہو گیا تو انہوں نے فوراً بات بنائی کہ عمارؓ کے قاتل علیؑ ہیں جو انہیں لے کر آئے تھے۔ یہ اتنی کھلی ہوئی خلافِ حقیقت بات تھی کہ اسے دغل وفریب ہی نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہاں بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ایک واضح حقیقت کو جھٹلایا جاتا ہے۔

حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ اہلِ شام اس عقل سے کوسوں دور تاویل پر کیونکر مطمئن ہو گئے، اگر ان میں کچھ عقل وشعور ہوتا تو معاملہ دگرگوں ہو جاتا، جنگ کا رخ پلٹ جاتا او جو تلواریں اس کی حمایت میں چل رہی تھیں وہ ان پر اور ان کے خصوصی مشیروں پر چلنے لگتیں، اس لیے کہ ان کا اور ان کے گروہ کا بنص رسول باغی گروہ ہونا روز روشن کی طرح واضح ہو چکا تھا، باطل کے دھندلکے چھٹ چکے تھے اور حق پوری

تابانیوں کے ساتھ چمک اٹھا تھا، مگر شامیوں کی کج فہمی اور کج فکری نے ان کی آنکھوں سے نورِ بصیرت چھین کر انہیں گھپ اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا اور وہ باغی گروہ کو پہچاننے کے بعد باغی گروہ سے چمٹے رہے۔

جب اس قسم کے حربوں کے باوجود شکست ناگزیر نظر آئی تو ایسی پُرفریب چال چلی گئی کہ جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور عین اس وقت جب شامیوں کی شکست یقینی ہو چکی تھی میدان لاشوں سے پٹ چکا تھا اور بچے کھچے لوگ راہِ فرار ڈھونڈ رہے تھے کہ اُن میں کے پانچ آدمیوں نے دمشق کا مصحف اعظم پانچ نیزوں پر بلند کیا اور اس کے علاوہ جتنے قرآن مہیا ہو سکے، نیزوں پر اٹھائے گئے اور کچھ لوگوں نے تو اینٹوں پر جزدان لپیٹ کر انہیں قرآن کی صورت میں نیزوں پر آویزاں کیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرآن ہے، آؤ اپنے جھگڑے اسی کی روشنی میں نمٹائیں اور جنگ ختم کریں، یہ حربہ اتنا کارگر ثابت ہوا کہ بڑھتے ہوئے قدم تھم گئے اور چلتی ہوئی تلواریں رک گئیں۔

امیرالمومنینؑ نے عراقیوں کو دشمن کے مکروفریب سے آگاہ کیا مگر وہ اپنی بات پر اڑ گئے، ان میں کچھ تو وہ تھے جو امیر شام سے ساز باز کیے ہوئے تھے اور کچھ اپنی سادہ لوحی کہ وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ واقعاً قرآن کی طرف دعوت دی جا رہی ہے، مگر انہوں نے اتنا نہ سوچا کہ اگر قرآن کی طرف یہ دعوت دینے والے قرآن پر عمل کرنے والے ہوتے تو وصی رسولؐ کے ساتھ جنگ ہی نہ کرتے، اگر کرنا ہی تھی تو شروع کرنے سے پہلے قرآن کی طرف دعوت دیتے جس طرح امیرالمومنینؑ نے جنگ جمل میں آغازِ جنگ سے پہلے قرآن کی طرف دعوت دی تھی یا جنگ کے دوران قرآن کے فیصلے پر آمادگی ظاہر کرتے، مگر انہیں قرآن اس وقت یاد آتا ہے جب شکست کے بادل ان کے سروں سے منڈلانے لگتے ہیں اور حریف کی تلواروں سے بچاؤ کی کوئی صورت نظر

نہیں آتی۔

امیر شام کی اس کامیابی میں جو عناصر کارفرما تھے، ان میں مکر وفریب کے علاوہ اہلِ شام کی اطاعت اور بے چون و چرا سرِ تسلیم خم کیے رہنے کا بڑا دخل ہے۔ انہوں نے نہ جنگ میں تامل کیا اور نہ جنگ سے دستبرداری میں چون وچرا سے کام لیا، ان کی اندھا دھند پیروی کا یہ عالم تھا کہ جب ان کے امیر نے صفین کی طرف جاتے ہوئے بدھ کے دن نماز جمعہ پڑھادی تو نہ کسی نے اسے روکا اور نہ کوئی اس پر معترض ہوا۔ چنانچہ مسعودی اپنی تاریخ مروج الذھب جلد۲ص۷۲ میں تحریر کرتے ہیں کہ ”وہ اپنے امیر کے اس حد تک مطیع اور فرمانبردار تھے کہ انہوں نے صفین کی طرف جاتے ہوئے ”صَلّٰی بِھِمْ عِنْدَ مَسِیْرِھِمْ اِلٰی صِفِّیْنَ الْجُمْعَۃَ فِیْ یَوْمِ الْاَرْبَعَاءِ“ بدھ کے دن نماز جمعہ پڑھادی۔

امیر شام نے اپنے بیس سالہ دورِ اقتدار میں انہیں اسلام کے احکام و آداب سے روشناس نہیں ہونے دیا، مبادا اگر ان میں اسلامی شعور بیدار ہوگیا تو وہ حق وناحق اور جائز وناجائز میں امتیاز کرنے لگ جائیں گے اور ان کی بے شعوری اور بے خبری سے جو فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے، اس سے محروم ہونا پڑے گا، یہی وجہ ہے کہ وہ جناب علی علیہ السلام کو نہ جانتے تھے نہ پہچانتے تھے اور نہ ان کے علمی وعملی منزلت سے واقف تھے اور نہ ان کے زہد وتقویٰ کی بلندی سے آگاہ تھے، چنانچہ صفین میں ایک شامی نے برملا کہا: ہم علیؑ سے اس لیے برسرِ پیکار ہیں کہ نہ وہ خود نماز پڑھتے ہیں اور نہ ان کے ساتھی نماز گزار ہیں، اس نے تو وہی کچھ کہا جو اس نے امیر شام اور شامیوں سے سنا تھا، مگر جب ہاشم بن عقبہ نے اسے توجہ دلائی تو اس کی غلط فہمی دور ہوئی اور وہ شامیوں کی صف سے کٹ کر الگ ہوگیا۔

ادھر امیر المومنین علیہ السلام کے لشکر میں ایسے افراد بھی شامل تھے جو کسی

مصلحت یا قبائلی دباؤ کے زیر اثر شریک جنگ ہوگئے تھے مگر نہ ان کے خیالات میں ہم آہنگی تھی اور نہ اطاعت وفرمانبرداری کا جذبہ اور پھر اشعث بن قیس اور خالد بن معمر جیسے لوگ امیر شام کے ہاتھوں پر بکے ہوئے تھے، انہیں قرآن کی آڑ میں شورش انگیزی کا موقع مل گیا اور جنگ کا نقشہ الٹ دینے میں شامیوں کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کردی۔ اشعث بن قیس امیر المومنینؑ کے متنبہ کرنے کے باوجود قرآن کی صفوں میں آکھڑا ہوتا اور چیخ چیخ کر کہتا کہ اے لوگو! علیؑ کو مجبور کردو کہ وہ قرآن کو حَکَم (ثالث) تسلیم کریں اور اس خونریزی کو روکیں، کیونکہ حضرت امیر علیہ السلام کی فتحیابی کی صورت میں اسے کوئی فائدہ نظر نہیں آرہا تھا اور حضرت کو ناکام بنا کر ایک لاکھ کا انعام تو کہیں نہ گیا تھا جو امیر شام نے اس کے لیے مقرر کیا ہوا تھا اور ہوسکتا ہے کہ اس کے صلہ میں کسی صوبہ کی گورنری کی توقع بھی لیے ہوئے ہو۔

جنگِ نہروان:

عراق کے دریائے دجلہ کے کنارے واسط اور بغداد کے درمیانی علاقے میں موجود دیہاتوں پر مشتمل علاقہ ”نہروان“ کہلاتا ہے، جہاں پر امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اور خوارج کے درمیان جنگ واقع ہوئی۔ خوارج ان لوگوں کو کہتے ہیں جو ابتدا میں تو حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ساتھ تھے اور آپ ہی کی قیادت میں جنگ صفین میں شریک ہوئے۔

جیسا کہ بیان ہوچکا ہے کہ جب امیر شام نے دیکھا جنگ میں اس کی شکست یقینی ہوگئی ہے تو قرآن کو نیزوں پر بلند کرکے یہ پیشکش کی کہ اب ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرآن ہی فیصلہ کرے گا اور دو آدمی مل کر اس کا جو فیصلہ کریں گے وہ ہم سب کو منظور ہوگا، ان میں سے ایک آپ کی طرف سے اور ایک ہماری طرف سے

مقرر کیا جائے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت امیر علیہ السلام کے لشکر میں سے بہت سے لوگ اس جھانسے میں آ گئے اور حضرت کو بھی یہ فیصلہ قبول کرنے پر مجبور کر دیا اور ساتھ ہی صاف طور پر کہہ دیا کہ اگر آپ نہیں مانتے تو پھر جو تلواریں لشکر شام کی طرف اٹھی ہوئی ہیں ان کا رخ آپ کی طرف کر دیا جائے گا۔ حضرت نے بارہا انہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ سب دھوکہ ہے، فریب ہے، شکست سے بچنے کی ایک چال ہے، مگر وہ آپ کی ایک بات بھی نہ مانے۔ بالآخر حضرت نے ان کی بات کو مان کر جنگ کے ختم کرنے کا اعلان کر دیا، مگر جنگ بندی کا اعلان ہوتے ہی انہی لوگوں میں سے بہت سے افراد نے آپ پر اعتراض شروع کر دیا کہ دینی امور میں افراد کی حکمیت (ثالثی) کو کیوں قبول کیا ہے؟

اس پر حضرتؑ نے انہیں ہزار سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ تم ہی لوگ تھے جنہوں نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا جبکہ میں نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی سستی کا اظہار نہیں کیا۔ مگر آپؑ کی کسی بات کو نہ مانا گیا اور کوفہ کی طرف پلٹنے کے وقت سے لے کر کوفہ پہنچنے تک اسی اعتراض کو دہراتے رہے اور جب کوفہ واپس آ گئے تو کھلم کھلا آپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور زبان پر جسارت آمیز انداز میں آپ کے خلاف کفریہ کلمات کی نسبت دینے لگے اور ''لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ'' کا نعرہ بلند کر دیا کہ خدا کے علاوہ کسی کو فیصلے کا حق حاصل نہیں ہے اور یہ امیر المومنین علی علیہ السلام پر ایک قسم کا طنز تھا کہ آپ نے انسانوں کے فیصلوں کو قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے، جو حکم خداوندی کے سراسر خلاف ہے۔

حضرت جب بھی مسجد میں خطبہ دیتے تو وہ اسی نعرہ کے ساتھ آپ کی گفتگو کے خلاف ہلڑ مچا دیتے تو آپ جواب میں فرماتے ''کلمة حق یراد بها الباطل'' بات تو سچی کہتے ہیں لیکن اس کا مقصد غلط لیتے ہیں۔

بہر حال حضرت نے جس قدر بھی انہیں نصیحت کی اور سمجھایا کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تحکیم کے مخالف تھا اور کہتا تھا کہ امیر شام اور عمرو بن عاص تمہیں دھوکہ دے رہے ہیں ان کی چالوں میں نہ آؤ، مگر تم نے میری ایک نہ سنی بلکہ مجھے ایسا کرنے پر تم ہی نے مجبور کر دیا تھا، اب چونکہ میں ان سے وعدہ کر چکا ہوں، لہٰذا چھ ماہ تک ان کے فیصلے کا انتظار کرتے ہیں، اگر ان کا فیصلہ قرآن مجید سے ہٹ کر ہوگا تو پھر کوئی فیصلہ کریں گے، جب تک مدت پوری نہیں ہوتی میں اس سمجھوتے کو یکطرفہ طور پر ختم نہیں کر سکتا۔

ان باتوں کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا، بلکہ الٹا کہنے لگے: ہم نے اس دن غلطی کی اور اب اس کی حقیقت کا پتا چلا ہے، لہٰذا ہم توبہ کرتے ہیں آپ بھی توبہ کریں، ورنہ ہماری آپ سے بہر صورت جنگ ہوگی۔

وہ اسی طرح اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے اور آخر ایک دن سب نے مل کر فیصلہ کر لیا کہ آپ سے جنگ کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ انہوں نے ''عبداللہ بن وہب'' کو اپنا امیر بنایا اور طے کیا کہ سب لوگ نہروان کے مقام پر اکٹھے ہوں تا کہ بصرہ سے آنے والے ان کے دوست یار بھی وہاں پہنچ جائیں اور پھر مل کر جنگ کا اعلان کریں گے۔

وہ لوگ حضرت علیؑ اور ان کے پیروکاروں کو کافر و مرتد سمجھتے تھے، چنانچہ اگر کسی وقت حضرت علیؑ کے کسی پیروکار کو پکڑ لیتے تو اسے دردناک ترین صورت میں سزا دیتے اور موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے، یہاں تک کہ حضرت کے ایک صحابی عبداللہ بن خبّاب اور ان کی بیوی کا جس کے شکم میں بچہ بھی تھا سر قلم کر کے ان کی بیوی کا شکم چاک کر دیا، اس طرح سے انہوں نے کئی بے جرم و خطا افراد نہایت دردناک صورت میں شہید کر دیئے۔

عوام ان کے اس بہیمانہ طریقے سے سخت تنگ آ چکے تھے، ادھر حضرت علی علیہ السلام امیر شام کے ساتھ جنگ کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ لوگوں نے آپ سے درخواست کی پہلے آپ ہمیں ان لوگوں کے شر سے بچائیں پھر اپنے اصلی دشمن کی طرف چلیں گے۔ حضرت نے ان کی یہ رائے مان لی اور کوفہ سے سیدھے نہروان کی طرف روانہ ہو گئے، جب وہاں پہنچے تو ان سے فرمایا: تم میں سے جنہوں نے کسی بے گناہ کو قتل کیا ہے اس کو ہمارے سپرد کر دو تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے ورنہ تم سب کو تہہ تیغ کر دیں گے، انہوں نے مل کر کہا: ہم سب قاتل ہیں اور آپ کے خون کو بھی مباح سمجھتے ہیں''

جب حضرت نے دیکھا کہ ان کے ساتھ لڑائی کے سوا کوئی چارا نہیں تو اپنی فوج کو منظّم کر کے جنگ کے لیے تیار ہو گئے، خوارج کا لشکر مشرق کی طرف اور امیر المومنینؑ کا لشکر مغرب کی طرف تھا خوارج نہر کے مغربی کنارے پر تھے، اتنے میں امام کے اصحاب میں سے ایک شخص نے آ کر آپ کو اطلاع دی کہ خوارج کا لشکر نہر کو عبور کر کے آ رہا ہے، امامؑ نے فرمایا: نہ، ابھی تک انہوں نے نہر کو عبور نہیں کیا اور نہ ہی وہ عبور کر سکیں گے، بلکہ انہیں نہر کے اسی مغربی کنارے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ اتنے میں ایک اور شخص نے آ کر بتایا کہ وہ نہر کو عبور کر چکے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: غلط ہے ایسا ہو ہی نہیں سکتا اس لیے نہ تو میں نے کبھی جھوٹ بولا ہے اور نہ ہی حضور اکرمؐ نے مجھے جھوٹی خبر دی ہے، وہ کبھی نہر کو عبور نہیں کر سکیں گے بلکہ ان میں سے دس سے کم افراد زندہ بچ نکلیں گے اور تم میں سے دس سے کم لوگ مارے جائیں گے۔
چنانچہ جب دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا تو معلوم ہوا کہ ابھی تک خوارج نے نہر کو عبور نہیں کیا تھا اور ان کا لشکر چودہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا، امیر المومنینؑ نے اپنا علم حضرت ابوایوب انصاری کے ہاتھ دیا اور اس علم کا نام ''علَم امان'' رکھا، ابوایوب نے

لشکر خوارج کے سامنے آ کر بلند آواز سے کہا: جو شخص اس علم کے نیچے آ جائے گا وہ امان میں ہوگا اور جو میدان چھوڑ کر چلا جائے گا اس کے لیے بھی امان ہے، اس کے بعد امام علیہ السلام نے اپنے لشکر کو آمادہ جنگ ہونے کے لیے حکم دیا اور فرمایا: جب تک دشمن پہل نہ کرے تم لوگوں نے جنگ نہیں کرنی، اسی اثنا میں دشمن کے لشکر سے ایک آواز اٹھی: ''جلدی کرو بہشت کی طرف!!'' یہ کہہ کر انہوں نے حضرت کے لشکر پر دھاوا بول دیا، اس پر حضرت نے فرمایا: ''اب تمہیں اجازت ہے کہ خوب جنگ کرو'' جب جنگ شروع ہوئی تو خوارج میں سے کچھ لوگ انہیں چھوڑ کر نکل گئے، کچھ حضرتؑ کے لشکر سے آ ملے، عبداللہ بن وہب کے پرچم تلے چار ہزار کے لشکر میں سے صرف ایک ہزار آٹھ سو افراد باقی رہ گئے، علی علیہ السلام کے لشکر نے ایک حملہ سے ان سب کا کام تمام کر دیا اور جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام نے پیش گوئی کی تھی ان میں سے صرف نو (۹) افراد باقی بچ گئے تھے اور یہ واقعہ ۳۸ھ میں رونما ہوا۔

خوارج کون تھے؟

خارجیت کے جراثیم حضور رسالت مآب ﷺ کے زمانہ ہی سے پیدا ہو چکے تھے، جو اندر ہی اندر بڑھتے اور پھیلتے رہے، یہ لوگ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کے خلاف سازشیں کرتے، تخریبی کاروائیوں میں حصہ لیتے۔ ان کی گستاخی کا یہ عالم تھا کہ حضور رسالت مآب ﷺ کی دیانت اور عدالت پر حملہ کرنے سے بھی نہ چوکتے، چنانچہ جب حضور اکرمؐ نے غزوہ حنین کا مال غنیمت وادی جعرانہ میں تقسیم فرمایا اور تازہ مسلمان ''مولفۃ القلوب'' کی دل جوئی کے لیے اپنے حصہ خمس میں سے انہیں اوروں کی نسبت زیادہ دیا تو اس گروہ سے ایک فرد ''ذوالخویصرہ'' تمیمی نے گستاخانہ لہجے میں آپؐ سے کہا: ''آپؐ عدل وانصاف کریں'' اس پر حضرتؐ نے فرمایا: ''حیف

ہے تجھ پر اگر میں عدل نہیں کروں گا تو پھر کون کرے گا؟''

یہ لوگ بظاہر شعائرِ اسلام اور احکام دین کے پابند اور نماز، روزہ اور تلاوت قرآن کریم کے دلدادہ تھے مگر روح اسلام سے مکمل طور پر نا آشنا اور دین کی حقیقت سے بے خبر تھے، چنانچہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے جیسا کہ تاریخ بغداد جلد اول ص ۱۶۰ میں ہے:

''میری امت دو فرقوں میں بٹ جائے گی اور ان دو میں سے ایک فرقہ نکل کھڑا ہوگا، اس فرقہ کے لوگ سر منڈوائے، مونچھیں باریک کٹوائے اور آدھی پنڈلیوں سے تہمد باندھے ہوں گے۔ وہ قرآن کی تلاوت کریں گے مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، انہیں وہ شخص قتل کرے گا جو مجھے اور اللہ کو زیادہ محبوب ہوگا''

ان کی ظاہری وضع قطع، عبادت میں دلچسپی، نمازوں میں خضوع وخشوع اور پیشانیوں پر پڑے ہوئے گھٹوں کو دیکھ کر اکثر لوگ ان کے فریب کا شکار ہو جاتے تھے، ان کی نمازوں کی یہ کیفیت تھی کہ صحابہ کرام بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت رسالت مآبؐ نے اسی ''ذوالخویصرہ'' کو سجدہ میں دیکھا، آپؐ نماز پڑھ کر فارغ ہوگئے مگر وہ اسی طرح سجدہ میں پڑا تھا، آنحضورؐ نے پلٹ کر حضرت ابوبکر سے کہا کہ تم جاؤ اور ذوالخویصرہ کو قتل کردو، حضرت ابوبکر نے اسے بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھا تو اسے قتل کرنا مناسب نہ سمجھا اور واپس پلٹ آئے، پھر حضورؐ نے حضرت عمر کو اس کے قتل پر مامور کیا وہ بھی اسے نماز پڑھتے۔ دیکھ کر واپس لوٹ آئے اور آکر کہا کہ وہ تو نمازی ہے، میرا دل نہیں مانا کہ اسے قتل کروں۔

آخر حضور پاکؐ نے حضرت علیؑ کو بھیجا مگر امیر المومنینؑ کے پہنچنے سے پہلے

وہ وہاں سے جا چکا تھا، آپؑ نے پلٹ کر پیغمبرؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ جا چکا ہے، تو حضورؐ نے فرمایا: اگر وہ قتل ہو جاتا تو فتنہ دب جاتا، وہ اسی گروہ کا ایک فرد تھا جو دین سے اس طرح نکل جائے گا جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔

مظلومیت علیؑ بزبان علیؑ

حضرت علی علیہ السلام کی ایک بڑی مظلومیت یہ بھی تھی کہ انہیں ایسے گندم نما جو فروش کلمہ پڑھنے والوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان سے جنگ ناگزیر ہوگئی تھی۔

شرح بن ابی الحدید جلد۴ ص ۱۰۸ میں ہے امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ''اَخَافَتْنِی قُرَیْشٌ صَغِیراً وَّاَنْصَبَتْنِی كَبِیراً حَتّٰى قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَكَانَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى، وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَاتَصِفُوْنَ'' قریش نے بچپن میں اذیتیں پہنچائیں، جب بڑا ہوا اور رسول پاک (ص) کے ساتھ رہنے لگا تو مجھ سے دشمنی کی کوئی حد نہ چھوڑی، جب رسول خدا (ص) اس دنیا سے رخصت ہوئے تو انہوں نے مجھ پر ظلم وستم کرکے قیامت برپا کردی۔

شرح نہج البلاغہ از مرحوم فیض الاسلام ص۹۲،۴،۲۷ کے مطابق آپؑ ہی فرماتے ہیں:

انہوں نے اپنی تمام اذیتوں، دشمنیوں اور مظالم کا سلسلہ جاری رکھا، تو جب میں اس دنیا سے چلا جاؤں گا تو پھر ___ جب بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا اور وہ کمزور اور ذلیل وخوار ہو جائیں گے تو ___ اس بات کی تمنا کریں گے کہ

دنیااور جو کچھ اس میں ہے دے کر اس کے بدلے صرف انہیں ایک بار مجھے دیکھنے کا موقع مل جائے ،اگرچہ ایک ذبح کرنے کی دیر ___ یعنی مختصر عرصہ کیلئے ہی ___ کیوں نہ ہو!! تاکہ ان سے میں وہ چیزیں قبول کرلوں جن کا میں آج مطالبہ کررہاہوں اور مجھے دینے کیلئے راضی ہیں۔

عیسائی مورخ جارج جرداق اپنی کتاب ''علی صوت العدالۃ الانسانیہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

اگرعدالت کانعرہ کسی انسانی حلق سے باہرآیاہے تووہ انسان علی مرتضیٰ ہیں۔آپ تاریخ کامطالعہ فرمائیں (جیسا کہ سفینۃ البحار جلداص ۱۵۵، نیز کتاب عِقد الفرائد جلداص ۲۱۸ میں ہے) تو آپ کومعلوم ہوگا کہ:''سودہ ہمدانیہ حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد شام آگئی تاکہ معاویہ کے پاس جاکراس کے نمائندہ ''بُسُرِ بن ارطاۃ'' کےظلم وستم کی شکایت کرے،سودہ نے معاویہ سے کہا:

''اے معاویہ! آپ نے ہمارے پاس جونمائندہ بھیجاہے وہ ہم پرظلم وستم کررہاہے لیکن آپ کومعلوم ہوناچاہئے کہ ہم اس قدر گئے گذرے نہیں کہ اپنادفاع بھی نہ کرسکیں، بلکہ ہم اس کی گوشمالی بھی کرسکتے ہیں،لیکن فی الحال ہمارایہ ارادہ نہیں ہے'' یہ سن کرامیرشام نے کہا:''تو ہمارے پاس اس لئے آئی ہے کہ اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی شکایت کرے،مگرہمیں اپنے قوم وقبیلہ کی طاقت کاذکرکے ہمیں ڈرادھمکارہی ہے ؟ کیایہ چاہتی ہوکہ میں ابھی حکم دوں اور تجھے سرکش اونٹ پربٹھاکراسی نمائندہ کی طرف بھیج دوں؟''

اس موقع پروہ شیر دل خاتون امیرشام سے یوں مخاطب ہوئی:

صَلَّی الْاِلٰہُ عَلٰی رُوْحٍ تَضَمَّنَھَا   قَبْرٌفَاصْبَحَ فِی الْعَدْلِ مَدْفُوْنًا

قَدْحَالَفَ الْحَقَّ لَایَبْغِی بِہٖ بَدَلاً   فَصَارَبِالْحَقِّ وَالْاِیْمَانِ مَقْرُوْنًا

خدا کی رحمتیں ہوں اس روح پر جسے قبر نے آغوش میں لے لیاہے اور حقیقت یہ ہے کہ عدل وعدالت ہی اسی خاک میں دفن کئے جاچکے ہیں۔

یہ سن کرامیرشام نے پوچھا:''یہ اشعارتم نے کس کی شان میں پڑھے ہیں؟''اس نے جواب دیا:''مولاعلی مرتضیٰؑ کی شان میں'' خدا کی قسم جب میں اس شخص کی شکایت لے کرمولاؑ کی خدمت میں حاضرہوئی جوان کی طرف سے حکومت کررہاتھااوراس نےظلم وجور کاسلسلہ شروع کردیاتھا،اس وقت مولانماز پڑھنے کیلئے کھڑے ہوئے تھے ،جب مجھے دیکھاتوفوراًمیری طرف متوجہ ہوکرمیرے آنے کا مقصد پوچھا، میں نے عرض کیا:

''آپ کافرستادہ ہمارے اوپرظلم وستم کررہاہے !!'' یہ سن کرآپ رودیئے اور بارگاہ رب العزت میں عرض کی:''خداوندا تو گواہ ہے کہ میں نے اسے اس لئے نہیں بھیجا کہ وہ جاکرتیرے بندوں پرظلم کرنے لگے''

اس نمائندہ کاظلم یہ تھا کہ زکوۃ لیتے وقت وہ پیمانے کوبھرکر ___ مثلاً لبریز کر کے ___ لیتاتھاجب لوگوں نے اعتراض کیاکہ ایساکیوں کرتاہے؟ تواس نے جواب دیاکہ:''میں فقراء کے پیمانے بھرکرہی لوں گا''

مولانے فوراًچمڑے کاایک ٹکڑااٹھایااوراس پرلکھا:

''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیم ،قَدْجَآئَکُم بَیِّنَۃٌ مِّن رَّبِّکُمْ......''

''خداوندرحمٰن ورحیم کے نام سے بینہ اورگواہ آچکاہے،لوگوں کو نقصان نہ پہنچاؤاور زمین پرفساد نہ برپا کرو،تمہارے لئے بہتر ہے کہ جب بھی تم میرایہ خط پڑھو،توبیت المال میں سے جوکچھ تمہارے پاس ہےاسے محفوظ کرلو،جب تک کہ میرابھیجاہواکوئی آدمی تمہارے پاس آکراسےتحویل میں نہ لے لے''

اس کے بعد آپ نے وہ خط بغیر کسی تکلف کے مجھے دے دیا اور میں نے جا کر اسے دے دیا اور وہ ملازم معزول ہو کر ہمارے پاس سے چلا گیا۔

سودہ نے یہ بھی کہا: ”معاویہ! امیر المومنینؑ تو ہمارے ساتھ یہ برتاؤ کریں اور تم ہمیں دھمکیاں دو کہ ”آیا چاہتی ہو کہ ابھی حکم دوں اور تمہیں سرکش اونٹ پر سوار کر کے بسر بن ارطات کے پاس بھیج دوں؟“

جو علیؑ مسجد کوفہ کے منبر پر بار بار یہی کہا کرتے تھے۔ جیسا کہ نہج البلاغہ خطبہ ۲۳ میں ہے کہ: ”مَازِلْتُ مَظْلُوْمًامُنْذُقُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰہِ“ جب سے رسول خدا کی رحلت ہوئی ہے میں مظلوم چلا آرہا ہوں، آج وہی یہ کہہ کر اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔

”مَاکُنْتُ اِلَّا کَقَارِبٍ وَّرَدَوَطَالِبٍ وَّجَدَ“

میری مثال اس پیاسے کی سی ہے جو رات کی تاریکی میں ایک وسیع و عریض صحرا میں بہتے پانی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہو کہ اچانک اسے پانی مل جائے اور خدا سے میری دعا تھی کہ موت کا جو وقت مقرر ہے اس میں مجھے طبعی موت نہیں بلکہ شہادت کی موت آئے اور راہ خدا میں مارا جاؤں تو میری یہ آرزو بھی پوری ہوگئی ہے۔

شہادت ایمان مجسمؑ

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ جنگ نہروان سے چند خوارج بچ گئے تھے اور ان کے ساتھ بعد میں کچھ اور خارجی بھی آملے، چنانچہ انہوں نے ۴۰ھ میں مکہ میں ایک اجتماع کیا اور اپنے نہروان کے مقتولین پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے بھائی بند لوگوں کے خون کی ذمہ داری تین افراد پر عائد ہوتی ہے: علیؑ،

معاویہ اور عمرو بن عاص پر، لہٰذا ان تینوں کو قتل کر کے ہمیں اپنے مقتولین کا انتقام لینا چاہئے۔

ان خارجیوں کی رگوں میں انتقام کا خون تو کھول ہی رہا تھا سب نے اس پر اتفاق کیا اور بُرَک بن عبداللہ صریمی نے امیر شام کو، عمرو بن بکر تمیمی نے عمرو بن عاص کو اور عبدالرحمٰن بن ملجم نے حضرت علی علیہ السلام کو قتل کرنے کا بیڑا اٹھایا اور طے کیا کہ ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں حملہ ہونا چاہئے، تاکہ ان میں سے کسی کو دوسرے کی خبر نہ ہونے پائے، ورنہ ایک کے قتل کی خبر دوسروں کو چوکنا اور ہوشیار کر دے گی۔ چنانچہ برک بن عبداللہ دمشق کی طرف، عمرو بن بکر مصر کی طرف اور عبدالرحمٰن بن ملجم کوفہ کی طرف چل دیا۔

اس خطرناک کام کے لیے ماہِ رمضان کی انیسویں شب اور نماز صبح کا وقت مقرر کیا گیا، چنانچہ برک بن عبداللہ مقررہ تاریخ پر جامع دمشق آیا اور جب صبح کی جماعت کھڑی ہوئی تو وہ پہلی صف میں امیر شام کے پیچھے کھڑا ہو گیا، جب وہ رکوع کے لیے جھکے تو اس نے تلوار کا وار کیا جو اُن کے عقبی حصے پر پڑا، گھاؤ معمولی تھا چند دنوں میں بھر گیا اور حملہ آور کو گرفتار کر لیا گیا۔

عمرو بن بکر انیسویں شب کو جامع مسجد مصر میں ٹھہرا تا کہ صبح کی نماز میں عمرو بن عاص کو قتل کرے، مگر اتفاق ایسا ہوا کہ وہ قولنج کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا اور اس نے اپنی جگہ پر خارجہ بن حذافہ سہمی کو نماز پڑھانے کے لیے بھیج دیا، عمرو بن بکر اس کو اندھیرے میں پہچان نہ سکا اور خارجہ کو عمرو بن عاص سمجھ کر قتل کر دیا۔ لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور باندھ جکڑ کر عمرو بن عاص کے پاس لائے، جب اسے معلوم ہوا کہ ابن عاص کے بجائے خارجہ اس کے ہاتھوں سے قتل ہوا ہے تو اسے اپنی ناکامی پر سخت افسوس ہوا، مگر اب کیا ہو سکتا تھا، جو ہونا تھا وہ ہو چکا، عمرو بن عاص نے مخاطب کرتے

ہوئے کہا: ''تم نے تو مجھے قتل کرنا چاہا مگر قضا کے تیر کا رخ خارجہ کی طرف مڑ گیا اور تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے'' پھر خارجہ کے خون کے عوض اسے قتل کر دیا گیا۔

عبدالرحمٰن بن ملجم آخر ماہ شعبان ۴۰ ہجری میں کوفہ آیا اور محلّہ بنی کندہ میں خوارج کے ہاں قیام کیا، مگر کسی کو اپنے خطرناک ارادہ سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور نہ اپنے طرزِ عمل سے اپنے موقف کو مشکوک ہونے دیا، اسی اثنا میں اس کی ملاقات ایک خارجی عورت قطام بنت اخضر تمیمیہ سے ہوئی، وہ اسے دیکھتے ہی فریفتہ ہو گیا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ بے شوہر ہے تو اس سے نکاح کی خواہش کی، قطام کا باپ اور بھائی جنگِ نہروان میں مارے جا چکے تھے اور وہ حضرت علیؑ سے انتقام لینا چاہتی تھی، مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس خواستگاری سے اس کے انتقام کی افسردہ آگ پھر سے بھڑک اٹھی اور اسے کامیابی کی جھلک نظر آنے لگی، چنانچہ اس نے کہا: میں راضی ہوں اور میرا حق مہر تین ہزار درہم، ایک غلام ایک کنیز اور علی بن ابی طالب علیہ السلام کا قتل ہے۔

ابن ملجم اس جرم کے ارتکاب پر پہلے سے تلا ہوا تھا، ایک تو وہ اسی مقصد سے یہاں آیا تھا اور دوسرے اس کے پیچھے ایک اور قوی محرک کارفرما ہو چکا تھا، مگر بظاہر اس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا: علیؑ کو قتل کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے، قطام نے کہا: تم اچانک حملہ کر کے اس کا کام تمام کر سکتے ہو، اگر کامیاب ہو گئے تو بہتر ورنہ ثوابِ آخرت تو کہیں نہیں گیا، جس کے تم بہرحال مستحق ہو گے۔

ابن ملجم نے جب دیکھا کہ قطام اس کے خیالات و نظریات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے تو کہا میں بھی اسی ارادے سے آیا ہوں اور علیؑ کو قتل کر کے نہروان کے مقتولین کا انتقام لینا چاہتا ہوں۔ قطام نے کہا پھر ہمت اور جرأت سے کام لو اور میں اپنے قبیلے سے کہوں گی وہ تمہاری اس بارے مدد کریں، چنانچہ اس نے وردان بن

مجالد کو اس کی مدد کے لیے آمادہ کیا اور ابن ملجم نے شبیب بن بجیرہ اشجعی کو اپنا معاون اور اشعث بن قیس کو اپنا ہمنوا بنا لیا اور حملہ کے دن اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔

امیرالمومنینؑ اس ماہ مبارک میں باری باری اپنی اولاد اور عبداللہ بن جعفر کے ہاں روزہ افطار فرماتے، غذا بہت کم ہو چکی تھی، چند لقموں پر اکتفا کرتے، تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۹۵ میں ہے فرماتے ہیں: ''اُحِبُّ اَن یَّاْتِیَنِیْ اَمْرُ اللّٰہِ وَ اَنَا خَمِیْصٌ'' میں چاہتا ہوں کہ جب میری موت آئے تو میں خالی شکم ہوں۔

انیسویں شب کو آپ اپنی دختر نیک اختر حضرت ام کلثومؑ کے ہاں تشریف فرما تھے۔ انہوں نے جو کی دو روٹیاں ایک پیالہ دودھ کا اور ایک طشتری میں نمک رکھ کر پیش کیا۔ آپ نے اس کھانے کو دیکھا تو فرمایا: میں نے رسول خدا کی پیروی میں کبھی گوارا نہیں کیا ایک وقت میں دسترخوان پر دو قسم کی چیزیں ہوں، اے میری بیٹی! دنیا کے حلال میں حساب ہے اور حرام میں عقاب ہے، بیٹی کیا تم چاہتی ہو کہ تمہارا باپ زیادہ دیر تک موقف حساب میں کھڑا رہے؟ لہٰذا ان دو چیزوں میں سے ایک چیز کا اٹھا لو، جناب ام کلثوم نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا اور آپ نے چند لقمے نمک کے ساتھ تناول فرمائے، کھانے سے فارغ ہو کر حسب معمول مصلائے عبادت پر کھڑے ہو گئے، صواعق محرقہ ص ۱۳۴ میں ہے آج بار بار صحن میں نکلتے، آسمان پر نظر کرتے اور ڈوبتے اور جھلملاتے ہوئے ستاروں کو دیکھتے اور فرماتے: ''وَاللّٰہِ مَا کَذِبْتُ وَلَا کُذِّبْتُ اِنَّھَا اللَّیْلَۃُ الَّتِیْ وُعِدْتُ بِھَا''

خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں کہتا اور نہ مجھے غلط بتایا گیا ہے، یہ وہی رات ہے جس کا مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔

آپ کرب و اضطراب کی حالت میں کبھی سورہ یاسین کی تلاوت کرتے، کبھی ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن'' اور کبھی ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ

الْعَظِيْم ''پڑھتے اور کبھی کہتے: ''اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لِيْ فِي الْمَوْتِ'' خدایا! میری موت کو میرے لیے بابرکت قرار دے۔ جب جناب ام کلثومؑ نے یہ کیفیت دیکھی تو عرض کیا: ''بابا! آج آپ اتنے پریشان حال کیوں ہیں؟'' فرمایا: ''بیٹی! آخرت کی منزل در پیش ہے اور میں اللہ کی بارگاہ میں جانے والا ہوں!''

جناب ام کلثومؑ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: بابا! آج آپ مسجد میں تشریف نہ لے جائیں، کسی اور کو حکم دیجئے کہ وہ نماز پڑھا دے! فرمایا: ''لَا مَفَرَّ مِنْ قَضَآءِ اللّٰهِ'' قضائے الٰہی سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

ابھی کچھ رات باقی تھی کہ ''ابن ثباج'' موذن نے حاضر ہو کر نماز کے لیے عرض کیا، آپؑ مسجد کے ارادے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب صحن خانہ میں آئے تو گھر میں پلی ہوئی بطخوں نے اپنے پر پھڑ پھڑائے اور چیخنے چلانے لگیں۔ کسی نے انہیں آپؑ سے ہٹانا چاہا تو فرمایا کہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو، ابھی کچھ دیر کے بعد نوحہ و بکا و نالہ و شیون کی آوازیں بلند ہوں گی، پوچھا گیا: بابا! آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ فرمایا: ''کلمہ حق تھا جو میری زبان پر جاری ہو گیا ہے'' پھر ام کلثوم سے فرمایا: بیٹی! یہ بے زبان جانور ہیں۔ ان کے آب و دانہ کا خیال رکھنا، اگر ایسا نہ کر سکو تو انہیں رہا کر دینا تاکہ زمین میں چل پھر کر اپنا پیٹ پال سکیں، جب دروازہ کے قریب پہنچے تو پٹکا کمر میں کس کر باندھا اور احیحہ انصاری کے یہ دو شعر پڑھے:

اُشْدُدْ حَيَازِيْمَكَ لِلْمَوْتِ فَاِنَّ الْمَوْتَ لَاقِيْكَ

موت کے لیے کمر کس لو اس لیے کہ موت تمہارے سامنے آنے والی ہے۔

وَ لَا تَجْزَعْ مِنَ الْمَوْتِ اِذَا حَلَّ بِوَادِيْكَ

جب موت تمہارے ہاں ڈیرے ڈال لے تو اس پر بیتابی کا مظاہرہ نہ کرو۔

جناب ام کلثومؑ نے آنسو بہاتے ہوئے اپنے باپ کو الوداع کیا، امام حسنؑ

نے چاہا کہ مسجد تک حضرتؑ کے ہمرکاب جائیں مگر آپؑ نے منع کر دیا، جب آپؑ مسجد میں تشریف لائے تو مسجد تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی، آپؑ نے مسجد میں چند رکعت نماز پڑھی اور تعقیبات سے فارغ ہوئے تو خونریز سحر نمودار ہو چکی تھی، آپؑ گلدستہ اذان پر تشریف لے گئے اور صبح کی اذان دی، یہ آپؑ کی آخری اذان تھی جو مسجد سے بلند ہوئی اور کوفہ کے ہر گھر میں سنی گئی اور اذان کے بعد اَلصَّلٰوةَ اَلصَّلٰوةَ کہہ کر لوگوں کو نماز صبح کے لیے بیدار کرنے لگے، انہی لوگوں میں ابن ملجم بھی تھا، اسے اوندھا لیٹے ہوئے دیکھا تو فرمایا یہ شیطان کے سونے کا انداز ہے، داہنی کروٹ سوؤ جو مومنین کا شعار ہے، یا بائیں طرف لیٹو جو حکماء کا طریقہ ہے، یا پیٹھ کے بل سو جو انبیاءؑ کا طرز عمل ہے، اٹھ اور نماز پڑھ۔

حضرت لوگوں کو بیدار کرنے کے بعد محراب عبادت میں کھڑے ہو گئے اور جب نافلہ صبح کی پہلی رکعت کے سجدہ سے سر اٹھایا تو شبیب بن بجرہ نے تلوار سے حملہ کیا مگر تلوار ستونِ مسجد سے ٹکرائی اور اس کا وار ناکام رہا۔ پھر ابن ملجم نے زہر میں بجھی ہوئی تلوار سر پر ماری جس سے فرق مبارک شگافتہ ہو گیا، آپ نے بیساختہ فرمایا: ''فُزْتُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ'' رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا ہوں، لوگو! مجھے یہودیہ کے بیٹے ابن ملجم نے قتل کر ڈالا۔

امام بمنزلہ روح کائنات اور جان عالم ہوتا ہے، جب جان پر بنتی ہے تو اعضاء متاثر اور مضمحل ہوئے بغیر نہیں رہتے، چنانچہ اس موقعہ پر آسمان کانپا، زمین لرزی مسجد کے دروازے آپس میں ٹکرائے اور زمین و آسمان کے درمیان یہ آواز گونجی:

''تَهَدَّمَتْ وَاللّٰهِ اَرْكَانُ الْهُدٰى، قُتِلَ ابْنُ عَمِّ الْمُصْطَفٰى، قُتِلَ وَصِيُّ الْمُجْتَبٰى، قُتِلَ عَلِيٌّ الْمُرْتَضٰى'' خدا کی قسم رکنِ ہدایت گر گئے، رسول خدا کے ابن

عم قتل کر دیئے گئے، وصی پیغمبر مارے گئے، علی مرتضیٰؑ شہید
کر دیئے گئے۔

اس آواز نے کوفہ کی آبادی کو لرزا دیا۔ تمام شہر کانپ اٹھا۔ لوگ جوق در جوق گھروں سے نکل آئے۔ امام حسن وحسین علیہما السلام سراسیمہ اور پریشان حال مسجد کی طرف دوڑے جہاں لوگ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ امیر المومنینؑ شہید کر دیئے گئے!! فرزندان رسولؐ نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ محراب لہو سے تر ہے اور ایمان مجسم خاک وخون میں غلطان ہے اور امام معظم مٹی اٹھا اٹھا کر فرق مبارک پر ڈالتے اور سورہ طہٰ کی آیت ۵۵ کی تلاوت فرماتے جاتے تھے: ''مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَ فِيهَا نُعِيدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ'' ہم نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور زمین کی طرف پلٹائیں گے اور اسی سے دوبارہ نکالیں گے۔

امیر المومنین کے سر وصورت کو خون میں رنگین دیکھ کر امام حسن علیہ السلام نے گلوگیر آواز میں کہا: بابا! آپؑ کا خون کس نے بہایا ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا: بیٹا! پہلے نماز ادا کرو، چنانچہ امام حسن مجتبیٰؑ نے نماز پڑھائی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرتؑ کو محراب مسجد سے صحن میں لایا گیا، اس وحشت ناک خبر کو سن کر لوگ سمٹ کر مسجد میں جمع ہو چکے تھے، ہر چشم اشکبار اور ہر دل غم سے فگار تھا، امام حسن علیہ السلام نے قاتل کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا: ''مجھے ابن ملجم مرادی نے قتل کیا ہے'' اور باب کندہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''ابھی دروازہ سے اسے لایا چاہتے ہیں'' اتنے میں باب کندہ کی طرف سے شور اٹھا اور ابن ملجم گرفتار کر کے لایا گیا، مجمع غم و غصے سے بے قابو ہو رہا تھا، آنکھوں سے غیظ وغضب کی چنگاریاں نکل رہی تھیں اور ہر شخص اس پر لعنت بھیج رہا تھا، جب اسے امام حسن علیہ السلام کے سامنے لایا گیا تو آپؑ نے اس سے کہا: ''اے بد بخت ولعین! تو نے امیر المومنینؑ کو قتل کر دیا ہے، کیا یہ

ان احسانات کا بدلہ ہے جو انہوں نے ہمیشہ تم پر کیے؟''

ابن ملجم سر جھکائے خاموش کھڑا رہا اور کسی بات کا جواب نہ دیا۔

امیر المومنین علیہ السلام نے غشی سے آنکھیں کھولیں، اسے دیکھا اور فرمایا کہ ''اے ابن ملجم! کیا میں تیرا اچھا امام نہ تھا؟ اور کیا میرے احسانات بھلا دیئے جانے کے قابل تھے؟ اس پر ابن ملجم نے سورہ زمر آیت ۱۹ پڑھی: ''اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ'' کیا آپ اسے چھڑائیں گے جو دوزخ کا سامان کر چکا ہو؟

اس کے بعد امیر المومنینؑ نے اپنے فرزند امام حسن علیہ السلام کی طرف رخ کر کے فرمایا: ''اے فرزند! اگر میں زندہ بچ رہا تو مجھے اختیار ہو گا کہ اسے سزا دوں یا معاف کر دوں اور اگر اس ضربت کے نتیجے میں چل بسا تو تم اسے قصاص کے طور پر قتل کر دینا اور ایک ضربت کے بدلے ایک ضربت لگانا اور قتل کے بعد اس کے ہاتھ پیر نہ کاٹنا، کیونکہ میں نے رسول خداؐ کو فرماتے سنا ہے کہ ''اِيَّاكُمْ وَ الْمُثْلَةَ وَلَوْ بِالْكَلْبِ الْعَقُوْرِ'' خبردار کسی کے ہاتھ پیر نہ کاٹنا خواہ کاٹنے والا کتا ہی کیوں نہ ہو اور اس کے ایام اسیری میں جو خود کھانا اسے وہی کھانے کے لیے دینا اور جو خود پینا وہ اسے پینے کے لیے دینا۔

اب لوگ حضرتؑ کو ہاتھوں پر اٹھا کر گھر میں لے آئے، گھر کے اندر اور گھر سے باہر کہرام برپا تھا، امام حسن علیہ السلام گریہ وزاری کی آواز سن کر باہر تشریف لے آئے اور فرمایا: اے لوگو! امیر المومنینؑ فرماتے ہیں، تم اپنے اپنے گھروں کو واپس جاؤ، اصبغ بن نباتہ کہتے ہیں لوگ تو منتشر ہو گئے مگر میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ میں حضرتؑ کو بغیر دیکھے واپس چلا جاؤں، وہیں پر کھڑا رہا جب حضرت امام حسن علیہ السلام دوبارہ باہر نکلے تو میں نے عرض کیا: فرزند رسولؐ! میں امیر المومنینؑ کو دیکھے بغیر نہیں جانا چاہتا، مجھے ایک نظر دیکھنے کی اجازت دی جائے۔

امام حسن علیہ السلام اندر تشریف لے گئے اور کچھ دیر بعد باہر نکلے اور مجھے اپنے ہمراہ اندر لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ حضرتؑ کے سر پر زرد رنگ کی پٹی بندھی ہوئی اور چہرے پر زردی چھائی ہوئی ہے، میں پٹی اور چہرے کی رنگت میں تمیز نہ کر سکا اور بے ساختہ رونے لگا، حضرتؑ نے مجھے روتے دیکھا تو فرمایا: اے اصبغ! رو ؤنہیں میں جنت کی طرف جا رہا ہوں۔ میں نے عرض کیا: یا امیر المومنینؑ! مجھے معلوم ہے کہ آپ ضرور جنت میں جائیں گے مگر میں تو اپنی مفارقت پر روتا ہوں، اب ہمارا کون پرسانِ حال ہوگا؟ اور یتیموں اور بیواؤں کی کون دستگیری کرے گا؟ یہ کہہ کر اصبغ اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت پر نقاہت طاری ہوگئی۔

اس موقعہ پر کتاب اعیان الشیعۃ جلد ۷ ص ۳۸۸ کے مطابق امیر المومنین علیہ السلام کے خواص میں سے ایک صحابی جناب صعصعہ بن صوحان کا ذکر ملتا ہے جن کا شمار حضرتؑ کے مخلص دوستوں میں ہوتا ہے، جب وہ آپ کی زیارت کے لیے آئے تو معلوم ہوا کہ آپ کے اطراف کو آپؑ کے اہلِ خانہ نے اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے، لہٰذا شرفِ باریابی سے محروم ہوگئے مگر انہوں نے کسی آدمی کے ذریعے جو اندرونِ خانہ جا رہا تھا یہ پیغام بھجوایا اور عرض کی:

''رَحِمَکَ اللّٰہُ یَا اَبَاالْحَسَنؑ! لَقَدْ کَانَ فِیْ صَدْرِکَ عَظِیْمًا وَ لَقَدْ کُنْتَ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ عَلِیْمًا ''یا اباالحسنؑ! خدا کی رحمت ہو آپ پر یقیناً آپ کے دل میں خدا کی بڑی عظمت ہے اور غیر اللہ کو کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے اور کلام خدا کے بہت بڑے عالم تھے۔

اس شخص نے یہ پیغام حضرتؑ کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا: ''صعصعہ دروازے پر کھڑے ہیں چونکہ انہیں ملاقات کی اجازت نہیں ملی لہٰذا انہوں نے پیغام

بھجوایا ہے، آقا امامؑ نے ان کے جواب میں فرمایا: ''رَحِمَکَ اللّٰہُ لَقَدْ کُنْتَ خَفِیْفَ الْمَؤُوْنَةِ وَ کَثِیْرَ الْمَعُوْنَةِ ''اے صعصعہ! خدا کی رحمت ہو تم پر بھی تم میرے لیے ایسے اچھے ساتھی تھے کہ جس کی زحمتیں کم اور تگ و دو زیادہ، بہت زیادہ تھی۔

اب نقاہت بہت بڑھ چکی تھی اور غشی کے دورے پڑنے لگے کبھی ہوش میں آ جاتے اور کبھی غش کر جاتے، امام حسن علیہ السلام نے دودھ کا ایک پیالہ پیش کیا، آپؑ نے کچھ پیا اور فرمایا کہ ابن ملجم کو بھی دودھ کا شربت دیا جائے، اس عرصہ میں کوفہ کے طبیب اور معالج جمع ہو چکے تھے، ان میں مشہور جراح اور طبیب، اثیر بن عمرو سکونی بھی تھا، اس نے زخم کا جائزہ لینے کے بعد کہا: ''اس کاری ضرب سے جانبر ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے، زہر آلود تلوار سے مغز سر بھی متاثر ہوا ہے اور جسم میں زہر بھی پھیل چکا ہے، اگر کوئی آخری وصیت کرنی ہے تو کر لیں'' یہ سن کر سب کو حضرتؑ کی زندگی سے ناامیدی ہوگئی سینوں میں دل بیٹھنے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ شہادت کے لمحات جوں جوں قریب ہوتے آ رہے ہیں، گھر میں کہرام بڑھتا جا رہا ہے، آپؑ کی اولاد آپؑ کے اطراف میں بیٹھی آنسو بہا رہی ہے۔ اتنے میں امیر المومنینؑ نے اپنے فرزند امام حسین علیہ السلام کو دیکھا جو ایک طرف گریہ میں مشغول ہیں، مولاؑ نے ان سے فرمایا: بیٹا! تمہارے نانا رسولؐ اور ماں فاطمہ زہراؑ اور حمزہ سید الشہداء علیہم السلام سب آئے ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ''علیؑ جان! جلدی آؤ، ہم تمہارے انتظار میں ہیں''

جو علیؑ مسجد کوفہ کے منبر پر بارہا یہی کہا کرتا تھا: ''مَازِلْتُ مَظْلُوْمًا مُنْذُ قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ''جب سے رسول خدا (ص) کی رحلت ہوئی ہے، میں مظلوم چلا آ رہا ہوں، آج وہی یہ کہہ کر دنیا سے رخصت ہو رہا ہے: ''مَا کُنْتُ اِلَّا کَقَارِبٍ وَرَدَ وَ طَالِبٍ وَّجَدَ ''میری مثال اس پیاسے کی سی ہے جو رات کی تاریکی میں ایک

وسیع و عریض صحرا میں بہتے پانی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہو، اچانک اسے پانی مل جائے۔ خدا سے میری دعا تھی موت کا جو وقت مقرر ہے، اس میں مجھے طبعی موت نہیں بلکہ شہادت کی موت آئے اور میں راہِ خدا میں مارا جاؤں، سو وہ میری یہ آرزو بھی پوری ہوگئی۔

حضرتؑ نے بیسویں اور اکیسویں رات انتہائی کرب و تکلیف میں گزاری اور جب اکیسویں رات کا دوتہائی حصہ گزرا تو حالت دگرگوں ہوگئی، پیشانی پر موت کا پسینہ آیا اور کلمہ شہادت پڑھ کر جان، جہان آفرین کے سپرد کردی اور روح طیب عالم قدس کی طرف پرواز کرگئی۔ تقویٰ اور راست بازی کا چراغ گل ہوگیا۔ علم وعمل کا آفتاب گہنا گیا۔ دنیا تیرہ و تاریک ہوگئی۔ افسوس جس کی زیست کا ہر لمحہ حق کی نصرت اور باطل کے خلاف جہاد میں گزرا ایک شقی ازلی کی تلوار سے مجروح ہوکر دنیا سے چل بسا اور جس کی راتیں محراب عبادت میں جاگ کر گزریں لحد کا گوشہ آباد کرنے کے لیے ابدی نیند سو گیا۔

تجہیز و تکفین

اکیسویں رات کے چند لمحے ابھی باقی ہیں، چاند کی پھیکی پھیکی روشنی فضا میں پھیلی ہوئی ہے، ستارے تھرتھرا رہے ہیں اور کاشانہ امامت میں خاموشی چھائی ہوئی ہے، ایک طرف اعزہ کا مجمع ہے اور ایک جانب چند اصحاب حسرت و اندوہ کی تصویر بنے کھڑے ہیں اور آہوں اور آنسوؤں میں غسل و کفن کا سامان کیا جارہا ہے، چنانچہ آپ کو اپنی وصیت کے مطابق غسل اور کفن دیا گیا، جیسا کہ آپؑ نے حسنین شریفینؑ سے فرمایا کہ:

''غَسِّلَانِیْ وَ کَفِّنَانِیْ وَاحْمِلَانِیْ عَلٰی سَرِیْرِیْ'' تم

دونوں مجھے غسل اور کفن دینا اور مجھے تابوت میں اٹھانا، اس کے اگلے حصے کو اٹھانے کی ضرورت نہیں اسے فرشتے اٹھائیں گے، لہٰذا تم اس کے پچھلے حصے کو اٹھانا۔

بحارالانوار جلد۴۲ ص۲۳۶ میں حضرت محمد حنفیہ فرماتے ہیں کہ میرے دونوں بھائی حسنین شریفین والد گرامی کو غسل دے رہے تھے اور میں قریب کھڑا پانی دے رہا تھا اور دونوں شہزادے غسل تو دے رہے تھے، لیکن انجام غسل کے لیے انہیں حرکت نہیں دے رہے تھے، بلکہ بدن مطہر خود بخود حرکت کرتا تھا، چونکہ حضرت محمد حنفیہ فرشتوں کو نہیں دیکھ رہے تھے روایات منقولہ بتاتی ہیں کہ آپؑ کے بدن مبارک کو غسل کی انجام دہی کے لیے فرشتے مدد کررہے تھے اور جب غسل کا عمل مکمل ہوگیا تو امام حسن علیہ السلام نے اپنی ہمشیرہ محترمہ زینب عالیہ سلام اللہ علیہا سے فرمایا: ''بہن زینبؑ! نانا رسول اللہ (ص) کے غسل سے بچ جانے والا کافور لے آیئے!''

یہ وہی کافور ہے جسے حضرت رسالت مآبؐ کے لیے بہشت سے حضرت جبرائیلؑ لے کر آئے تھے، جس کے کچھ حصے سے جناب رسول خدا (ص) اور حضرت فاطمہ زہراؑ کو غسل اور حنوط کیا گیا تھا۔

حضرت محمد حنفیہ کہتے ہیں کہ جب کافور لایا گیا، اس میں اس قدر خوشبو تھی کہ تمام فضائے کوفہ مہک اٹھی غسل و حنوط کے بعد سفید کپڑوں کا کفن دیا گیا اور امیرالمومنینؑ کی حسب وصیت آپ کے فرزندان نے راتوں رات جنازہ اٹھایا اور تابوت کو پیچھے سے اٹھایا گیا اور آگے سے خود بخود اٹھ گیا اور وہ چلتے ہوئے کوفہ کی غربی جانب حیرہ کی طرف چل دیئے، جب حیرہ کے قریب سرزمین نجف میں پہنچے جہاں کے لیے حضرتؑ نے وصیت فرمائی تھی، جنازہ زمین پر رکھ دیا، کتاب الاخبار الطّوال ص۲۱۶ میں ابن قتیبہ دینوری نے تحریر کیا ہے: ''دُفِنَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ وَ صَلّٰی

عَلَيْهِ الْحَسَنُ وَ كَبَّرَ خَمْسًا'' علی رضی اللہ عنہ مدفون ہوئے اور حسن علیہ السلام نے نماز جنازہ پڑھی اور پانچ تکبیریں کہیں۔

دفن کرنے کے لیے سفید پہاڑیوں کے درمیان ایک مقام سے مٹی کو ہٹایا گیا تو قبر اور لحد تیار ملی اور ایک لوح نمودار ہوئی جس پر تحریر تھا:

''هٰذَا قَبْرٌ حفرَهُ نُوحٌ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِعَلِيِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَصِیُّ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهٖ وَسَلَّمَ قَبْلَ الطُّوْفَانِ بِسَبْعِ مِأَةَ سَنَةٍ'' یہ وہ قبر ہے جسے (شیخ الانبیاء) حضرت نوح علیہ السلام نے عالمی طوفان سے سات سو سال پہلے وصی رسول علی بن ابی طالب علیہ السلام کے لیے تیار کیا ہے، حضرات حسنین علیہما السلام، حضرت محمد بن حنفیہ اور جناب عبداللہ بن جعفر قبرِ مقدس میں اترے اور نعش اقدس کو لحد میں اتارا اور لحد کو اینٹوں سے بند کر کے مٹی ڈالی اور حضرتؑ کی وصیت کے مطابق جو امام حسن علیہ السلام کو کی تھی ''ثُمَّ غَيِّبْ قَبْرِیْ'' جب مجھے دفن کر لو تو میری قبر کو چھپا دو، لہٰذا اسے زمین کے برابر کر دیا گیا۔

تدفین کے موقع پر صعصعہ بن صوحان عبدی بھی موجود تھے، انہوں نے مولائے کائناتؑ کی قبر اطہر پر کھڑے ہو کر ایک ہاتھ دل پر اور ایک ہاتھ مولا کی قبر پر رکھا اور کہا:

''هَنِيْئًا لَکَ يَا اَبَاالْحَسَنِؑ! فَلَقَدْ طَابَ مَوْلِدُکَ وَ قَوِیَ صَبْرُکَ وَ عَظُمَ جِهَادُکَ'' ثُمَّ بَكٰی بُكَاءً شَدِيْدًا وَ اَبْكٰی كُلُّ مَنْ كَانَ مَعَهُ.

مولاؑ! آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ اس دنیا سے چلے گئے ہیں، یقیناً آپؑ کی ولادت کے وقت آپ کی اس دنیا میں تشریف آوری نہایت پاکیزہ تھی، آپ نے عظیم صبر کا مظاہرہ کیا اور راہِ خدا میں جہاد کا حق ادا کیا..................اور بد قسمت ہیں وہ لوگ جنہوں نے آپ کو نہیں پہچانا اگر لوگ آپ کو پہچان لیتے تو زمین و آسمان سے خدا کی برکتیں ان پر نازل ہوتیں۔

ان جملوں کے ساتھ وہ خود بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور دوسروں کو بھی رلا دیا۔

صَلَّی الْاِلٰهُ عَلٰی جِسْمٍ تَضَمَّنُهُ
قَبر فَاَصْبَحَ فِيْهِ الْعَدلُ مَدْفُوْنًا

خدا کی رحمتیں ہوں مقدس جسم پر جسے قبر نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عدل و عدالت ہی اسی خاک میں دفن کیے جا چکے ہیں۔

نجف کے ریگزاروں میں نعش اطہر کو خاموشی کے ساتھ سپرد لحد کر دیا گیا اور لوگوں کو دفن کا علم اس وقت ہوا جب جناب حسنین علیہما السلام اور دوسرے اعزہ واصحاب پلٹ کر کوفہ واپس آئے، اب آپ کی قبر کے بارے عوام میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں کہ آپ کو کس جگہ دفن کیا گیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرتؑ نے شہادت سے پہلے اپنے فرزند حضرت امام حسن علیہ السلام کو وصیت فرمائی کہ ''میری قبر کو مخفی رکھا جائے'' اسی وجہ سے آپ کو راتوں رات اور طلوع فجر سے پہلے سپرد لحد کیا گیا، لیکن اکیس رمضان المبارک کے دن صبح کے وقت چند تابوت تیار کیے گئے اور انہیں مختلف اونٹوں پر رکھ کر مختلف اطراف میں روانہ کیا

گیا، ایک اونٹ مدینہ کی طرف روانہ کیا گیا، اس عنوان سے کہ آپ کا جسد اطہر حضرت فاطمہ زہراؑ کے پہلو میں دفن کیا جائے، دوسرے کو قبیلہ بنی طے کی طرف روانہ کیا گیا، کوفہ میں بھی کئی جگہوں پر زمین کو کھودا گیا، اس عنوان سے کہ ان میں سے کوئی ایک آپ کی قبر ہے، ایک جگہ کوفہ کے مضافاتی علاقہ ''ثَوِیّـہ'' میں، اسی طرح کوفہ کے قصر دارالامارہ کے حدود میں ایک قبر کھودی گئی، لیکن جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ مخفی طور پر آپ کے پیکر اقدس کو کوفہ کی بیرونی حدود ''غری'' یا نجف اشرف میں دفن کیا گیا اور اس کا صحیح علم امیر المومنینؑ کی اولاد اور ان مخصوص اصحاب کے علاوہ جو شریک جنازہ تھے کسی کو نہ تھا۔

آپؑ کی قبر کو کیوں مخفی رکھا گیا؟

حضرت امیر علیہ السلام کی مرقد مبارک کو مخفی رکھنے کی دو وجوہات ہیں۔

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۲ ص ۳۲۹ کے مطابق حضرت امیر المومنین علیہ السلام کو معلوم تھا کہ چند دن بعد تمام کوفہ بنی امیہ کے قبضے میں آجائے گا اور آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ بنی امیہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کریں گے، حجاج بن یوسف تو شدید اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ آنجنابؑ کی قبر مبارک کو تلاش کیا جائے چنانچہ اس نے حکم دیا کہ کوفہ کے قصر کی زمین کو چند مقامات سے کھودا جائے شاید آپ کی قبر مل جائے

۲۔ بنی امیہ کے علاوہ ''نہروان کے خوارج'' کو بھی امیر علیہ السلام کی ذات سے بہت سخت عداوت تھی اور آپ کا قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی بھی خارجی تھا، لہٰذا صورت حال کا یہی تقاضا تھا کہ آپ کی قبر مخفی رکھی جائے، لیکن اس سے آپ کے فرزند اور چند خاص شیعہ باخبر تھے کہ آپ کی قبر کہاں ہے؟ بعد میں ثابت بن دینار ___ ابوحمزہ ثمالی ___ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے ذریعہ اس سے

باخبر ہوئے ___ جبکہ امام علیہ السلام نے اپنے سفر اسارت کے علاوہ بعد میں کوفہ کا سفر اختیار کیا تھا ___

قبر کے اخفاء کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا یہاں تک کہ ایک دن ہارون شکار کی غرض سے کوفہ کے اطراف تک جا پہنچا اور وہاں پر زمین کے ایک حصے پر پہنچا جہاں پر شکار ہونے والے جانور پناہ حاصل کرتے تھے اور وہاں سے فرار نہیں کرتے تھے۔

اس نے دل میں سوچا کہ اس مسئلے کا یقیناً کوئی ایک راز ضرور ہے، اس نے حکم دیا کہ اس جگہ کے بارے میں تحقیق اور جستجو سے کام لیا جائے، یہاں تک کہ ایک نہایت ہی بوڑھے شخص کو اس کے پاس لایا گیا اس نے اس سے وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا: ''ہارون! اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں؟'' ہارون نے کہا: ''یقیناً تم امان میں ہو'' اس نے کہا: ''جس حد تک مجھے معلوم ہے وہ یہ کہ ہمارے آقا و مولا علی بن ابی طالب علیہ السلام کی قبر مبارک اسی جگہ پر ہے، جہاں پر جانور آکر پناہ لیتے ہیں''

یہ سن کر ہارون گھوڑے سے اترا، آنجنابؑ کی قبر کے کنارے نماز ادا کی اور سب سے پہلے جس شخص نے اس جگہ سائے کا بندوبست کیا ہے، یہی ہارون ہی تھا۔

___ یاد رہے کہ حضرت امیر علیہ السلام کی شہادت سے لے کر تقریباً ۱۳۰ سال تک آپ کی قبر مبارک مخفی رہی، کیونکہ مولا کی شہادت ۴۰ھ میں ہوئی اور ہارون ۱۷۰ھ میں تخت پر بیٹھا، یہ درمیانی عرصہ ۱۲۸ تا ۱۳۰ سال بنتا ہے ___

ایمان مجسم کی بارگاہ میں خراج عقیدت

ایمان مجسم امام معظم امیر المومنین علیہ السلام کی شہادت عالم اسلام کے لیے ایک عظیم سانحہ تھی، جس نے انسانی اقدار سے آشنا ہر فرد بشر کو متاثر کیا، خصوصاً کوفہ میں

ہر شخص غمگین اور افسردہ تھا، آپ کے عزیز و اقارب کی نظروں میں تو دنیا تیرہ و تاریک ہو چکی تھی، رنج و غم نے دوستوں کا ذہنی سکون تہہ و بالا کر دیا، بلکہ دشمن بھی حضرت کی شخصیت اور کردار کی بلندی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان کی زبانوں پر ایسے کلمات آ گئے جن میں آپ کی عظمت کا واضح اعتراف کیا جاتا ہے اس سلسلے میں چند تاثرات ملاحظہ فرمایئے جنہیں تاریخ کے صفحات نے محفوظ کر لیا ہے۔

چنانچہ آپ کی تدفین سے فارغ ہو کر حضرت امام حسن علیہ السلام نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا، جسے تاریخ کامل نے جلد۳ ص۲۰۱ میں درج کیا ہے: امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: ایک بزرگوار ہستی کو اس رات میں قتل کیا گیا جس میں قرآن نازل ہوا، عیسیٰؑ آسمان پر اٹھائے گئے اور یوشع بن نون قتل ہوئے، خدا کی قسم! اگلے لوگوں میں سے کوئی ان پر سبقت نہ لے جا سکا اور بعد میں سے کوئی ان کے مقام و مرتبے کو نہ پا سکے گا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس نے کہا: ''خدا کی قسم! دنیا ان کی نظروں میں جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ بے قیمت تھی، وہ رزم میں شیر، بزم میں دریا اور صف حکماء میں حکیم و دانا تھے، افسوس کہ وہ چل بسے اور درجات عالیہ پر فائز ہو گئے''
بحار الانوار میں ہے کہ: صعصعہ بن صوحان عبدی نے قبر مبارک پر ہاتھ رکھ کر کہا: میں اللہ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ ہم پر احسان فرمائے کہ ہم آپ کے نقش قدم پر چلیں، آپ کی سیرت پر عمل کریں، آپ کے دوستوں سے دوستی اور دشمنوں سے دشمنی رکھیں اور اللہ ہمیں آپؑ کے دوستوں میں محشور فرمائے، جو مرتبہ آپؑ نے پایا وہ کوئی نہ پا سکا اور جو مقام آپؑ نے حاصل کیا وہ کوئی نہ حاصل کر سکا''

کتاب الاستیعاب جلد۳ ص۴۵ میں ہے:

امیر شام نے ایمان مجسم کی خبر شہادت کو سن کر کہا: ''ذَهَبَ الْفِقْهُ وَالْعِلْمُ

بِمَوْتِ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ''

ابن ابی طالبؑ کی موت سے فقہ اور علم کا خاتمہ ہو گیا۔

ریاض النضرۃ ص۳۴۰ میں ہے:

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایمان مجسم کی خبر شہادت سن کر کہا: ''لِتَصْنَعِ الْعَرَبُ مَا شَائَتْ فَلَیْسَ لَهَا اَحَدٌ یَنْهَاهَا'' اب اہل عرب جو چاہیں کریں اس لیے کہ اب انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں رہا ہے۔

قتل ایک جرم ہے مگر قتل کی نوعیت مقتول کی حیثیت اور اس پر مرتب ہونے والے نتائج و اثرات کے اعتبار سے اس کی سنگینی اور سزا کے درجوں میں فرق ہو سکتا ہے۔ ایک عام فرد کا قتل، جرم اور بڑا جرم ہے، مگر قتل مومن اس سے بھی بڑھ کر جرم ہے، جس کی سزا نص قرآنی کی رو سے دوزخ کا دائمی عذاب ہے اور امیر المومنین علیہ السلام کا قتل تو ہر اعتبار سے سنگین جرم اور اور عظیم حادثہ تھا، جس نے دینی حدوں کو پامال اور اسلامی قدروں کو مجروح کر دیا، اس لیے قاتل دنیا و آخرت میں شدید ترین عذاب کا مستحق ہو گا۔

یہ ایک عابد و شب زندہ دار کا قتل تھا، جو محراب مسجد اور سجدہ کی حالت میں واقع ہوا، قاتل نے نہ تقدیس مسجد کا خیال کیا نہ نماز کا احترام ملحوظ خاطر رکھا نہ سجدہ کی حالت پر نظر کی اور اس نمازی کا خون بہایا جو اسلام کا پاسبان، ثانی قرآن اور سراپا ایمان تھا اور اس سانحہ کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ حادثہ اس وقت رونما ہوا جب حضرت لشکر و سپاہ جمع کر چکے تھے اور دو چار دن کے بعد شام کی طرف کوچ کرنے والے تھے تا کہ ایک فیصلہ کن جنگ لڑ کر ضلالت کا سرچشمہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیں، مگر ایسا نہ ہو سکا اور اس قتل کے نتیجے میں غیر شرعی اقتدار کے قدم گڑ گئے اور افق اسلام پر ضلالت و گمراہی کی گھٹائیں چھا گئیں۔

ناظرین! کچھ بعید نہیں کہ اس کی تہہ میں کوئی سازش کارفرما ہو، اس لیے کہ اگر ایک باجگذار کے ذریعے مالک اشترؑ کو اور جعدہ بنت اشعث کے ذریعے امام حسن علیہ السلام کو راستے سے ہٹایا جاسکتا ہے، تو امیرالمومنین علیہ السلام کی زندگی ختم کرنے کا منصوبہ بھی بنایا جاسکتا ہے، کیونکہ امیر شام کو معمولی زخم آتا ہے، حاکم مصر عمرو بن عاص مکمل طور پر بچ جاتا ہے اور اس کی جگہ خارجہ بن حذافہ سہمی آجاتا ہے، بہرحال اقدام کسی خاص تحریک کا نتیجہ ہو یا انتقامی جذبہ کا قاتل کی شقاوت و محسن کشی تاریخ کا ایک مثالیہ ہے اور حضور اکرمؐ نے بھی اپنے ارشاد میں حضرتؑ کے قاتل کو شقی ترین امت اور عاقر ناقہ صالح کے مانند قرار دیا ہے، چنانچہ تاریخ خطیب بغداد جلد ا ص ۱۳۵ میں ہے: ''قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (ص) لِعَلِیٍّ عَلَیْہِ السَّلَامُ مَنْ اَشْقَی الْاَوَّلِیْنَ؟ قَالَ عَاقِرُ النَّاقَۃِ! قَالَ فَمَنْ اَشْقَی الْآخَرِیْنَ؟ قَالَ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہُ اَعْلَمُ! قَالَ قَاتِلُک'' رسول اللہ (ص) نے حضرت علیؑ سے کہا کہ پہلے لوگوں میں شقی ترین مرد کون ہے؟ کہا: حضرت صالحؑ اونٹنی کی کونچیں کاٹنے والا، فرمایا بعد والوں میں زیادہ شقی کون ہے؟ کہا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے، فرمایا: وہ تمہارا قاتل ہے۔

ناقہ حضرت صالحؑ کا معجزہ تھا اور حضرت علی بن ابی طالب پیغمبر اسلامؐ کا معجزہ تھے،: یکے از معجزات او علیؑ بود'

اگر ناقہ صالح کی کونچیں کاٹنے والا جہنم کا مستحق قرار پاچکا ہے تو علی علیہ السلام کا قاتل دوزخ کے عذاب سے کیونکر بچ سکتا ہے؟ جبکہ دونوں نے یکساں نبوت کے معجزے کو ختم کیا اور آیت الٰہیہ کو مٹایا۔

اس کے بعد ابن حزم وغیرہ کی اس رائے کو کوئی وزن نہیں دیا جاسکتا کہ یہ قتل خطائے اجتہادی کا نتیجہ تھا اور نہ اس طرح جرم کی سنگینی کو ہلکا کر کے قاتل کو اجر و ثواب کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ ہیں ایسے لوگ جنہوں نے حضرت علی علیہ السلام کے

قتل کو خطائے اجتہادی یا اجتہادی غلطی سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ ابن حزم اور اس کے ہمنواؤں نے عبدالرحمان بن ملجم کے اقدام قتل کو خطائے اجتہادی یعنی اجتہادی غلطی قرار دیا ہے، چنانچہ ابن حجر عسقلانی تلخیص الکبیر ص ۳۴۸ میں تحریر کرتے ہیں کہ: ''وَ بَالَغَ ابْنُ حَزْمٍ فَقَالَ لَا خِلَافَ بَیْنَ اَحَدٍ مِنَ الْاَئِمَّۃِ فِیْ اَنَّ ابْنَ مُلْجِمٍ قَتَلَ عَلِیًّا مُتَاَوِّلًا مُجْتَھِدًا، مُقَدِّرًا اَنَّہٗ عَلَی الصَّوَابِ'' یعنی ابن حزم نے یہ کہہ کر مبالغہ سے کام لیا ہے کہ ائمہ میں سے کسی ایک نے بھی اختلاف نہیں کیا کہ ابن ملجم نے علیؑ کو اجتہاد کرتے ہوئے تاویل کے طور پر قتل کیا اور وہ اس قتل میں اپنے تئیں حق بجانب سمجھتا تھا۔

ایسے ہی لوگوں نے اصحاب جمل کے اقدام پر خطائے اجتہادی کا پردہ ڈالا ہے جن کے اقدام سے ہزاروں بے گناہوں کا خون بہادیا گیا، جب صورت حال یہ ہو تو امیر شام کے اس عظیم کشت و خون کو بھی خطائے اجتہادی سے نوازنا کوئی دور کی بات نہیں ہے اور حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ جس اقدام کو بغاوت سے تعبیر فرمائیں اس پر اجر و ثواب کا استحقاق ثابت کیا جائے، کیا پیغمبر گرامی اسلام (ص) کا یہ ارشاد ان کے گوش گزار نہیں ہوا تھا جو صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۲ میں ہے:

''وَیْحٌ عَمَّارٌ تَقْتُلُہُ الْفِئَۃُ الْبَاغِیَۃُ عَمَّارٌ یَدْعُوْھُم اِلَی اللّٰہِ وَ یَدْعُوْنَہٗ اِلَی النَّارِ'' عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا، عمار انہیں اللہ کی طرف بلائیں گے اور وہ انہیں جہنم کی طرف بلائے گا۔

اور پھر اس پر ڈھٹائی یہ کہ بقول ابن اثیر تاریخ کامل جلد ۳ ص ۱۵۸ کہ امیر شام نے کہا: ''اَنَحْنُ قَتَلْنَاہُ اِنَّمَا قَتَلَہٗ مَنْ جَآءَ بِہٖ'' کیا ہم نے اسے قتل کیا ہے؟

قتل تو اس نے کیا ہے جو انہیں لے آیا ہے۔

امیر شام کی ڈھٹائی پر مبنی یہ تاویل سن کر شامیوں میں سے ہر ایک شخص یہ کہتا سنا گیا: ''اِنَّمَا قَتَلَ عَمَّارًا مَنْ جَآءَ بِهٖ'' عمار کا قاتل تو وہ ہے جو انہیں لے کر آیا ہے، حضرت علیؑ نے جب یہ پرفریب تاویل سنی تو فرمایا: تو پھر حمزہ کے قاتل، رسول اللہ تھے جو انہیں میدان احد میں لے کر آئے تھے۔

حالانکہ یہ حقیقت تاریخ کے صفحات میں موجود ہے کہ جب جنگ صفین میں حضرت عمار جس طرف سے ہو کر گزرتے تو صحابہ ہجوم کر کے ساتھ ہو جاتے، امیر شام نے جب اس جمِ غفیر کو بڑھتے دیکھا تو ابوالاعور سلمی کی قیادت میں تازہ دم فوجوں کو میدان میں اتارا، عمار یاسر نے سپاہِ شام میں عمرو بن عاص کو دیکھا تو اسے مخاطب کر کے فرمایا: ''تُف ہے تیری اوقات پر، تو نے مصر کی چند روزہ حکومت کی خاطر اپنا دین تک بیچ ڈالا!! اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے تو نے ہمیشہ اسلام کے خلاف بغاوت کر کے اپنی کجروی کا ثبوت دیا ہے'' عمرو نے کہا: ''ہم خون خلیفہ کا بدلہ لے رہے ہیں'' عمار نے کہا: تو نے یہ قدم اللہ کو خوش کرنے کے لیے نہیں اٹھایا میں اس سے پہلے بھی تین مرتبہ رسول خدا کے لشکر میں شامل ہو کر تجھ سے لڑ چکا ہوں اور جس نظریہ کی بنا پر پہلے لڑا تھا آج بھی اسی نظریئے کو سامنے رکھ کر لڑ رہا ہوں، اے عمرو! تو پیغمبر خدا (ص) کا یہ ارشاد بھول گیا کہ: ''اے عمار! تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا تم اسے جنت کی طرف بلاؤ گے اور وہ تمہیں دوزخ کی طرف دعوت دے گا'' مجھے دیکھ اور پہچان میں عمار ہوں'' عمرو بن عاص کے پاس ان باتوں کا جواب ہی کیا تھا، سن کر چپ ہو رہا۔

غرض اس قدر جرائم پر پردہ ڈالنے کا یہی بہترین طریقہ سوچا گیا کہ اس قسم کے اقدام کو خطائے اجتہادی کا نتیجہ قرار دیا جائے، حالانکہ اس میں تو کسی کے لیے شک اور شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ امیر شام کا اقدام خلیفہ برحق کے خلاف ایک

جارحانہ اور باغیانہ اقدام کی حیثیت رکھتا ہے، حیرت تو اس بات پر ہے کہ حضور پیغمبر اکرمؐ جس اقدام کو بغاوت سے تعبیر فرمائیں اس پر اجر وثواب کا استحقاق ثابت کیا جائے اور پیغمبرؐ کے ارشاد کے بعد اجتہادی غلطی سے تعبیر کرنا اور اس کے مرتکب کو اجر و ثواب کا مستحق قرار دینا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے، حالانکہ اجتہاد نام ہے اس کے ماخذ و مدرک سے حکم شرعی کے استنباط کا، پھر کس ماخذ سے اس جنگ کا جواز اخذ کیا گیا؟ جبکہ بغاوت کے معنی ظلم وفساد کے ہیں اور ظلم وطغیان کو اجتہاد سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

اسی طرح پیغمبر اکرمؐ نے ابن ملجم کے بارے میں ''اَشْقٰی هٰذِهِ الْاُمَّةِ'' یعنی اس امت کا شقی ترین فرد فرمایا تھا، اسی طرح یہ گروہ عمار یاسر کے قاتل ابوالغادیہ فزاری کو خطائے اجتہادی کا مرتکب قرار دیتا ہے، حالانکہ پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد ہے: ''قاتل عمار و سالبه فی النار'' یعنی عمار کا قاتل اور ان کا سامانِ جنگ چھیننے والا دوزخ میں جائے گا۔

تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ اور عمار یاسر کے قاتلوں کو مجتہد مُخطی تجویز کر کے انہیں اجر وثواب کا مستحق قرار دیا جاتا ہے اور ایک خلیفہ کے قاتلین و محاصرین کو ابن حزم اور ان کے ہم مسلک افراد صحابیت کی تمام قدروں کو نظر انداز کر کے باغی، ظالم، فاسق، مفتری، کاذب اور ملعون وغیرہ کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور ان کے لیے خطائے اجتہادی کا ادنیٰ احتمال بھی گوارا نہیں کیا جاتا، حالانکہ ان میں افاضل صحابہ، اکابر مجتہدین اور صلحاءِ امت شامل تھے۔

اس اجتہاد کی کارفرمائی کا یہ پہلو بھی قابلِ توجہ ہے کہ امیر شام ایک موقع پر قیصر روم کو ہدایا وتحائف پیش کر کے صلح کا پیغام دیتے ہیں مگر جن کے ہاتھوں پر انصار و مہاجرین نے بالاتفاق بیعت کر لی تھی، ان کے خلاف محاذ جنگ قائم کرتے ہیں، کیا

اجتہاد اسی کا نام ہے کہ ایک کافر سے دوستی کی طرح ڈالی جائے اور علیؑ، اصحاب بدریین شرکاء بیعت رضوان اور انصار و مہاجرین اولین کے ساتھ دو چار مولفۃ القلوب قسم کے صحابیوں اور بساط اسلام پر تازہ وارد ہونے والے شامیوں کے ذریعہ جنگ کی جائے؟ یہ دعوائے اجتہاد دنیا کی نرالی اُپَج ہے۔

یہی کیفیت اصحاب جمل کی ہے، جن کے اقدام کا نہ کوئی اخلاقی جواز تھا اور نہ شرعی، ان کی شخصیتیں کتنی ہی اہم سہی مگر جرم بہر حال جرم ہوتا ہے، خواہ اس کا مرتکب کوئی ہو، بلکہ شخصیت کا عنوان جرم کو اور سنگین بنا دیتا ہے، انہوں نے ایک ایسا خونریز اقدام کیا جس سے نہ انکار کی کوئی گنجائش ہے اور نہ کشت و خون کی ذمہ داری سے انہیں بری ثابت کیا جا سکتا ہے، البتہ ایک طبقے نے صحابیت کے تحفظ کے لیے مختلف حیلوں بہانوں سے اس جرم کی سنگینی کو ہلکا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے جواز کے لیے وہی خطائے اجتہادی (یعنی اجتہادی غلطی) کا سہارا ڈھونڈ نکالا ہے، یہ خطائے اجتہادی کی کارفرمائی صرف اسی مورد کے لیے نہیں بلکہ یہ ایک عام حربہ ہے کہ جہاں کوئی جواب نہیں بن پڑتا وہاں اس کی آڑ لی جاتی ہے اور غلط سے غلط اقدام کے لیے جواز کا پہلو پیدا کر لیا جاتا ہے، تاکہ وابستگان دامن کی عقیدتوں کو محفوظ رکھا جا سکے۔

اسے لاکھ اجتہادی غلطی سے تعبیر کیا جائے مگر ارباب فکر و نظر کو یہ ذہنی خلش ضرور محسوس ہوگی کہ اگر یہ خطائے اجتہادی یا اجتہادی غلطی ہے تو غیر اجتہادی غلطی اور خطائے منکر کس چیز کا نام ہے؟

اگر اس عظیم کشت و خون کو خطائے اجتہادی کے دامن میں پناہ مل سکتی ہے تو اس خطا کے ارتکاب کرنے والوں پر نقد و تبصرہ کیوں جائز نہیں؟ اور اگر ان کے خلاف رائے قائم کی جائے تو اسے بھی اجتہادی غلطی پر محمول کر کے نظر انداز کر دینے میں کیا مانع ہے؟ اور پھر یہ کہ ان کا یہ اجتہاد کون سے شرعی اصول و قواعد کے ماتحت تھا؟ اور کن

دلائل سے ایک خون کے بدلے میں ہزار ہا بے گناہوں کا خون بہانا جائز ہو گیا تھا؟ کیا قرآن مجید کا کوئی حکم تھا؟ یا پیغمبر اکرمؐ کی کوئی حدیث تھی؟ یا اہلِ حل و عقد کا اجماع تھا؟ یا کسی شرعی قاعدہ کے تحت قیاس تھا؟ اور یہی چاروں چیزیں مدعیان خطائے اجتہادی کا ماخذ سمجھی جاتی ہیں اور جب ان میں سے کوئی چیز ثابت نہیں کی جا سکتی تو اجتہاد ہی کہاں رہا کہ اسے خطا پر محمول کر کے ان کے موقف کی صفائی پیش کی جا سکے۔

اس سلسلے میں کچھ لوگوں نے یہ بات بنائی کہ امیر المومنینؑ کے لشکر میں سے ان لوگوں کو جو خلیفہ کے قتل میں پیش پیش تھے فریقین میں صلح کے آثار نظر آئے تو انہوں نے صلح کو اپنے مقصد اور مفاد کے خلاف سمجھتے ہوئے عبد اللہ بن سبا کی انگیخت پر منہ اندھیرے لشکر مخالف پر دھاوا بول دیا اور اصحاب جمل کا روپ دھار کر حضرت علیؑ کے لشکر پر حملہ آور ہوئے اور ہر فریق اپنے مقام پر سمجھا کہ دوسرے فریق نے جنگ کا آغاز کر دیا ہے اور اس طرح فریقین میں غلط فہمی کی بنا پر جنگ چھڑ گئی لہٰذا جنگ میں پہل کرنے کی ذمہ داری فریقین میں سے کسی پر عائد نہیں ہوتی، اگر کسی پر عائد ہوتی ہے تو اس سازشی گروہ پر جس کا سرغنہ ابن سبا تھا اور جو دونوں فریق کو جنگ میں الجھا کر اپنا تحفظ اور مفاد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

حالانکہ یہ واقعہ ایک خود ساختہ افسانہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور روایت و درایت دونوں اعتبار سے ناقابل اعتماد ہے، اس واقعہ کو پہلے پہل ابن جریر طبری نے تاریخ کی اپنی مشہور کتاب میں درج کیا اور طبری سے پہلے کسی مورخ نے نہ تو اسے بیان کیا اور نہ ہی اس کی طرف کوئی اشارہ کیا، البتہ بعد کے مورخین نے اسی کتاب کے حوالے سے اسے خوب اچھالا ہے اور اصحاب جمل کی تمام تر سرگرمیوں سے چشم پوشی کر کے اس جنگ کی تمام تر ذمہ داری اسی مجہول شخصیت ابن سبا اور اس کے ساتھیوں پر ڈالنے کی کوشش کی ہے اور طبری نے اسے ''سیف بن عمر تمیمی'' متوفی ۱۷۰ھ کے

واسطہ سے روایت کیا ہے، جبکہ سیف بن عمر تمام علماء رجال کے نزدیک مفتری، کذاب اور پایہ اعتبار سے ساقط ہے۔ چنانچہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں تحریر کیا ہے کہ یحییٰ کہتے ہیں کہ ''فَلَیْسَ خَیْرٌ مِنْهُ'' ایک کوڑی بھی اس سے بہتر ہے، ابوداؤد کہتے ہیں: ''لَیْسَ بِشَیْءٍ'' کوئی چیز نہیں، ابوحاتم کہتے ہیں: ''متروک'' یعنی ناقابل روایت ہے، ابن حبان کہتے ہیں: ''اُتُّهِمَ بِالذَّنْدَقَةِ'' یعنی بے دینی اور ملحد ہونے کے ساتھ متہم ہے۔

غرض کہ کسی ایک فرد نے بھی اس کی توثیق نہیں کی اور نہ اسے قابل روایت سمجھا ہے، لہٰذا ایک ایسے شخص کی روایت پر جو بالاتفاق ساقط عن الاعتبار ہو، اعتماد نہیں کیا جا سکتا، بلاذری صاحب انساب الاشراف ابن سعد صاحب طبقات اور طبری کے معاصر ابن اعثم صاحب تاریخ اس کا تذکرہ کرتے، تو کیا ایسی روایت پر آنکھ بند کر کے اعتماد کر لینا حقائق سے عمداً پردہ پوشی کے مترادف نہیں ہے؟

اب روایت کو درایۃً دیکھتے اور پرکھتے ہیں کہ کہاں تک تسلیم کیے جانے کے قابل ہے؟ تو جس شخص کے سامنے واقعات جمل کے اسباب وعلل اور اصحاب جمل کے اغراض و مقاصد ہیں وہ اس سے انکار نہ کر سکے گا کہ یہ روایت واقعات میں ایک غیر متعلقہ اضافہ اور حقائق کے دامن میں ایک بے جوڑ پیوند ہے، جس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ اس جنگ کو غلط فہمی کا نتیجہ قرار دے کر اصحاب جمل کو معذور اور حق بجانب ثابت کیا جائے۔

کہنے کو تو کہہ دیا گیا کہ یہ جنگ غلط فہمی کا نتیجہ تھی مگر تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ باقاعدہ جنگ چھڑنے سے پہلے حضرت علیؑ اور فریق ثانی کے نمائندوں میں گفت و شنید اور افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری رہا، حتیٰ کہ خود حضرتؑ نے اس جنگ کے سربراہان سے خود گفتگو کی اور انہیں جنگی عزائم سے باز رہنے کی تلقین کی، کیا وہ اس

موقع پر نہ کہہ سکتے تھے کہ ہم تو صلح پر آمادہ تھے، آپ ہی کے لشکر نے ہم پر اچانک حملہ کر دیا اور جنگ چھیڑ دی، مگر وہ اس کی طرف ایک ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں کرتے حالانکہ اس موقع پر زبان بند رکھنے کے کوئی معنی ہی نہیں تھے، یا جب جنگ سے پہلے حضرت علیؑ نے مسلم مجاشعی کو قرآن دے کر بھیجا تھا کہ وہ انہیں قرآنی تعلیمات یاد دلائیں، تو انہیں کہنا چاہیئے تھا اب علیؑ نے مسلم مجاشعی کو قرآن دے کر بیچ میں لاکر معاملے کو نمٹانا چاہا ہے اور مصالحت کی پیش کش کی ہے، حالانکہ انہی کے لشکر نے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر شب خون مارا ہے اور جنگ و قتال کا آغاز کیا ہے؟ مگر اس موقع پر بھی ان کی زبان سے اس قسم کی کوئی بات نہیں نکلتی۔

اس طرح بی بی صاحبہ اس کی طرف کبھی تو اشارہ کرتیں کہ ایسا غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے، حالانکہ جنگ کے بعد جب ان سے جنگ کے بارے میں پوچھا جاتا تھا تو وہ خاموشی کی بجائے اس چیز کو اپنے موقف کے حق بجانب ہونے کے ثبوت میں پیش کر کے پوچھنے والوں کو ایک حد تک مطمئن کر سکتی تھیں اور پھر اس مفروضہ شب خون سے پہلے جو کشت و خون کیا گیا تھا اور سینکڑوں آدمیوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا تھا وہ کس غلط فہمی کی بنا پر اور کس کی انگیخت پر ہوا؟

جو لوگ یوں بے گناہوں کو قتل و غارت کر سکتے ہیں انہیں جنگ لڑنے میں کیا باک تھا کہ یہ کہا جائے فریقین غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔

اس سلسلے میں جس مجہول شخصیت عبداللہ بن سبا کو شب خون کا محرک قرار دیا جاتا ہے، وہ ڈاکٹر طہٰ حسین مصری، جورج جرداق لبنانی اور دوسرے محققین کے نزدیک کوئی تاریخی وجود ہی نہیں رکھتا، ورنہ جس شخصیت کا نام قتل خلیفہ اور جنگ جمل میں ایک مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے، اس کا نام صفین، تحکیم اور جنگ نہروان کے موقع پر بھی سنائی دیتا اور ان موقعوں پر اس کا کارنامہ نہ بھی ہوتا جب بھی

اس کا نام کہیں نہ کہیں تو آتا، مگر وہ جنگ جمل کے بعد صفحات تاریخ سے اس طرح ناپید ہوجاتا ہے کہ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوا؟ اور نہ یہ پتا چلتا ہے کہ شب خون مارنے کے بعد کہاں غائب ہوا اور کہاں مرکھپ گیا؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ افسانوی شخصیت ہنگامہ آرائیوں کی خونچکاں کاروائیوں کا جواز پیدا کرنے کے لیے وقتی طور پر گھڑی گئی اور جب اس کی ضرورت نہ رہی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر دی گئی۔

اگر چہ یہ جنگ ایک وقتی حیثیت رکھتی ہے مگر اس کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لیے دلوں میں گرہ پڑ گئی، امت مختلف گروہوں میں بٹ گئی اور مسلمانوں میں باہم خونریزیوں کا دروازہ کھل گیا، چنانچہ جنگ جمل کے بعد شام سے جنگ کے شعلے بھڑکے اور مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے سروں پر بے دریغ چلیں، اگر اصحاب جمل میدان جنگ میں نہ اترتے تو امیر شام کو حضرت علیؑ کے مقابلے میں کبھی فوج کشی کی جرأت نہ ہوتی، مگر ان لوگوں کے صف آراء ہونے سے نہ صرف ان کی ہمت بندھی بلکہ انہیں اتنا موقع مل گیا کہ وہ جنگ کے لیے لشکر کی فراہمی اور سامان حرب وضرب کی تکمیل کر سکیں اور حضرتؑ سے برسرِ پیکار ہونے کا جواز تو انہیں جنگ جمل سے مل ہی چکا تھا، اس طرح کہ اگر بی بی صاحبہ قبیلہ بنی تمیم سے ہوتے ہوئے، قصاص لینے کے لیے کھڑی ہوسکتی ہیں تو وہ کیوں نہیں کھڑے ہوسکتے؟ جبکہ وہ مقتول کے ہم قبیلہ اور عزیز بھی تھے۔

یہ ایک ایسا مضبوط سیاسی حیلہ تھا جسے امیر شام نے جنگ کے جواز میں پیش کیا اور طلحہ وزبیر جیسی اہم شخصیتوں کے اقدام سے اپنے باغیانہ اقدام کے حق بجانب ہونے پر ثبوت مہیا کر سکے۔

چنانچہ انہوں نے جنگ صفین برپا کی اور پہلے اپنے علاقائی اقتدار کا تحفظ کیا

اور پھر مسند نشین خلافت ہو کر ''خلیفۃ المسلمین'' بن گئے اور پھر اس جنگ صفین کے نتیجہ میں خوارج کی جماعت ابھری، جس نے امیر المومنینؑ سے جنگ لڑنے کے بعد مدتوں تک اسلامی شہروں میں کشت وخون اور تاخت وتاراج کا بازار گرم رکھا اور ایسے ایسے خونی کھیل کھیلے کہ ریگزارِ عرب کے ذرات تک خون میں ڈوب گئے، غرض جنگ جمل سے جنگ صفین اور جنگ صفین سے جنگ نہروان نے جنم لیا۔ ان جنگوں کے نتیجے میں اسلام میں ایسے رخنے پڑے جو آج تک پر نہ ہوسکے اور نہ آئندہ ان کے پر ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے؟ اور جنگ نہروان حضرت امیر المومنینؑ کی شہادت کا موجب ہوئی اور عبدالرحمٰن بن ملجم نے آپ کو محراب عبادت میں شہید کر دیا۔

ابن ملجم اور اس کے ساتھیوں کا انجام:

امیر المومنینؑ کے قتل میں چار افراد عبدالرحمٰن بن ملجم، قطام بنت اخضر، شبیب بن بجرہ اور وردان بن مجالد شریک تھے، جب حادثۂ قتل کے بعد مسجد میں شور بلند ہوا اور لوگ محراب مسجد کی طرف بڑھے تو وردان بھاگ کر اپنے گھر آ گیا، اس کے ایک عزیز کو اس کے شریک قتل ہونے کا علم ہوا تو تلوار سے اس کا کام تمام کر دیا۔

ابن ملجم حملے کے بعد بھاگ نکلا تھا۔ لوگوں نے بھاگتے دیکھا تو اس کا پیچھا کیا اور اسے پکڑ کر مسجد میں لائے، جب امام حسن علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے بعد از تدفین امیر المومنین اسے طلب کیا اور اس سے کہا اے دشمنِ خدا! تو نے امیر المومنینؑ کو کیوں قتل کیا؟ انہوں نے تجھ سے کونسا برا سلوک کیا تھا؟ اس نے کہا: میں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ انہیں قتل کروں گا، میں نے اپنے عہد کو پورا کر دیا ہے، اب آپ کو اختیار ہے چاہے قصاص لیں چاہے معاف کر دیں، اگر آپ مجھے امان دے دیں گے تو میں امیر شام کو قتل کر کے آپ کو ہمیشہ کے لیے مطمئن کر دوں گا۔

امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: تم اسی کے سزاوار ہو کہ تمہیں کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ ہیثم بنت اسود نخعیہ نے کہا کہ اس کا لاشہ میرے حوالے کیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اس نے آگ روشن کر کے اسے جلا دیا، اس کے بعد بپھرے ہوئے ہجوم نے قطام کے گھر کا رخ کیا اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نذرِ آتش کر دیا۔ شبیب بن بجرہ لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو کر بچ رہا، جب امیر شام برسرِ اقتدار آنے کے بعد کوفہ آئے تو شبیب ان کے پاس گیا اور ان کا تقرب حاصل کرنے کے لیے کہا کہ میں علیؑ کو قتل کرنے میں ابن ملجم کا شریک کار تھا، امیر شام نے جب یہ دیکھا تو گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے قبیلہ والوں کو پیغام بھجوایا کہ اگر میں نے پھر شبیب کو یہاں دیکھا تو تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا لہٰذا اسے کوفہ سے باہر نکال دو اس نے یہ سنا تو رات کے اندھیرے میں نکل گیا اور جب مغیرہ بن شعبہ کوفہ کا حاکم مقرر ہوا تو اس کے لشکر کے مقابلے میں اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا۔

نجف اشرف، محل وقوع اور آبادکاری

نجف اشرف، کوفہ سے پانچ میل کے فاصلے پر مغرب کی جانب واقع ہے، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی زمانے میں پانی کا ذخیرہ جمع تھا جو ''اَن'' یا ''نے'' کے نام سے موسوم تھا، جب پانی زمین کی گہرائیوں میں جذب ہو گیا تو ''اَن جف'' یا ''نے جف'' کہا جانے لگا، یعنی ''اَن'' یا ''نے'' خشک ہو گیا، پھر کثرت استعمال سے ''نجف'' کہلانے لگا۔

نجف سے متصل ایک قدیم آبادی تھی جو کوفہ سے تین میل کے فاصلے پر ''حیرہ'' کے نام سے موسوم تھی اور ان دونوں کے درمیان ایک وسیع ریگزار تھا جو

''ملطاط'' کہلاتا تھا۔ حیرہ کی بنیاد کلدانیوں کے فرمانروا ''بُخت النصر'' نے رکھی اور اسکندر مقدونی نے اس کی تعمیر و تجدید میں حصہ لیا۔ کچھ عرصے بعد حیرہ کی آبادی ''انبار'' کی طرف منتقل ہو گئی اور حیرہ ویران ہو گیا۔

آبادیاں اجڑتی اور بستی رہتی ہیں۔ چنانچہ ویرانی کے بعد اس کی آبادی کی پھر صورت نکل آئی اور ''مالک بن فہم'' جو یمن کے غرقاب ہونے کا خطرہ محسوس کر کے وہاں سے نکل کھڑا ہوا تھا اس نے عراق میں طرح اقامت ڈالی اور وہاں اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا، اس کے بعد اس کا بیٹا ''جُزیمہ ابرش'' برسرِ اقتدار آیا اور جب وہ ''زباٗ'' ملکہ جزیرہ کے ہاتھ سے مارا گیا تو اس کا بھانجا عمرو بن عدی ۲۴۰ عیسوی میں شاہ پور اول کے دور میں تخت و تاج کا وارث ہوا، عمرو نے زمام حکومت کو ہاتھوں میں لینے کے بعد حیرہ کو اپنی منزل قرار دیا، جس کے بعد فرمانروایانِ عراق کا مستقل دارالحکومت قرار پا گیا، گھنے باغوں اور نخلستانوں سے اس کی رونق بڑھی اور ''خورنق'' اور ''سُدیر'' ایسی فلک بوس عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

یہاں کے باشندوں کا ذریعہ معاش کاشتکاری اور باغبانی تھا، مگر ایران کے زیر اثر اور اس کی سرحد پر آباد ہونے کی وجہ سے ایرانی سرحدوں اور تجارتی قافلوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتے اور ایران سے اس کا معاوضہ لیتے اور خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے، جب فتح عراق کے بعد کوفہ کی بنیاد رکھی گئی تو یہاں کی آبادی کوفہ منتقل ہو گئی اور اس کی عمارتوں کے اینٹ اور پتھر بھی کوفہ کی بعض عمارتوں کے کام آئے اور حیرہ جو ایک سرسبز اور شاداب مقام تھا ویران اور ریت کا میدان ہو کر رہ گیا۔

جب حیرہ کے جوار میں ایمان مجسم امام معظم امیر المومنین علی علیہ السلام مدفون ہوئے تو پھر آبادی کا رخ ادھر ہو گیا اور دوسری صدی ہجری کے وسط سے مختلف دیار و امصار کے لوگ ترکِ وطن کر کے یہاں آباد ہونے لگے اور یہ آبادی مشہد، نجف

اورغری کے نام سے یاد کی جانے لگی اور''حیرہ'' کا نام صرف صفحات تاریخ پر باقی رہ گیا، بلکہ کوفہ بھی اپنے پھیلاؤ کے باجود اس کی ایک ملحقہ آبادی ہوکر رہ گیا''غری'' کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ''جذیمہ ابرش'' نے نجف کے قریب اپنے دوندیموں مالک اور عقیل کی قبروں پر دو بلند و بالا عمارتیں تعمیر کی تھیں جنہیں''غریین'' کہا جاتا تھا، رفتہ رفتہ غریین کے بجائے زبانوں پر''غری'' آنے لگا، پھر قرب کی وجہ سے سرزمین''نجف'' کو''غری'' کہا جانے لگا۔

جب شیعیان امیرالمومنین علیہ السلام نے یہاں مجاورت اختیار کی تو انہوں نے مرقد امام علیہ السلام کے گرد و پیش حجرے اور جھونپڑیاں تعمیر کرلیں۔ آبادی روز بروز بڑھتی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ تعمیرات میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور جہاں خاک اڑتی تھی وہاں شہر بس گیا۔ نجف سے شام تک خشکی کی راہ تھی اور بادیہ نشین عربوں سے لوٹ مار کا خطرہ رہتا تھا۔ اس خطرے کے پیش نظر امراء و سلاطین شیعہ نے شہر کے گرد چار دیواری کی ضرورت محسوس کی ، چنانچہ سب سے پہلے عضدالدولہ دیلمی نے ۳۶۷ھ اور ۳۷۲ھ کے درمیان عرصے میں مرقد امیرالمومنینؑ کی تعمیر شروع کی تو شہر کے گرد چار دیواری کی تعمیر کا بھی اہتمام کیا جس میں حسب ضرورت تعمیر توسیع و ترمیم ہوتی رہی۔ چنانچہ ۴۰۰ھ میں سلطان عضدالدولہ دیلمی کے وزیر ابومحمد بن سہلان نے پہلی فصیل کو منہدم کرکے اس سے وسیع تر فصیل بنوائی۔

تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۷ ص ۹۴۲ میں ہے کہ

''مَرِضَ اَبُو مُحَمَّدِ بْنِ سَهْلَان فَاشْتَدَّ مَرَضُهُ فَنَذَرَ اِنْ عُوْفِيَ بَنٰى سُوراً عَلٰى مَشْهَدِ اَمِيرِالْمُؤْمِنِينَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَعُوْفِيَ فَاَمَرَ بِبِنَآءِ سُوَرٍ عَلَيْهِ فَبَنٰى فِىْ هٰذِهِ السُّنَّةِ ''ابومحمد بن سہلان بیمار ہوگئے، جب بیماری نے شدت اختیار کی تو انہوں نے منت مانی کہ اگر انہیں شفا ہوئی تو وہ مرقد امیرالمومنین

علیہ السلام کے گرد فصیل تعمیر کریں گے، چنانچہ وہ صحتیاب ہوگئے اور انہوں نے فصیل کی تعمیر کا حکم دیا اور وہ اسی سال (۴۰۰ھ) میں تعمیر کردی گئی۔ آخری فصیل فتح علی شاہ قاچار متوفی ۱۲۵۰ھ کے وزیر نظام الدولہ اصفہانی نے تعمیر کی مگر شہر کے پھیلاؤ کی وجہ سے اس کا بیشتر حصہ منہدم ہو چکا ہے۔

نجف اشرف کی آبادی خالص شیعہ افراد پر مشتمل ہے، جن میں ایک بہت بڑی تعداد ان علوم دینیہ کے طلباء کی ہے جو مختلف ممالک سے سمٹ کر ہر دور میں یہاں مقیم رہتے ہیں اور اس مرکز علم و عرفان اور سرچشمہ فیض سے اپنی تشنگی دور کرتے ہیں، اگرچہ نجف اشرف بہت پہلے سے ایک مادرِ علمی قرار پاچکا تھا، مگر ۴۴۸ھ میں جب شیخ الطائفہ ابوجعفر طوسی رحمۃ اللہ علیہ بغداد کے آئے دن کے جھگڑوں اور شورشوں سے تنگ آکر نجف اشرف چلے آئے تو باقاعدہ''جامعۃ النجف'' کی بنیاد قائم ہوگئی اور یہ باب مدینۃ العلم کی برکات کا کرشمہ ہے کہ نجف اشرف ہمیشہ مرکز علم رہا ہے اور آج بھی عالم اسلام کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز ہے۔

مرقد علوی کی تاریخ و تعمیر

جیسا کہ اس سے پہلے بتایا جاچکا ہے کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کی قبر مبارک کے محل وقوع اور مقام کا علم ائمہ اہل بیتؑ اور مخصوص افراد کے علاوہ کسی کو نہ تھا اور علم ہوتا بھی تو کیونکر؟ جبکہ قبر ایک ویران ٹیلے پر خاک کے اندر پنہاں تھی، نہ نشانِ قبر تھا اور نہ لوحِ مزار۔ اس کا عمومی انکشاف اس وقت ہوا جب ہارون الرشید عباسی ۱۷۰ھ میں برسرِ اقتدار آنے کے بعد کوفہ کے اطراف میں آیا اس کے یہاں آنے کا مقصد سیر و شکار تھا، چنانچہ اس نے چند ہرن دیکھے تو ان کے پیچھے باز اور شکاری کتے چھوڑ دیئے، مگر یہ دیکھ کر حیرت میں کھو گیا کہ جب باز اور شکاری کتے ہرنوں کا پیچھا

کرتے ہیں تو وہ ایک ٹیلے پر چڑھ جاتے ہیں، پھر نہ باز جھپٹتے ہیں اور نہ شکاری کتے آگے بڑھتے ہیں! اس نے کوفے کے ایک شخص کو بلا کر پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ اس نے بتایا کہ ''یہ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کا مدفن ہے'' ہارون نے اسے انعام دے کر رخصت کیا اور کتاب عمدۃ الطالب ص۴۴ میں ہے کہ ہارون نے قبر کی زیارت کرنے کے بعد ''اِنَّ هَارُوْنَ اَمَرَ فَبَنٰى عَلَيْهِ قُبَّةً وَاَخَذَ النَّاسُ فِىْ زِيَارَتِهِ وَالدَّفْنِ لِمَوتَاهُمْ حَوْلَه'' حکم دیا کہ یہاں روضہ تعمیر کیا جائے، چنانچہ ایک قبہ تعمیر کیا گیا اور لوگ اس کی زیارت کے لیے آنے اور اس کے گردوپیش اپنے مرنے والوں کو دفن کرنے لگے۔

اس وقت یہ عمارت ایک سرخ گنبد کی صورت میں تھی، جس کے چاروں طرف چار دروازے تھے اور قبر کی دیواریں سفید اینٹوں سے اٹھائی گئی تھیں۔

محمد بن زید حسنی والیٔ طبرستان نے معتضد باللہ عباسی کے دور میں قبہ چار دیواری اور قلعہ نما روضہ تعمیر کیا، جس میں ستر طاق تھے، معتضد باللہ کا دورِ حکومت ۲۷۹ھ سے ۲۸۹ھ تک ہے۔

جب ۲۶۷ھ میں عضد الدولہ دیلمی ابن رکن الدولہ برسرِ اقتدار آیا تو اس نے زر کثیر صرف کر کے روضہ کی پرشکوہ عمارت بنوائی دیوار پر ساج کی لکڑی کے تختے جڑے اور سفید رنگ کا گنبد تعمیر کیا، حسین بن حجاج بغدادی متوفی ۳۹۱ھ نے اپنے مدحیہ قصیدہ میں کہا ہے:

يَا صَاحِبَ الْقُبَّةِ الْبَيْضَآءِ عَلَى النَّجَفِ
مَنْ زَارَ قَبْرَكَ وَاسْتَشْفٰى لَدَيْكَ شَفٰى

اے سرزمین نجف میں سفید گنبد کے مکین! جو شخص آپ کی قبر کی زیارت کرے اور شفا چاہے وہ شفایاب ہوگا۔

اس تعمیر کے موقع پر عضد الدولہ نے وصیت کی تھی کہ اسے نجف اشرف میں حضرت کے جوار میں دفن کیا جائے، چنانچہ ابن خلکان نے وفیات الاعیان جلد۱ ص۴۱۸ میں تحریر کیا ہے:

''بَنٰى عَلَيْهِ الْمَشْهَد الَّذِىْ هُنَاكَ وَ غَرَمَ عَلَيْهِ شَيْئًا كَثِيْرًا اَوْصٰى بِدَفْنِهِ فِيْهِ'' عضد الدولہ نے صرف کثیر سے وہاں زیارت گاہ تعمیر کی اور وصیت کی کہ اسے بھی وہیں پر دفن کیا جائے۔

چنانچہ جب اس نے ۸ شوال ۳۷۲ھ میں انتقال کیا تو اسے روضہ اطہر کی غربی جانب دفن کیا گیا، ۷۵۵ھ میں آتشزدگی کا حادثہ رونما ہوا اور عمارت کا بیشتر حصہ منہدم ہوگیا، مگر 760ھ میں اسے پھر سے تعمیر کر دیا گیا۔

914ھ میں شاہ اسماعیل صفوی متوفی ۹۳۰ھ نے فولادی ضریح بنوائی اور حرم میں قندیلیں آویزاں کیں، ۱۰۳۲ھ میں شاہ عباس کبیر متوفی ۱۰۳۸ھ نے روضہ اقدس کی تعمیر کی اور صحن کو وسعت دی، ۱۰۴۷ھ میں شاہ صفی صفوی متوفی ۱۰۵۰ھ نے روضہ کی تعمیر کی اور اس کی تکمیل اس کے بیٹے شاہ عباس ثانی متوفی ۱۰۷۷ھ نے کی۔

۱۱۵۴ھ یا ۱۱۵۶ھ میں نادر شاہ افشار نے فتح ہند کے بعد کاشی کی اینٹوں سے روضہ کی مرمت کی اور گنبد اور میناروں پر سونا چڑھایا۔

۱۲۰۷ھ میں آغا محمد خان قاچار نے ۱۲۳۲ھ میں فتح علی قاچار نے ۱۲۸۸ھ میں ناصر الدین شاہ قاچار نے روضہ کی تعمیر و تزئین میں حصہ لیا۔

غرض ہر دور میں خصوصاً سلاطین دیالمہ، جلائریہ، ایلخانیہ، حمدانیہ، صفویہ اور قاچاریہ کے عہد میں روضہ انور کی تعمیر و تزئین میں اضافہ ہوتا رہا اور چودھویں صدی کے نصف آخر میں ایک ایرانی تاجر نے خالص سونے کے دروازے لگوائے اور اس پر

آئینہ کاری کی گئی۔

روضہ انور کے گرد تقریباً مربع شکل میں ایک فصیل موجود ہے جس کے شرقی سے غربی کونے تک ہر ایک کا طول باہر سے 84 میٹر اور اندر سے 77 میٹر، شمالی کونے کا طول باہر سے 74 میٹر اور اندر سے 72 میٹر، جنوبی کونے کا طول باہر سے 75 میٹر اور اندر سے 72 میٹر ہے، خود فصیل کی بلندی 17 میٹر ہے۔ اس کی دو منزلیں ہیں، پہلی منزل میں 54 کمرے ہیں جن پر گنبد بنے ہوئے ہیں، سابق میں طلاب علوم دینیہ سکونت رکھتے تھے، اب قاری حضرات کے لیے انہیں مخصوص کر دیا گیا ہے۔

دوسری منزل میں 78 کمرے ہیں، فصیل کی ساری دیوار خوبصورت، منقش کاشی کی اینٹوں سے مرصع ہے، دیوار کے اوپر کے حصے میں قرآن مجید کی بعض سورتیں جلی عربی خط میں تحریر کی گئی ہیں، فصیل کا کل رقبہ آٹھ ہزار مربع میٹر ہے، جو تمام صحن مقدس کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے، صحن مقدس کو سنگ مرمر سے فرش کیا گیا تھا، تازہ ترین صورت یہ ہے کہ سال 2009 میں پورے صحن میں سفید پتھر کا فرش لگایا گیا ہے جو دھوپ کی گرمی کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔

اس فصیل میں پانچ دروازے ہیں۔

پہلا دروازہ: باب الکبیر کے نام سے معروف ہے، جو فصیل کی مشرقی طرف ''سوق الکبیر'' یا بڑے بازار کی طرف کھلتا ہے، اس دروزے کے اوپر گھڑی بھی لگی ہوئی ہے جسے 1305ھ میں ایران کے وزیر ''امین السلطنۃ'' نے ہدیہ کیا تھا، گھڑی کو چاروں سمتوں سے خوبصورت انداز میں مزین کیا گیا ہے اور اس پر ایک چھوٹا سا گنبد بنایا گیا ہے جسے 1323 میں خالص سونے کی اینٹوں سے سجایا گیا ہے۔

دوسرا دروازہ: اس باب الکبیر کے پہلو میں ہے جو اس سے نسبتاً چھوٹا ہے اور اسے ''باب مسلم بن عقیل'' کہتے ہیں۔

تیسرا دروازہ: ''باب طوسی'' کے نام سے معروف ہے جو شیخ الطائفہ شیخ ابو جعفر محمد طوسی متوفی 460 کے مزار مبارک کی طرف کھلتا ہے۔

چوتھا دروازہ: ''باب القبلۃ'' کہلاتا ہے، اس کو کئی مرتبہ بنایا گیا ہے۔

پانچواں دروازہ: ''باب السلطانی'' ہے جو روضہ اطہر کے غربی جانب میں ہے، چونکہ اسے 1279ھ میں عثمانی بادشاہ سلطان عبدالعزیز کے دور میں کھولا گیا تھا اسی لیے اسے ''باب السلطانی'' کہتے ہیں، البتہ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اس کو ''باب الفرج'' بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ ''مقام امام زمان حضرت حجۃ بن الحسن عجل اللہ فرجہ'' کی طرف کھلتا ہے۔

تمام دروازوں پر خوبصورت انداز میں ان کی تاریخ بنا، تاریخ تجدید بنا اور مدح سید الاوصیاء حیدر کرار علیہ السلام تحریر کی گئی ہے اور ساتھ ہی نہایت دیدہ زیب صورت میں کاشی کاری بھی کی گئی ہے۔

انجینئرنگ کا کارنامہ:

یہاں پر جس اہم بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ روضہ حیدریہ کی انجینئرنگ کے دو محیرالعقول کارنامے قابل ذکر ہیں۔

پہلا: یہ کہ روضہ اطہر کی ساخت کچھ اس طرح سے کی گئی ہے کہ سورج کا سایہ جب ایک خاص مقررہ نقطے پر پہنچتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب زوال آفتاب ہو گیا ہے اور اسی لیے نماز ظہر کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور یہ موسم سرما اور گرما دونوں میں یکساں کیفیت کا حامل ہے۔

دوسرا: یہ کہ موسم سرما ہو یا گرما جب بھی سورج طلوع کرتا ہے تو اس کی سب سے پہلی کرن حضرت امیر علیہ السلام کی ضریح اقدس پر پڑتی ہے اور یہ دونوں

چیزیں کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہیں جو نہایت ہی مشکل اور بڑی کاوش اور غیر معمولی شناخت کے بغیر عمل میں نہیں آتا۔

روضہ مطہر کے دروازے:

ابھی ہم نے صحن مطہر کی فصیل اور اس میں موجود دروازوں کا ذکر کیا ہے، اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خود روضہ اطہر کے کتنے دروازے ہیں اور کون کون سے؟

چنانچہ روضہ حیدریہ کے چھ دروازے ہیں جو مسقّف رواق کی طرف کھلتے ہیں اور رواق نے روضے کا احاطہ کیا ہوا ہے، دو دروازے مغرب کی طرف ہیں البتہ یہ رواق کی طرف نہیں کھلتے، کیونکہ انہیں چاندی کی جالیوں سے بند کر دیا گیا ہے، دو دروازے مشرق کی طرف سے ہیں جو رواق کی طرف کھلتے ہیں اور ایوان طلائی کے مقابل میں ہیں اور دو دروازے شمالی طرف سے ہیں اور یہ بھی رواق کی طرف کھلتے ہیں اور جو دروازے ایوان طلائی کے سامنے ہیں ان میں سے جو دائیں طرف ہے اسے 1283ھ میں نصب کیا گیا ہے اور بائیں طرف والے دروازے کو 1287ھ میں نصب کیا گیا، پہلا دروازہ لطف علی خان ایروانی نے اور دوسرا ناصر الدین شاہ قاچار نے ہدیہ کئے تھے، البتہ یہ دونوں چاندی سے مرصع تھے جبکہ انہیں 1376ھ میں سونے سے مرصع کر کے دوبارہ لگایا گیا جس کے تمام تر اخراجات الحاج محمد تقی اتفاق تہرانی نے ادا کئے۔

شمال کی طرف نصب دونوں دروازے جو رواق کی طرف کھلتے ہیں خالص چاندی کے بنے ہوئے ہیں، در اصل یہ ایک دروازے کی صورت میں تھے لیکن 1366ھ میں اس ایک دروازے کو نکال کر اس کی جگہ دو دروازے بنائے گئے اور فقط ان چار دروازوں سے ہی آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہے۔

رواق مطہر:

رواق، عمارت کے اس حصے کو کہتے ہیں جس نے گنبد (روضہ) کی فضا کو چاروں طرف سے اپنے احاطہ میں لیا ہوا ہوتا ہے، اس رواق کا فرش قالینوں سے مزین ہے، اس کی کئی دیواریں ایسی بھی ہیں جو گنبد کی دیوار سے متصل ہیں، اس کی چھت پر خوبصورت رنگین آئینہ کاری کی گئی ہے اور شیشے کے ٹکڑوں کو خاص ہندسی طرز پر کاٹ کر لگایا گیا ہے۔

اس کی زمین اور دیواروں کے نچلے حصے کو سبز سنگِ مرمر سے مزین کیا گیا ہے۔ اس کی دیواروں کی بلندی گنبد اور فصیل کی بلندی کے برابر ہے۔ اس کا شرقاً غرباً رقبہ 30 میٹر اور شمالاً جنوباً 31 میٹر ہے۔

اس کے دو متوازی دروازے ہیں، ان میں سے ایک شمال کی طرف اس صحن کی طرف کھلتا ہے جو ”صحن باب طوسی“ کے نام سے معروف ہے جبکہ دوسرا جنوب کی طرف باب القبلہ کے مقابل ہے۔ اس میں قیمتی چاندی استعمال کی گئی ہے اور سونے کی ملمع کاری کی گئی ہے اسے 1341ھ میں نصب کیا گیا، جس کے سارے اخراجات الحاج عبد الودود زعیم آل فتلہ کی والدہ نے ادا کئے ہیں اور اسے باب المراد کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

تیسرا دروازہ: جو ایوان طلائی میں ہے اور اس سے رواق میں داخل ہوتے ہیں نہایت ہی قیمتی اور محکم دروازوں میں سے ہے، اسے 1373ھ میں نصب کیا گیا، یہ نہایت ہی گراں قیمت پتھروں سے مرصع کیا گیا ہے۔

اس پر مینا کاری نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں، یہ ایک فنی لوح بھی ہے جس پر آیاتِ قرآنی اور لطیف اشعار تحریر کئے گئے ہیں۔

اسی سال 1373ھ میں اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا اور دروازہ رواق کی

طرف بھی کھولا گیا ہے، جو علامہ حلی علیہ الرحمہ کی مزار سے ہو کر گزرتا ہے۔

ایوانِ طلائی ____ اور مینار:

روضہ اطہر کی شرقی جانب سب سے بڑا ایوان ہے جسے ''ایوان طلائی'' کہتے ہیں، جس کی چھت اور دیواریں خالص سونے سے مزین ہیں، اس کے دونوں کناروں پر دو گولڈن (طلائی) مینار ہیں، ایوان طلائی کے وسط میں دروازے کے دونوں اطراف میں ابھرے ہوئے سنہرے حروف میں فارسی زبان میں قصیدہ لکھا ہوا ہے، اس کے اوپر عربی زبان میں ابھرے ہوئے سنہری حروف میں نادر شاہ افشار کے حکم سے گنبد، دونوں میناروں اور ایوان کے سونے سے مزین کرنے کی تاریخ درج ہے، اس ایوان میں بہت سے علماء اور دیگر شخصیات مدفون ہیں، ایوان میں سے رواق میں داخل ہونے والے راستے میں دائیں طرف علامہ حلی کا مقبرہ ہے اور بائیں جانب مقدس اردبیلیؒ کی قبر ہے اور اسی حجرے میں امیر المومنین علیہ السلام کی بارگاہ میں ہدیہ کی جانے والی نہایت ہی قیمتی اشیاء رکھی ہوئی ہیں۔

اسی ایوان کے آگے ایک کھلا چبوترہ ہے۔ صحن کی زمین سے جس کی بلندی ایک میٹر اور لمبائی 33 میٹر اور چوڑائی 20 میٹر ہے، اس کے دونوں میناروں کا محیط 8 میٹر، اونچائی 35 میٹر اور قطر 1.5 میٹر ہے اور ان میں سے ہر ایک مینار پر خالص سونے کی چار ہزار پتریاں لگی ہوئی ہیں۔

حقیر کو کئی مرتبہ اس مقدس مقام کی زیارت کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ دعا دل سے نکل رہی ہے کہ:

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا زِیَارَۃَ قَبْرِ اَمِیْرِالْمُؤْمِنِیْنَ عَلَیْہِ السَّلَام

فِیْ عَامِیْ ھٰذَا وَ فِیْ کُلِّ عَامٍ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّ آلِہِ الْکِرَام

كلية الواعظين جامعة الكوثر اسلام آباد کے افتتاح کی خوشی میں

واعظین، مقررین اور مبلغین کے لیے انمول تحفہ
عالمِ عرب کی شہرہ آفاق تفسیر

تَفۡسِیۡرُ الۡمُعِیۡن

للواعظين والمتعظين

حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ محمد علی فاضل مد ظلہ العالی

کے قلم سے ترجمہ ہو کر بہت جلد منظرِ عام پر آ رہی ہے
کتاب محدود تعداد میں شائع ہو رہی ہے۔
اپنے آرڈر سے ابھی مطلع کریں

ناشر:

مکتبۃ الہادی

جامعۃ الکوثر۔ اسلام آباد

حوزہ علمیہ جامعہ امام جعفر صادق علیہ السلام

تعارف:

جنوبی پنجاب کے ضلع راجن پور جیسے ہر لحاظ سے پسماندہ ترین علاقے میں ملتِ تشیع کے لیے عظیم دینی درسگاہ جامعہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا قیام نعمتِ عظمیٰ ہے۔ پاکستان کی مشہور و معروف علمی شخصیت سرکار علامہ محمد علی فاضل مدظلہ العالی نے 1987ء میں اس ادارے کی تاسیس فرمائی۔ ابتدائی طور پر کرایہ کے مکان سے تدریسی خدمات کا آغاز فرمایا۔ شب و روز کی انتہائی محنت سے جامعہ کی زمین خرید فرما کر عمارت کی تعمیر جیسی کٹھن ذمہ داری کو سرانجام دیا اور آج عالیشان مدرسہ، دومنزلہ مسجد و امام بارگاہ اسی انتھک محنت کا نتیجہ ہیں۔

قلمی خدمات:

ادارہ ہذا اور اس کے بانی و سرپرست کی طرف سے تصنیف، ترجمہ و تالیف شدہ کئی دینی کتب مقبول عام ہو چکی ہیں اور تمام مکاتب فکر کے نزدیک شہرت خاصہ رکھتی ہیں۔ نیز ملکی اور بین الاقوامی جرائد میں ادارہ ہذا کے سرپرست، پرنسپل، مدرسین اور فارغ التحصیل علماء کرام کے مضامین وقتاً فوقتاً چھپتے رہتے ہیں۔

علمی و تدریسی خدمات:

جامعہ امام جعفر صادقؑ کا شمار ملک کے بڑے مدارس میں ہوتا ہے اور یہاں سے فارغ التحصیل علماء کراچی سے آزاد کشمیر تک ملک کے چاروں صوبوں سندھ، خیبر پختونخواہ، پنجاب اور بلوچستان میں دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور دینی اداروں میں بطور مدیر، مدرس، خطیب اور مبلغ خدمات میں مصروف عمل ہیں۔

حوزہ علمیہ زینبیہؑ:

ساتھ ہی دختران ملت جعفریہ کے دینی شعور کو بیدار کرنے کے لیے حوزہ علمیہ زینبیہؑ کا قیام بھی نعمت عظمیٰ سے کم نہیں ہے اور الحمدللہ اس ادارہ نے مختصر ترین عرصہ میں وسائل کے نہ ہونے کے باوجود بہت سی خواتین کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر کے ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

جامعہ کو کسی شخصیت کی سرپرستی حاصل ہے نہ اس کے نام کوئی رقبہ اراضی وقف ہے،
صرف مخلص مومنین کے تعاون سے خیر کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

آپ سے تعاون کی اپیل کی جاتی ہے۔

برائے رابطہ: جامعہ امام جعفر صادقؑ راجن پور پنجاب پاکستان۔
فون: +92331-9727212
+92344-9137545

بسم الله الرحمن الرحیم

کتاب ہذا کی طباعت اور اشاعت کے سلسلہ میں ہمارے ساتھ ان احباب نے تعاون فرمایا ہے۔

۱۔ جناب نیاز علی ملک صاحب

۲۔ جناب سید باقر کاظمی صاحب

۳۔ جناب شیخ اختر علی صاحب

۴۔ جناب ڈاکٹر آصف علی صاحب

دعا ہے خداوند عالم ان کا تعاون قبول فرمائے اور ان کے مرحومین کو جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ ایک مرتبہ سورہ فاتحہ اور تین مرتبہ سورہ توحید پڑھ کر ان کے مرحومین کو ایصال فرمائیں۔

خصوصاً مرحوم خوشی محمد، مرحوم خان محمد

مرحومہ ست بھرائی اور مرحومہ غلام فاطمہ

شکریہ

ادارہ